تمدن

ماشرتی تمدنی ادبی [illegible] تاریخی اور علمی مضامین کا

ایڈیٹر ایم اے [illegible] دہلوی خلف اکبر جناب قابل

محمد سرفراز حسین صاحب [illegible] سیاح جاپان و انگلستان

[illegible]

شعلہ

وہ جو کوہ طور پر بھڑکا تھا۔ وہ جو فاران کی چوٹیوں پر جلوہ گر ہوا تھا۔ اب کاغذی لباس پہن کر ایک رسالہ کی شکل میں نمودار ہے۔ ادبی روح پھونکے گا۔ اخلاقی وعظ سنائیگا۔ نورانی شعلوں کی تابش سے نفسانی ظلمتوں کو نیست و نابود بنا دے گا۔ وہ سینے جو آتشِ محبت سے سوختہ نہیں وہ قلوب جو سوز دروں سے خالی ہیں اس طرف متوجہ ہوں عشقِ الٰہی کی لپٹیں گداز طبیعتوں سے لپٹنا چاہتی ہیں شاہدِ حسن بے نقاب ہو کر مشتاق آنکھوں کو فرحت پہنچانے کے لیے حاضر ہے۔ پس شعلہ کی خریداری کے لیے جو ہر مہینہ آپ کی دلبستگی کا بہترین مجموعہ ہے۔ درخواستیں روانہ کیجیے لکھائی چھپائی بہت عمدہ۔ قیمت سالانہ درجۂ عام دو روپیہ آٹھ آنے (عمہ/) مع محصول نمونہ چار آنے کے ٹکٹ آنے پر بھیجا جاتا ہے۔

المشتہر

منصرم رسالہ دفتر شعلہ محلہ چوڑیگران۔ دہلی

بڑھاپے کی شادی

جس کسی نے کہا ہے اچھا کہا ہے "پیرے کہ دم زعشق زند بس غنیمت است" مگر ہمارے ہاں اُردو میں تو "بُوڑھے مُنہ مہاسے" تحقیر کے ساتھ بولا جاتا ہے تاہم یہ واقعہ ہے کہ بڑھاپے کی شادیوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ ہم نے غیر ممالک کی تقلید میں عشق اور شادی کو مترادف قرار دیا ہے۔ یہ بالکل صحیح نہ ہو مگر اکثر سُنا گیا ہے کہ "بڑے میاں" کو اپنی نو حاصل کردہ بیوی سے بہت محبت ہوتی ہے خصوصاً جب کہ آخر الذکر کا سن اپنے مقدس شوہر سے بیس پچیس برس کم ہو اور یہ بات تو بالکل نظر انداز کر دینی چاہیے کہ بیوی کو بھی محبت ہوتی ہے یا نہیں۔ کچھ اور لکھنے سے پہلے ہم ایک اوسط درجہ کے ضعیف شوہر کا حلیہ۔ مزاج برتاؤ۔ وغیرہ وغیرہ بتانا چاہتے ہیں۔ بیوی کے متعلق زیادہ ہندی کی چندی نکالنے سے ہم نے ارادتاً پرہیز کیا ہے مگر ناظرین خود بہت کچھ اندازہ کرلیں گے۔

ضعیف شوہر

(۱) ریش مقدس زیر بار خضاب رہتی ہے۔ الماری میں نوایجاد شیشیاں دو ایک پُرانے نسخوں کے خضاب موجود رہتے ہیں۔ خضاب لگانے کا ہر قسم کا سامان بھی رہتا ہے۔ بیچاری بیوی کو اس ساری دوکان سے کوئی خاص دلچسپی نہیں پیدا ہوتی حالانکہ وہ کوشش کرتی ہے کہ ہو جائے۔

ہفتہ یا پندرھواڑے میں ایک دن گھر میں خاص سانگ ہوتا ہے۔ یعنے جس دن "بڑے میاں" خضاب لگاتے ہیں۔ صاحب خضاب کی سج دھج اور لاؤ پلیٹ کسی پینچ کی زینت کے لیے تصویر لینے کے قابل ہوتی ہے۔ یہ تماشا ہیں

ختم نہیں ہوتا بلکہ دہن مبارک ڈھاٹے کی بندش سے تکلم میں آہستگی اور نادر آہنگی اختیار کرتا ہے۔ یہ سب بیچاری بیوی برداشت کرتی ہے اور سب سے بڑا ظلم یہ سہتی ہے کہ ہنسی کو ضبط کرتی ہے۔ ابھی تک اسکی عمر ایسی عجیب اور بے جوڑ باتوں پر ہنسنے کی باقی ہے! مگر شوہر کا بڑھاپا اسے نیست و نابود کرنے کے لیے کمربستہ ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کیا جائے کہ ایسے خاوند سے ایسی بیوی کو محبت ہونی ممکن ہے تو سوال یہ ہے کہ خضاب کے دن اُسے اُن کی کیا ادا بھائے۔ حُقّہ کی مُہنال خضاب بستہ لبوں میں خوبصورت معلوم ہو؟ اے بدنصیب عورت تو روا اپنی قسمت کو پتھر سے پھوڑ۔ ٹھہر جا ابھی تو چند گھنٹہ بعد خضاب کی تکمیل اور بالوں کے بالکل سیاہ ہو جانے کی داد تجھے دینی پڑے گی۔ اگر داد نہ دی تو "بڑے میاں" کی بہت دلشکنی ہوگی اور وہ سمجھ لینگے کہ بیوی کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک محبت کا معیار اوّلین اُنکی مقدس ڈاڑھی ہی ہے!)

(۲) ایک نہ ایک چھوٹا موٹا مرض دامنگیر رہتا ہے۔ (دور نہ جائیے۔ صرف اسیقدر تصور کیجیے کہ ایک شب کو آدھی رات کے بعد ایک پنشن آلود پچپن سالہ کریہہ آواز برابر کے پلنگ سے ایک مطیع شباب اور متوالی نیندیں سوتی ہوئی بیوی کے کان میں پہنچتی ہے۔ اور وہ آواز یہ ہے "بیگم۔ میری ڈاڑھ میں درد ہو رہا ہے!" جن مقدس ہاتھوں نے اس دلکش آواز کے ساتھ اس سوتی ہوئی جوانی کو جھنجوڑا ہے اُسکی رگوں میں کچھ برف کا اثر ہے اور سونے والی کو گرمی محسوس نہیں ہوتی۔

بہرحال کئی آوازوں اور کئی جھنجوڑوں (کئی دفعہ جھنجوڑنے کے بدلے یہ لفظ تصنیف کیا گیا ہے۔ معاف فرمائیے) کے بعد وہ بیچاری آنکھیں ملتی ہوئی انگڑائیاں لیتی ہوئی اُٹھی۔ ہائے یہ دونوں ادائیں بہت کچھ مستحق قدر اور

مستحق استقبال خاص تھیں مگر شوہر کو اُنکے دیکھنے کی نہ اہلیت نہ فرصت۔ انھوں نے فرمایا بھی تو یہ فرمایا "ہیں۔ اُٹھتی نہیں"

(۳) ایک آدھ عادت نہایت دلچسپ پڑی ہوی ہوتی ہے (مثلاً ہمارے معزز "بڑے میاں" ہیں سوتے ہیں چوکیداروں کو مات کرنے والے خرّاٹے لینے۔ اور جاگتے ہیں اکثر ٹھوڑی کے نیچے کھُجاتے رہنے کے علاوہ۔ قبض کی وجہ سے یہ عادت پڑگئی ہے کہ بیچارے صبح کو پاخانہ جانے سے پہلے کوئی دس منٹ تک اُکڑوں بیٹھ کر حقہ پیتے ہیں۔ اگر بیوی کو ہینڈ کیمرا رکھنے اور اُسکے استعمال کرنے کی اجازت ہوتی تو مع خضاب کی تصویروں کے "بڑے میاں" کا ایک باتصویر ایڈیشن شائع ہو سکتا۔ "بڑے میاں" کا دل ضرور چاہتا ہو گا کہ میری یہ ادا بھی بیوی کو پسند آئے اور اُسکی محبت میں اضافہ ہو مگر ع

این خیال است و محال است و جنوں۔

(۴) دل مردہ ہونے کے بعد متانت کا زور ہو جاتا ہے نشست برخاست بات چیت اور میل جول میں جوانی کی سادی اور دلکش لچک کے بدلے سختی اور لوہاپن آجاتا ہے جو ریاضی یا سائنس کے طالبعلم کو تو غالباً فائدہ پہنچا سکے مگر جو ایک پُر از شباب بیوی کے دل کو گرویدہ کرنے میں کماحقہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

(۵) کفایت کا خیال بڑھ جاتا ہے۔ (فی نفسہ یہ کوئی بُرا خیال نہیں ہے) مگر بڑھاپے میں جو کفایت سوجھتی ہے وہ زیادہ تر جوانی کی فضول خرچیوں کی ندامت اور نقصانات کی وجہ سے سوجھتی ہے۔ اگر یہ صاحب تنہا ہوتے یا کسی بڑھیا کا ساتھ ہوتا تو یہ کفایت شعاری کچھ بُری نہ معلوم ہوتی۔ مگر اسکا مقابلہ کیا جاتا ہے جوان بیوی کی (بزعم خود) فضول خرچیوں سے اور یہ

بات بالکل نظرانداز کردیجاتی ہے کہ ہم بھی نوجوانی میں زیادہ اُٹھاتے تھے۔ یہ نہیں ہے کہ "بڑے میاں" کو بڑے خرچ اب بھی نہ سوجھتے ہوں۔ مگر اب اُنکے اخراجات کا رخ بدلگیا ہے ملاحظہ فرمائیے کہ کئی دن سے مستری کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اور پکّا مزار اونہوں نے اور قبر کے ا۔دگرد تھوڑی بہت پھول پھلواری لگانے کے تخمینے اور نقشے تیار ہورہے ہیں۔ بیوی کا دل ضرور چاہتا ہوگا کہ یہ روپیہ میرے کسی زیور میں خرچ ہوتا۔ مگر اُسکو یاد رکھنا چاہیے کہ اُسکی شادی ایک ضعیف العمر شخص سے کیا ہوی ہے کہ ملک الموت سے رشتۂ قریبہ قائم ہوگیا ہے اور قبرستان بھی سسرال ہی کے ایک حصّے کا نام ہے۔

(۶) اور لیجیے وصیت نامہ لکھا جارہا ہے۔ اسقدر حرمین شریفین بھیجا جائیگا فلاں مکان یا دوکان کے کرایہ میں سے جاڑے میں محلہ کی مسجد میں لیندھن بھروا جائیگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ وصیت نامہ بہت اچھی چیز ہے۔ مگر دن رات یہ باتیں ایک جوان بیوی کے سامنے ہوتی ہیں اور وہ خاموشی اور صبر کے ساتھ سنتی ہے۔ اُسکے حصّے میں کسیقدر رکم آتا ہے جسکی وجہ غالبًا یہ ہے کہ "بڑے میاں" کے دل کی تہ میں یہ بات چھُپی ہوی ہے کہ میرے بعد اسکے میکے والے ضرور اسکی شادی کرادیں گے۔

(۷) اب بیوی کے لیے ایک آخری مرحلہ رہگیا ہے اور وہ مرحلہ وہ ہے جس کی بسم اللہ "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن" سے ہوتی ہے۔ اب یہ رنگین کپڑوں کے بدلے رنڈسالہ پہنے گی اور چوڑی مہندی مسی سرمہ سب کو سلام کرے گی۔ کیونکہ اُس کی شادی ایک بڈھے سے ہوی تھی۔

افسوس۔ صد افسوس۔

"نسائی"

حُسن

دُنیا کے وسیع گلشن میں یوں تو ہزاروں رنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں مگر حُسن مثل ایک ایسے گلاب کے پھول کے ہے جسکی خوشبو سے تمام گلشن مہک رہا ہے اسکے رنگ میں کچھ ایسی دلآویزی ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہوں پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے اسکی خداداد کشش سر جھکا کر چلنے والوں کے دلوں میں بھی ایسی چٹکی لے لیتی ہے کہ وہ بھی نگاہ اُٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اگر وہ اپنی پوری قوت سے کام لیتے ہیں تب آنکھ کے کسی گوشہ میں نگاہیں خود اسکی طرف لپک جاتی ہیں اور اس سے ہم آغوشی کا لطف حاصل کیے بغیر قرار نہیں لیتیں۔

اسکی پنکھڑیاں بہت ہی نرم و نازک اور لطافت میں اپنا جواب نہیں رکھتیں اسکے دیکھنے سے کبھی سیری ممکن نہیں اسکی بہار میں ایسی دلفریب ادائیں مضمر ہیں جن کے اثر سے انسان کا دل بے قابو اور دماغ متحیر ہو جاتا ہے۔ اسکی نزاکت اور نرمی ہر سنگ دل کو موم بنا دیتی ہے۔ زاہد صد سالہ کے تجربے خاک میں ملا دیتی ہے۔ دم گلگشت جب نگاہ اُٹھتی ہے تو اسی کی طرف جب آنکھ پھرتی ہے تو اسی کی جانب۔ حسن ایک ایسا پوڈر ہے جسمیں ہزاروں عیب پوشیدہ رہتے ہیں کوئی کیسا ہی تیرہ باطن ہو لیکن اسکی سفید نقاب آنکھوں پر پردے ڈال دیتی ہے۔ حُسن ایسا نفیس لباس ہے جسکی زیبائش نگاہوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔

حُسن میں یہ بھی ایک [illegible] اثر کہنا چاہیے کہ اسکے اظہار کے الفاظ بھی نقش سے دور اور لطافت سے بھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً انگلش میں (بیوٹی) جو حُسن کے مترادف ہے کتنا خوبصورت [illegible] ہے اگر اسکے اقسام پر نظر کیجائے تو بہت ہوں لیکن ان سب

اقسام میں سے دو صورتیں ضرور قابل نوٹ ہیں جنمیں سے ایک کو حُسن ظاہری اور دوسرے کو حُسن باطنی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور ان دونوں قسموں کا وجود ہر ایسی خوبصورت شے میں ضرور پایا جائے گا جسکو دیکھکر ہم خوبصورت یا حسین کہہ سکتے ہیں۔

پہلے تو بحالت مجموعی تمام دنیا کی خوبصورتی[1] لیجیے کہ اسمیں زیادہ تر حصے بہت حسین اور مینو سواد واقع ہوئے ہیں اسلیے ہم اسکو بھی حسین ہی کہیں گے گو صرف ایک غم کے اعتبار سے تو یہ نہایت کریہ منظر کہی جا سکتی ہے مگر پھر بھی اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اسمیں حسن باطنی نہیں ہے لیکن حُسن ظاہر سے شاید کسی کو بھی اختلاف نہو۔ کیونکہ خود حُسن بھی اس دنیا کے اچھے اشیاء میں سے ایک شے ہے۔ جسکے وجود کا اظہار مختلف شکلوں طرح طرح کی صورتوں سے ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اسمیں کوئی شک نہیں کہ جس چیز میں اسکا کم و بیش حصہ شامل نہیں ہوتا وہ دنیا کے خاص اسٹیج پر کوئی اچھا پارٹ حاصل نہیں کر سکتی۔ اور جس چیز میں اسکا زیادہ حصہ شامل ہوتا ہے وہ مقبول عام اور ہر دلعزیز ہی ہو کر رہتی ہے۔ (دنیا) ظرفیت کے اعتبار سے بھی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ زمین گو بظاہر کوئی بہت خوبصورت نہیں مگر اپنے فوائد اور زرخیزی کے اعتبار سے بہت حسین کہے جانے کی مستحق ہے آسمان اتنی بزرگی رکھنے پر بھی تمام دنیا کے پورے سطح پر کتنا فریب اور پیمائش نظر سے کسقدر ٹھیک دکھائی دیتا ہے۔ اسکے ماورا۔ چاند۔ سورج۔ ستارے کہکشاں برق و سحاب اور الوان مختلفہ کے اعتبار سے تو حُسن کا ایک بڑا موقع کہا جا سکتا ہے دنیا کے بحری حصے کے حُسن تمام بَرّی حصوں کی خوبصورتیوں سے بالکل ایک جداگانہ انداز رکھتے ہیں۔

بحری حصوں کے حُسن کی دلفریبیاں اور اسکے تمام تر انداز واقعی بَرّی حصوں کے

[1] خوبصورتی سے میری مراد حُسن اور حُسن سے مراد خوبصورتی ہوگی۔

حُسن سے بالکل ہی علیحدہ اور متغائر صورتیں رکھتے ہیں۔

گویا یہاں بھی حسن کی دو علیحدہ شکلیں پیدا ہوتی ہیں جنمیں سے ایک بحری حصص کے لیے خاص ہے اور دوسرے بڑی حصّوں کے واسطے۔ جب ہمارا بندرگاہوں یا جزیروں میں گزر ہوتا ہے تو سمندر کے کنارے اور دریاؤں کے دھارے ہمکو اپنے حُسن سے ایسا محو کرلیتے ہیں۔ کہ ہم خشکی کے حصّوں کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ اور جب پُربہار میدانوں اور دلفریب صحراؤں کے سبزہ زاروں میں ہمارا گذر ہوتا ہے تو ہمکو بحری حصوں کا خیال باقی نہیں رہتا۔

خشکی کے حصے میں جو اقلیمیں واقع ہیں ان میں سے ہر اقلیم کا ایک انداز جداگانہ ہے ہر ہر اقلیم کی خوبصورتی علیحدہ ہر حصّے کا حُسن ایک خاص ادا رکھتا ہے۔ اب ہم کو یہ دکھانا رہا کہ اقلیموں کی خوبصورتی کیا ہے۔ ہر اقلیم کے واسطے شہروں کی وسعت سرحدوں کا ٹھیک موقع پر واقع ہونا ہر سرحد پر مضبوط قلعوں مستحکم فصیلوں کا پایا جانا حدود اربعہ پر رسدوں اور چنگیوں کا انتظام راستوں کا خطروں اور رہزنوں سے پاک ہونا اسکا حُسن خاص ہے۔

منزلوں اور بندرگاہوں کا پاک وصاف اور ان میں ہر شئے کا مہیا ہونا پانی اور غلّے وغیرہ کا اہتمام اسٹیشنوں اور کارواں سراؤں کی سجاوٹ حسب محل و موقع کارگزاروں کا متدین اور خلیق ہونا۔ زمین کا زرخیز اور رعایا کا مطیع و فرمانبردار ہونا باعث امن و آسایش ہوتا ہے اور بڑے بڑے شہروں میں درحقیقت ان ہی باتوں سے خوبصورتی پیدا ہوتی ہے اسکے علاوہ سڑکوں کا مضبوط وصاف بازاروں کا وسیع و آراستہ ہونا نفیس اور راحت رساں سواریوں کا ہروقت موجود رہنا انکا حُسن ہے۔ عمارت کا بلند اور اسٹیشنوں اور بندرگاہوں کا بڑا ہونا شہروں کی باعث کا سبب ہوتا ہے۔ بڑے بڑے ملکوں وسیع شہروں میں بحالت مجموعی ان ہی چیزوں سے

دلاویزی پیدا ہوتی ہے انسان کا عین حسن یہی ہے۔

بادشاہوں اور فرمانرواؤں کا حُسن ظاہری چہرے پر وجاہت اور جبروت کے آثار ہوں آنکھیں تیز اور رعب دار ہوں رخساروں میں جلالت نگاہوں میں مروت و اخلاق کے ساتھ ایک خاص قسم کی قوت اور کشش ہو۔ جس سے دوسرے شخص کو آنکھ ملانے کی تاب نہ ہو سکے۔ خوبصورتی کے ساتھ تن و مند ہو۔ اور حسن باطنی یا حسن ذاتی میں ان اوصاف کی ضرورت ہے۔

عادل ہو شجاع ہو۔ رعایا پروری اور سیاست مدنی بدرجہ اتم ہو۔ سخی ہو۔ لا متعصب اور کسی ایک مذہب کا پابند ہو۔ رحیم اور بردبار ہو۔ صاحب اقبال ہو۔ دور اندیش دانائی اور زود فہمی ہے۔ مشورے میں کبھی عقل خطا نہ کرے۔ اُن سے زیادہ بادشاہوں کا کوئی مطیع ہو بجائے خود بادشاہوں اور جب بادشاہوں کے سامنے جائیں۔ تو اُن سے زیادہ مطیع اور فرمانبردار کوئی نہ ہو۔ رعایا کے مزاج سے ہر وقت باخبر ہوں۔ روئے زمین کے نقشے پیش نظر ہوں۔ فرمانرواؤں کے حالات سے کسی وقت غافل نہ رہیں۔

سپہ سالار اور فوجی افسروں کے حُسن ظاہری کے لیے قد کا قوی ہونا قد و قامت کا بلند ہونا آنکھوں کا بڑا اور پُر رعب ہونا سینہ کا چوڑا اور بازوؤں میں بلندی کے ساتھ خوبصورتی بہت ضروری چیز ہے۔ جرأت شجاعت کے آثار اور ہیبت و استقلال کا پایا جانا بھی نہایت ضروری ہے۔ اور حسن باطنی میں نیک دلی رحم و مروت نازک مزاج۔ حیادار۔ اور نیک نفس بھی ہونا واجبات سے ہے۔

ایک بادشاہی کا حُسن۔ جلالت۔ تنگ مزاجی اور صاف دروئی ہے حسن ظاہری میں قد بالا۔ مونچھیں بڑی ہاتھ معمول سے لانبے ہونا چاہئیں۔ اور تلوار کا دھنی بھی ہو۔

دیگر حکام اور پیشہ وروں کا حسن ظاہری تو خیر کیسا ہی ہو لیکن حسن باطنی
میں جفاکشی۔ بردباری۔ قناعت۔ مستقل مزاجی۔ خوش گفتاری۔ شیریں زبانی
خوش اخلاقی۔ لاپروائی ضروری اوصاف ہیں۔

علماء و فضلاء میں حسن سیرت کا ہونا واجبات سے ہے۔ اور حسن سیرت کے
اوصاف زہد و تقوی۔ پرہیزگاری۔ قناعت۔ بے لوث و ریا۔ عبادت شب بیداری
خاکساری۔ طرز معاشرت اور تمدن و اخلاق سے باخبری اور علاوہ وعظ و پند
مذہبی کے ان باتوں کی اصلاح کا بھی شوق اور ان ضروری امور پر بھی نظر
اصلاح و عفو سے رہنا۔ اور کسی نئی بات کا بخوف خدا پابندی احتیاط سے
روکتے رہنا۔ اور بشرط استطاعت غربا و مساکین سے بسلوک خوش پیش آنا اور
سعی و کوشش سے انکی حاجت برآری کرتے رہنا بہت ضروری ہے۔ جیسا کہ
عراق عرب و عجم کے اکثر شہروں میں پایا جاتا ہے۔

حسن ظاہری۔ یہ وضع میں شارب کا لحاظ۔ ریش بقدر یکمشت و دو انگشت
چہرے پر سباحت پیشانی پر گھٹا۔ آنکھوں میں حیا اور خوف خدا رخساروں پر ایک
قسم کا نور جسم کی نقاہت سے اظہار اشتیاق وصل خدا۔

طبقہ شعرا حسن ظاہری سے تو بالکل عاری ہوتا ہے کیا بہ لحاظ لباس اور
کیا بہ لحاظ صورت۔ بہ لحاظ لباس تو اسوجہ سے کہ شاعری کی بالکل قدر نہیں
اور قدر اس وجہ سے نہیں کہ دنیا کے کاروبار میں اسکو بالکل دخل نہیں۔ شاعر
اپنی شاعری سے نہ کوئی پل بنا سکتا ہے نہ کوئی عمارت اٹھا سکتا ہے۔ نہ ہوائی
جہاز اور موٹر و سائکل کا جواب دے سکتا ہے۔ نہ انجن تیار کرسکتا ہے۔ نہ
کوئی باجا ایجاد کرسکتا ہے۔ نہ کسی اخبار کے کالم بھر سکتا ہے۔ ہاں جھوٹ کے
پل جسقدر جی چاہے بنائے۔ ناؤں کی ہوا جی کھول کر باندھے۔ اور اُن میں

خیالات کے ہوائی جہاز ہروقت اُڑایا کرے۔ اپنی فکر کی مشین کے زور سے ہر روز نئے نئے ایجاد اور اختراعات کیا کرے۔ تو پھر اس سے کیا۔ سوائے دماغ کو راحت دینے یا بےچین ہو جانے کے کسی کے جسم کو تو راحت نہیں پہنچا سکتا۔ اور اب دماغی راحت رساں بھی پیدا ہو گیا۔ جسکا نام۔ گراموفون ہے۔ شاعر اپنی شاعری سے کوئی سواری تو ایسی ایجاد نہیں کرتا جس پر بیٹھ کر لوگ ہوا کھائیں اپنی قدر و منزلت دکھائیں۔ سواری تو در کنار کسی کو اپنی پیٹھ پر لاد کر اگر تھوڑی دور تک پہنچائے تب شاید کچھ مزدوری پائے۔

اس شاعری میں عز سادات بھی گئی (باقی آئندہ)

نشتر مشہدی لکھنوی

بیگم

اس نام کا ایک ماہواری رسالہ حقوق نسواں کی حمایت لڑکیوں اور بچیوں کی تعلیم امورات خانہ داری کی وضاحت کے اغراض کو مدنظر رکھکر انشاءاللہ جنوری سنہ ۱۹۱۶ء سے اہلیہ جناب قاری سرفراز حسین صاحب دہلوی (علیگ) سیاح جاپان و انگلستان کی ایڈیٹری میں لکھنؤ پل جھاؤ لال سے جاری کیا جائے گا حجم رسالہ ۴۸ صفحہ کاغذ و کتابت چھپائی مثل رسالہ "تمدن" کے ہو گی۔

قیمت سالانہ عہ ۲ دسمبر تک جن صاحبان کے نام درج رجسٹر ہو نگے اُن سے عہ اور "تمدن" کے خریداروں سے ہمیشہ کے لئے۔ عہ

جملہ خط و کتابت و ترسیل مضامین بنام ایڈیٹرس صاحبہ رسالہ "بیگم" پل جھاؤ لال لکھنؤ ہونا چاہیے۔

نازک امتحان

میرا خیال ہے کہ اللہ پاک نے مرد کو اس لیے بنایا ہے کہ وہ دنیا میں پیدا ہو کر اور بڑھ پل کر اپنی علمی زندگی اخلاقی طرز عمل علم مجلس و اصول انسانیت میں کامل طور سے ترقی حاصل کرے اپنے قول فعل چال چلن ٹھیک رکھے اپنی حیثیت سے زیادہ اپنے آپ کو مشیخت میں نہ ڈالے کیونکہ مشیخت ہی انسان کو تباہ اور برباد کر دیتی ہے آئندہ کے واسطے کچھ پس انداز ضرور کرے۔

(۱) کیونکہ اب جو اُسکے واسطے نئی زندگی شروع ہونے والی ہے اُس میں اُسکو کوئی دقت اور پریشانی نہ پیدا ہو۔

(۲) اگر وہ اپنے تئیں فضول خرچ بنائے گا تو بیوی بچوں کو تکلیف اُٹھانی پڑے گی۔

(۳) اگر وہ بدمزاج ہوگا تو بیوی آتے ہی اُسکے مزاج کی یہ حالت دیکھ کر بددل ہو جائے گی اور شروع شروع میں ڈرے گی بھی مگر جب یہ نئے دن نکلجائینگے اور دنیا کے آگے کے واقعات پیش آئیں گے تو اور دقتیں بڑھتی جائیں گی۔ اور یہانتک نوبت پہنچ جائے گی کہ بیوی بجائے رازدار ہونے کے ضروری واقعات بھی چھپانے لگے گی اور دلوں میں فرق پڑتے پڑتے بالکل دہراؤ کے خیالات رہنے لگیں گے۔ جو آئندہ اس گھر کو بجائے راحت وعیش کے نمونہ کے وبال بنا دیں گے۔

(۴) اگر علم مجلس نہوا تو یار دوستوں میں قدر منزلت نہو گی اعلے جلسوں سے چھپتے پھرینگے گھر میں کچھ روشنی تمیز و تہذیب کی نہو گی بال بچے بھی اُسی رنگ

ڈھنگ کے اُٹھیں گے بیوی بھی مردہ دل اور جیسی طبیعت کی ہو بالکل ویسی رہ جائیگی نہ اُسکا حوصلہ بڑھے گا نہ ہمت سو پھر یہ گھر کچھ روشن گھروں میں سے نہ ہو گا اسواسطے مرد کو زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کہ وہ گھر کا سردار بیوی بچوں کا مددگار رہے اگر اسی میں کوئی کسر رہ گئی تو پھر یہ گھر جو ایک نعمت غیر مترقبہ اللہ پاک اسکو عطا کرنے والا ہے اُسکی صحیح بنیاد کیونکر پڑے گی اور وہ ٹھیک ٹھیک کیونکر چلے گا۔

عورت کو کیا کیا مشکلیں پیش آنے والی ہیں:-

عورت کو اللہ پاک نے تو اسلیے بنایا تھا کہ وہ مرد کے دل کا پھول آنکھوں کا سرور چین اور تفریح کا باعث ہو اگر اُسکو یہ منظور نہ ہوتا تو حضرت آدم کے پہلو میں سے حضرت حوّا کو پیدا نہ کرتا کیا اُسکی قدرت میں اور طرح سے ہو پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں تھا وہ جسطرح چاہتا پیدا کر سکتا تھا مگر اُس نے اس رحم دل پھول کو اسلیے اسطرح نہیں پیدا کیا کہ وہ دنیا میں جا کر گلِ خاردار ہو جاے گی اور اُسکے لیے دنیا میں ایسی ایسی تکلیفوں کا سامنا ہوگا جس سے مرد بالکل مبرا ہیں -

جو لڑکی ہونے کے وقت کیسے کیسے نازوں سے پالی جاے کیا کیا ماں باپ اُسکے چاؤ چونچلے اُٹھائیں آج ہنڈکُلیا پک رہی ہے کل گڈّیا کا بیاہ ہے پرسوں چوتھی کا انتظام ہے ماں باپ ہیں کہ نہال ہیں کہ ابتو ماشاءاللہ ہماری بچی قرآن شریف ختم کر چکی جیلم رسالہ پڑھ رہی ہے میٹھے چاول پکا لیتی ہے گڈّیا کے کپڑے خاصے سینے لگی ہے اب چند روز میں گھر کا۔ تھوڑا بہت کام بھی سنبھال لے گی ماں کا ہاتھ بٹاے گی باپ کو پنکھا جل کر کھانا کھلاے گی باپ کے آنے کے وقت جو کچھ تھوڑا بہت کام ہوگا وہ کرے گی جانے کے وقت چھتری لکڑی وغیرہ دیا کرے گی۔

اب گڈیوں کے کپڑے سیتے سیتے اپنے پاجامے سلنے لگے اور کرتے اماں کتر دیتی ہیں

بیٹی سی لیتی ہے انہوں ماں نے کرتے میں بوٹیاں ڈالدیں اور بیٹی کو دیدیں کہ اس طرح تم بھی کاڑھو اب کڑھائی سلائی پڑھائی سب کو ترقی ہو رہی ہے اور خیر سے عمر بھی تیرہ چودہ برس کی ہو گئی ہے اب کہنے والوں نے جان کھانی شروع کر دی ہے کہ لڑکی جوان ہو گئی شادی کر دو۔ یا وا کے دل میں بھی اُلجھن سی ہونے لگی کہ لڑکی جوان ہو گئی شادی کر دینی چاہیے ماں پر بھی گھر والوں اور دنیا کے تقاضے شروع ہو گئے اور اُنکو مجبور ہو کر شادی کی فکر پڑی رقعہ پرچے آنے شروع ہو گئے کپڑے لتے سلنے لگے۔

اتفاق سے جس سے نصیب لڑا تھا وہ سب کی پسند آ گیا اور مُنہ میٹھا یا منگنی کی رسم ہو گئی بات پکی ہو جانے کے بعد حسب حیثیت تیاری شادی کی مستقل طور پر شروع ہو گئی اور ماں باپ بہت خوشی خوشی جو کچھ بڑی محنت اور مصیبت سے جمع کیا تھا اُس پیاری بیٹی کے دینے کے لیے تیار کر رہے ہیں اور اسی خیال میں لگے ہوئے کہ خدا ہماری عزت آبرو رکھے اس نازوں کی پالی ہوئی بچی کے ہاتھ پیلے کرا دے مگر اب تک یہ نہیں معلوم کہ یہ جو انجان آدمیوں اور غیر گھر میں جا رہی ہے اسپر کیا گزرے گی اور وہ اس نئے گھر میں جسکو اُس کے لیے نئی دنیا کہنا نا موزوں نہوگا کیا کرے گی اور کیونکر اُن نئے آدمیوں میں رہے گی نہیں اسکی تو ابھی اُنکو پروا بھی نہیں ہے ابھی تو شادی ہونے کی خوشی اور دولھن بنا ہوا دیکھنے اور داماد آنے کا شوق دل میں بسا ہوا ہے نہ یہ خیال کہ داماد صاحب کا مزاج کیسا ہوگا نہ یہ معلوم کہ سمدھیانہ والوں کا طرزِ عمل کیا ہوگا اور ہماری بچی سے کیسا برتاؤ کریں گے۔ (باقی آئندہ)

ح س ج۔ بیگم

ضروری اعلان

اس رسالہ کے متعلق یہ ارادہ کیا گیا ہے کہ انشاء اللہ اسے مستقل محنت اور کوشش کے ساتھ بتدریج ترقی دی جاے۔ شروع کے پرچوں میں آب و تاب اور غیر معمولی دلکشی کے سامانوں سے ارادةً پرہیز کیا گیا ہے۔ ورنہ بہت کچھ ممکن تھا۔ بتدریج انشاء اللہ تعالےٰ اسے نہ صرف ایک اعلےٰ درجہ کا علمی اور ادبی رسالہ بنانا مقصود ہے بلکہ اس سے چند اور ضروری علمی کام لینے ہیں مثلاً (۱) اُن حضرات کی قابل قدر تصنیف و تالیف کو اپنے خرچ سے چھپوانا اور شائع کرنا جو بعض مجبوریوں سے خود ایسا نہیں کرسکتے جن صاحبوں کو ہمسے یہ خدمت لینی منظور ہو وہ براہ نوازش ہم سے خط و کتابت کریں جو بصیغۂ راز رکھی جائیگی

(۲) وقتاً فوقتاً انعامی مضامین لکھوانا اور ہونہار طالب علموں کو خاص طور پر اس علمی خدمت کیطرف متوجہ کرنا اور اُنسے مضمون لکھوا کر اُنکی مالی خدمت کرنا بعض اوقات انعامی مضامین ہم خود تجویز کرینگے مگر جو صاحب کسی خاص مفید مضمون پر قلم اُٹھانا چاہیں اور ہم سے حق الخدمت کے متوقع ہوں وہ براہِ نوازش ہم سے خط کتابت کریں جو بصیغۂ راز رکھی جاے گی۔

(۳) خریداران "تمدن" کے لیے ایک سرکیولیٹنگ لائبریری قائم کرنا۔ جس سے بہت کم خرچ میں عمدہ عمدہ کتابیں اُن کی نظر سے گزر سکیں۔ السعی منی والاتمام من اللہ

ایڈیٹر

تبادلہ

اسوقت تک ہم کو تبادلہ میں بہت کم رسالہ جات اور اخبارات وصول ہوے ہیں جسکے یہ معنی ہیں کہ ابھی تک ایڈیٹر صاحبان نے پُرانے پتہ کی جگہ نیا پتہ "دفتر رسالہ "تمدن" پل چھاؤنی لال لکھنؤ" اپنے تبادلہ کے رجسٹروں میں تحریر نہیں فرمایا۔ پچھلا پرچہ ہم اُن تمام رسائل و اخبارات کو بھیج چکے ہیں جو ہمارے رجسٹر تبادلہ میں درج ہیں اور یہ پرچہ بھی بھیج رہے ہیں امید ہے کہ اس پرچہ کے بعد تبادلہ کے پرچہ ہمارے دفتر میں پہنچنے لگیں گے۔ ورنہ ہم آیندہ کا پرچہ اُن رسالجات اور اخبارات کو نہیں بھیجینگے جو ہمارے دفتر میں وصول نہیں ہونگے

منیجر

شاعری

شاعری پر اسوقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر آخر اس بحث کا فیصلہ نہ ہوتا تھا اور نہ ہوا کہ شاعری سوسائٹی کے لیے فائدہ مند چیز ہی یا نقصان دہ۔ اسوقت کسی خاص زبان کی شاعری زیر بحث نہیں ہے بلکہ عام طور پر شاعری کا ذکر کرنا مقصود ہے شاعری کی سطحی تعریف تو یہ ہوسکتی ہے کہ کسی خاص مضمون کو صاف اور سیدھی عبارت میں لکھ دینے کے بجاے اسکے تک بندی کے اصول کے مطابق اس قسم کے ٹکڑے کرکے قلبند کیے جائیں کہ طبیعت کو نثر سے زیادہ بھلے معلوم ہوتے ہوں۔ مگر تھوڑے سے غور و خوض کے بعد شاعری کی نسبتاً بہتر تعریف نکل آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ مضامین نثر کو پر اثر طریقہ پر منضبط کرکے اس تقسیم کے ساتھ پیش کرنا جو دلکش معلوم ہونے کے علاوہ طبیعت میں ایک خاص جذبہ اور جوش یا اثر پیدا کرے۔ شاعری کی ایک تعریف یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند کردینے کو شاعری کہتے ہیں۔ اصل میں یہ کوئی جداگانہ تعریف نہیں ہوی۔ اگر مذکورۂ بالا دونوں تعریفوں کو یکجا کردیا جاے تو بھی شاعری کی مکمل تعریف نہیں ہوتی۔

شاعری کی سینکڑوں تعریفیں ہیں ان میں ایک تعریف یہ بھی ہے کہ اسکے ایک بند یا ایک شعر کے ایک مصرع میں اسقدر مضمون آجاے جو اگر نثر میں لکھا جاے تو اسکے لیے کئی صفحہ درکار ہوں۔ مگر ان کئی صفحوں کی جگہ صرف چند لفظ جو طبیعت کو متوجہ کرنے والے ایک قاعدہ کے

مطابق ملا کر رکھ دیے گئے ہیں بالکل کفایت کرتے ہیں۔
ایک شاعر اپنے ایک شعر میں موجودات عالم اور اسکے عجائبات کا ذکر کرتا ہے جس سے اُن تمام چیزوں کی ایک جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ اور اسکے ساتھ دلی جذبات کا ایک خاکہ بھی پیش نظر ہو جاتا ہے۔ گو یہ بھی شاعری کا ایک ہی رخ ہے مگر اسکے کارآمد ہونے کی اسکے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں دی جا سکتی کہ بہت سی وہ باتیں تھوڑی سی عبارت میں بیان کی جا سکتی ہیں جو اگر نثر میں لکھی جائیں تو بہت طویل ہوں۔ شاعری کی اصل صفت یہ ہے کہ شعر آدمی کے جذبات پر اتنا گہرا اور فوری اثر کرے کہ سننے والا تھوڑی دیر کے لیے تو اسکے اثر سے اسقدر مغلوب ہو جاے کہ جو کچھ مطالبہ اس شعر میں کیا جاے اسکے پورا کرنے کے سوا اسے کچھ بن نہ پڑے۔ عرب میں شعرا نے قبیلوں کو بنانے۔ بگاڑنے۔ لڑانے۔ ملانے کے لیے جو کچھ بھی کام کیے ہیں وہ کچھ کم نہیں ہیں۔
ایک عرب ہی پر کیا منحصر ہے تمام دنیا کے شعرا کے متعلق اس قسم کے کارنامے علم میں آتے ہیں۔ "ایران کے ایک شاعر رودکی کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت امیر نصیر ابن احمد نے خراسان فتح کر لیا اور ہرات میں رہ پڑا اسوقت امرا وزرا نے رودکی سے لکھوا کر ایک قصیدہ بادشاہ کی خدمت میں گذرانا۔ اس قصیدہ نے امیر پر اسقدر اثر کیا کہ اُسی وقت ہرات سے بخارا کی طرف روانہ ہو گیا"۔ اسی طرح انگلستان اور فرانس کے بعض شعرا کے متعلق بھی یہ ہی بیان کیا جاتا ہے۔ انگلستان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جسوقت ایڈ ورڈ بادشاہ انگلستان نے

ویلز پر فوج کشی کی تو اسوقت ویلز کے شاعرون نے نظمین لکھکر اپنی قوم کو برانگیختہ کیا جس سے شاہ ایڈورڈ کو ویلز فتح کرنے میں بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ ویلز کی فوج مدمقابل کی فوج سے بہت کم تھی اسی طرح دو فرانسیسی قصائد کے متعلق بیان کیا جاتا ہے جو "مارسیلز اور" پیرس" کے نام سے مشہور ہیں اور جو چارلس دہم کے مقابلہ میں قوم کی آزادی کی حمایت کرنے کی ترغیب دینے کے لیے لکھے گئے تھے" ان مثالوں کے بعد یہ تو کہا ہی نہیں جا سکتا کہ شعر بیکار چیز ہے۔ بعض لوگ شاعری کو شکار کیطرح کار بیکاران کہتے ہیں مگر کیا ایسی شاعری بیکار ہو سکتی ہے جس سے اس قسم کے نتائج مترتب ہوں اگر بیکاری کے یہی معنی ہیں اور بیکاری کے یہی نتائج ہیں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں تو کوئی ذی عقل اسکے ماننے میں حبہ بھر بھی تامل نہیں کرے گا کہ "ایسی بیکاری پر کار آمد ہزار قربان ہے۔ شاعری یا شعر نے لوگوں سے بہت کچھ لکھوایا ہے کسی نے اسکے موافق قلم فرسائی کی ہے کسی نے مخالف" مخالفت میں منجملہ اور باتوں کے ایک یہ بھی دلیل پیش کی جاتی ہے کہ شعر میں بے انتہا مبالغہ ہوتا اور شعر سنتے سنتے لوگوں کی طبیعت مبالغہ آمیز ہو جاتی ہے جس سے وہ عملی کاموں کے قابل نہیں رہتے۔ جہاں تک واقعات کو غلط بیان کرنا شعر سے تعلق رکھتا ہے وہاں تک شعر کوئی عمدہ چیز نہیں ہے مگر معترض صاحب اگر تشبیہات یا باریک تمثیلات کو بھی مبالغہ میں شامل کرتے ہیں وہ ایک حد تک غلطی پر ہیں شعر پر اعتراض کرنے سے قبل اگر یہ غور کر لیا جاے کہ شاعر جو صرف ایک کام نہیں کرتا جسکے متعلق دریا کو کوزہ میں بند کرنا ہے جسکو اسی شعر میں

کچھ مصوری کے کرشمہ دکھانے ہیں کچھ موجودات قدرت مستقل کرشموں مثلاً جنگل پہاڑ وغیرہ کا ایک نظارہ پیش کرتا ہے اور اسکے جلو میں قدرت کے وہ جلوہ بھی دکھانے ہیں جو مستقل نہیں ہے یعنی برسات۔بجلی۔گرج بہار۔خزاں۔گرمی۔سردی وغیرہ وغیرہ اور ان چیزوں کی ہی ایک جھلک وہ نہیں دکھاتا بلکہ وہ ان مختلف سینریوں میں سے بیشتر کو اکٹھا کرتا ہے اور اگر صرف حسن اور عشق ہی کو لے لیجیے تو اس سب کے درمیان ایک ہیروئن کو اپنی کسی خاص ادا سے بیٹھا ہوا دکھاتا ہے۔

شاعر جسکو یہ سب باتیں دکھانی ہیں وہ آخر کیا کرے کہ ان سب باتوں کو بھی دکھائے اور اس میں سائنس یا ریاضی کی طرح روکھا پن موجود ہو۔اگر شعرا ریاضی دان بھی ہوا کرتے تو غالباً ریاضی وہ ریاضی نہوتی جو آج ہے اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شعر ظاہرا حالت میں یا یا الفاظ کے لحاظ سے کسی خاص واقعہ سے متعلق نہیں معلوم ہوتا مگر جو کچھ اثر مضمر ہوتا ہے وہ انسان کو اس واقعہ کے سب پہلو دکھاتا ہوا اس سے کچھ آگے لیجاتا ہے۔مثلاً کسی کے حسن کی تعریف میں ایک شاعر پری کا لفظ استعمال کرتا ہے یا پری سے تشبیہ دیتا ہے۔گو یہ مبالغہ اور سخت مبالغہ کہا جا سکتا ہے مگر کیا سُننے والے کی آنکھوں کے سامنے بہترین حسن انسانی کا نقشہ نہیں کھنچ جاتا؟ یہ ممکن کہ انتہائی حسن انسانی کے ساتھ اسکی نظر کے سامنے بھونڈا سا پری کا خاکہ بھی کھنچ جاتا ہو مگر اس پری کے خاکہ نے شاعر کا مقصد فوت نہیں ہوتا اور وہ سُننے والے کو بہترین حسن انسانی کا ایک نقشہ دکھا دیتا ہے۔بڑے بڑے مصوروں نقاشوں۔واعظوں۔ایکٹروں۔اور خداداد حسینوں پر جدا جدا ہر شخص

کچھ نہ کچھ اعتراض کر سکتا ہے۔ مگر ایک وہ شخص جو ان سب چیزوں کو چند لفظوں میں مکمل کرکے آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے اسپر تو جتنے بھی اعتراض ہوں کم ہیں۔

بعض لوگ شاعری کو میجک لنٹرن سے تشبیہ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شاعری بھی جتنی در پردہ تاریکی کی حالت میں ہوتی ہے اسی قدر زیادہ اچھی اور پسندیدہ معلوم ہوتی ہے اور کہتے ہیں کہ جوں جوں حقیقت کھلتی جاتی ہے اُسی قدر شعر کا لطف کم ہوتا جاتا ہے مثلاً فردوسی نے رستم کی بابت جو کچھ لکھا اب اُسے بہت کم لوگ سچ سمجھتے ہیں ظاہرا یہ بات جی کو لگتی ہوی معلوم ہوتی ہے مگر اسکے ساتھ اگر زمانے کی ترقیوں اور لوگوں کے خیالات پر غور کیا جاے تو کون یہ کہہ سکتا ہے کہ اس زمانے کا کوئی شاعر بھی اس طرح کے مبالغہ سے کام لے گا جس سے فردوسی نے کام لیا آج اگر کسی شخص کی بہادری کی تعریف کرنی ہوگی تو وہ آج کے مذاق کے مطابق ہوگی۔ کون یہ کہہ سکتا ہے کہ فردوسی اگر آج ہوتا تو وہ ہی کہتا جو اُس نے شاہنامہ میں کہا۔

دوسرے یہ کہا جاتا ہے کہ جوں جوں حقیقت کھلتی گئی طلسم ٹوٹتا گیا انسان کے متعلق ایسی کونسی جدید تحقیقات ہوی ہیں بلکہ جدید تحقیقات سے تو یہ ہی معلوم ہوا کہ انسان (رستم) کی قوت کے متعلق فردوسی جو کچھ لکھ گیا وہ در اصل واقعیت سے کم ہے کیونکہ اب انسان خود اگر سوا سو من کا گرز نہیں اُٹھا سکتا تو وہ سب کام کر گذرتا ہے کہ جو فردوسی بچارے کے انتہائی جدت طراز اور دوربین تخیل والے دماغ میں نہیں آ سکتے تھے یہ سارا کھیل مذاق طبیعت کا ہے اب لوگوں کا مذاق مبالغہ سے واقعیت کی

طرف زیادہ رجوع ہوتا ہے۔

شاعری کے خلاف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تشبیہات اور استعارات کم ہوتے جاتے ہیں۔ کم ہوتے جانے کی ایک تو یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ استعارات وغیرہ ایک عرصہ سے استعمال ہو رہے ہیں اور وہ عام طور پر ایسی ہی چیزوں سے لیے جاتے ہیں جو انسان کی نظر سے گذر سکیں اسلیے ان میں بار بار دُھرائے جانے کی وجہ سے دلکشی نہیں رہی یا یہ کہ استعارات و تشبیہات عام طور پر ناممکن الوقوع یا کم از کم مبالغہ کے تحت میں آنے والے اور مشکل دائرہ میں سے لی جاتی ہیں اور اب جیسا کہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے اس دنیا میں بہت سی ایسی باتیں جو غیر امکانی معلوم ہوتی تھیں دائرۂ امکان میں آنے لگیں اس لیے جسقدر ناممکن باتیں کم ہونے لگیں اوسی قدر استعارات اور تشبیہات کا دائرہ کم ہوتا گیا۔ پہلی دلیل کا جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ دنیا نے یا دنیا میں رہنے والے انسانوں کے دماغوں نے اسوقت تک اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ انکو تمام کائنات قدرت کا حال معلوم ہوگیا ہو۔ اور اس لیے ابھی دنیاوی اور سماوی چیزوں میں اسقدر گنجائش باقی ہے کہ ان سے کام لیا جاسے۔ دوسری دلیل کا جواب بھی یہی ہے مگر دوسری دلیل کے لیے یہ ہی جواب تجویز کر دینے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے ایجادات کرنے والے دماغ غیر امکانی چیزوں کی طرف جب ہی منتقل ہوے جب شاعروں نے انھیں کچھ ایسی باتیں سمجھادیں جو انسان کے مطلب کی ہوں اور ہم انسانوں سے اتنی مناسبت ضرور رکھتی ہوں کہ شاعر اسکو بطور کسی وصف یا حالت کی معراج کے تشبیہ کے طور پر استعمال کر سکے۔ اب میں سوال کر سکتا ہوں کہ وہ

چیز جو ایجادات کرنے والے دماغوں کو ایجاد کی طرف منتقل کرے سوسائیٹی کے لیے مضر ہو سکتی ہے؟۔

شاعری کی اس طرح حمایت کرنے سے اُس شاعری کی حمایت مقصود نہیں جو در اصل شاعری کہلانے کی مستحق نہیں ہے یعنی محض گل و بلبل کی شاعری۔

ایڈیٹر

استدعائے خاص

مَیں اپنے جملہ احباب اور اولڈ بوائز کی خدمت میں خاص طور پر سفارش کرتا ہوں کہ وہ مجھ پر عنایت کرکے رسالۂ "تمدّن" کو ترقی دینے میں کوشش فرمائیں جو احباب قلمی معاونت فرماسکتے ہیں۔ وہ براہ نوازش مضامین نظمیں۔ اور غزلیں عنایت فرمائیں۔ دیگر احباب خریدار بن کر اور خریدار پیدا کرکے ممنون فرمائیں۔ ایک علمی رسالہ جاری کرنے کا مجھے خیال عرصۂ دراز سے تھا۔ مگر میری مجبوریاں ابتک مانع ہوئیں۔ اب اللہ نے اپنے فضل سے میرے بڑے لڑکے عباس حسین سلمہ کو اس کام کے قابل کر دیا اور بمصداق ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ رسالۂ "تمدّن" برادر م مولوی عبد الراشد صاحب سے لے کر جاری کیا گیا۔ اب یہ جملہ محبان علم اور خصوصاً میرے ذاتی احباب کی توجہ کا محتاج ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ میری اس درخواست پر توجہ فرمائی جاےُ گی۔

خاکسار

سرفراز حسین قاری (علیگ) دہلوی

چاند

چاند کو کون نہیں جانتا۔ چاند اجرام فلکیہ کا وہ قابل قدر کرۂ نور ہے جو روشنی میں سورج سے دوسرے درجہ پر ہے اور دنیا کی اُلٹ پھیر کے ایک ساوی حصّہ کا سرتاج ہے۔ سورج دن کو اکیلا نظر آتا ہے مگر چاند جسکے نام میں کچھ محبت کا اثر ہے وہ سورج کی طرح اکھل کھرا نہیں ہے وہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ اس نیلگوں تخت پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔

چاند کے نام میں خبر نہیں کیوں اسقدر کشش ہے؟ اسکے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چاند کے سایہ میں کیونکہ طالب و مطلوب کے یکجا ہونے کا سین باوجود اس چرخ کجرفتار کی ناہنجاریوں کے بعض اوقات دکھائی دے جاتا ہے اس وجہ سے چاند میں اس محبت کا کچھ عکس پہنچ گیا ہے اگر اس دلیل کو چاند کی طرفداری میں پیش کیا جا سکے تو اسکی مخالفت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شب فراق بھی تو اس چاند کے سایہ میں بسر ہوتی ہے۔ اور جو عاشق ناکام رات بھر کروٹیں بدلتا اور چاند کی طرف دیکھتا ہے۔ اسکی مایوسی اور مایوس کن نظر کا اثر چاند پر کیوں نہیں پڑتا۔

اس نظر کا اثر تو ہمارے پہلے دعوے کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ گو شب فراق سہی۔ مگر شب فراق کی تڑپ جدائی کی مایوس نظر دونوں معشوق کی محبت میں ڈوبی ہوی ہوتی ہیں اور وہ اسی طرح چاند میں بھی محبت یا کشش کی قوت پیدا کر دیتی ہیں جس طرح ایک کامل پیر جس طرف نظر ڈالتا ہے اور جو اسکی نگاہ کی زد میں آجاتا ہے اسکے قلب کو منوّر کر دیتا ہے

چاند میں دلفریبی ہوتی ہے ! مگر سورج میں اسکے خلاف نظر کو پیچھے ہٹانے کی قوت ہوتی ہے۔ سورج میں ایک جلالی شان ہوتی ہے اور چاند میں جمالی شان کے علاوہ ایک اور قوت ہوتی ہے جسکو میں دلکشی سے تعبیر کر چکا ہوں۔

چاند کی طرف اگر آپ دیکھیں تو اسکو دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے اور بالکل یہ ہی بات حسین انسان میں ہوتی ہے۔ میں خدانخواستہ یہ منوانا نہیں چاہتا کہ معشوق اور چاند دونوں برابر کی چیزیں ہیں حضرت حافظ شیرازیؒ اسکا بہت پہلے فیصلہ فرما گئے ہیں کہ چاند کو معشوق سے کیا نسبت ہے۔

عارضش را بہ مثل ماہ فلک نتواں گفت
نسبتِ دوست بہ ہر بے سر و پا نتواں کرد

ہمارے ایک اردو شاعر نے بھی گو بہت صاف اور کھلا لکھا ہے مگر اپنی بساط کے موافق خوب لکھا ہے۔

چاند سے جو تجھ کو دے تشبیہ بے انصاف ہے
اسکے منہ پر چھائیاں ہیں تیرا مکھڑا صاف ہے

ان لوگوں کے لیے بیشک چاند سے معشوق کو تشبیہ دینا بامعنی ہو سکتا ہے جو اپنے معشوق کو چاند سے کمتر یا اسکے برابر سمجھتے ہوں۔ چاند کو اس دلنواز چیز سے تشبیہ دینے کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ خدانخواستہ چاند اوصاف معشوقیت میں افضل یا برابر ہے۔ ان لوگوں کو نظر انداز کرنے کے بعد جو ہمارے نزدیک اس قسم کی تشبیہات سے کر معشوق کو چاند سے کمتر سمجھتے ہیں۔ دوسرے طبقہ کی طرف رجوع کرنے سے چاند .. کو

معشوق سے کوئی نسبت نہیں دیتا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاند کی صرف اس وجہ سے وقعت کرتا ہے کہ چاند میں ان اوصاف میں سے چند کی ایک جھلک پائی جاتی ہے جو بدرجۂ کمال معشوق میں موجود ہوتے ہیں غرض اس تمام بحث سے جو کچھ بھی نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ دونوں فریق خواہ وہ چاند کو اپنے معشوق سے برتر خیال کریں یا بدتر وہ چاند کی اسی وجہ سے وقعت کرتے ہیں کہ چاند میں وہ اوصاف ہیں جو معشوق میں ہوتے ہیں۔ غرض محبت کے بندے چاند کو اس عالم موجودات کی بہت سی کیا بلکہ سوائے ایک کے سب چیزوں سے زیادہ قابل وقعت خیال کرتے ہیں اور یہ ہی اسکی دلکشی کا راز ہے۔

محمد ابراہیم دہلوی

"میں تم کو متنبہ کرتا ہوں کہ کبھی یہ خیال مت کرو کہ امارت کا لازمی نتیجہ خوشی ہے اور غربت کا رنج۔ کبھی اپنی زندگی کو یہ خیال کرکے شروع نہ کرو کہ تم کو دلی خوشی بھی حاصل ہوگی جب کہ تمھارے پاس دولت ہے۔ ایک آدمی کی خوشی زیادہ تر اس کے مزاج پر منحصر ہے اگر اس کا مزاج اچھا ہے تو امارت اسکے لیے خوشی پیدا کرنے کا باعث ہوگی اگر اسکا مزاج خراب ہے تو وہ رنج پیدا کریگی۔"

"ڈیمپیر"

رسوم

کوئی قوم کوئی ملک کوئی ملت ایسی نہیں جسمیں رسوم کا رواج نہ ہو رسم ہے کیا؟ رسم اُن رواجوں کا نام ہے جو ایک عرصہ تک کسی ملک میں جاری رہنے کے بعد لوگوں پر اسقدر حاوی ہو جاتے ہیں کہ انکو مضر سمجھنے کے بعد بھی ان سے پیچھا چھڑانا دشوار کیا ناممکن معلوم ہونے لگتا ہے خصوصیت کے ساتھ ان رسوم کو ترک کرنا جنکو بالواسطہ یا بلا واسطہ مذہب سے منظوری حاصل ہوتی ہے۔

رسم پر ہندوستان کے اُردو رسائل اور اخبارات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور جہاں ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہے جو رسم کی پابندی کو وضعداری خیال کرتا ہے وہاں اُس گروہ کے افراد بھی کچھ کم نہیں ہیں جو رسم کو ایک مہمل حرکت خیال کرتے ہیں۔ رسم کی پابندی کے معاملہ میں جو طبقہ زیادہ پابند وضع ہے وہ عورتیں ہیں قریب قریب ہر گھر میں مردوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ عورتیں رسوم کی پابندی کے لیے بیجا زور دیتی ہیں اور بعض اوقات تو یہاں تک ہوتا ہے کہ گھروں میں لڑائی کی بنا یہ ہی رسم کی پابندی ہو جاتی ہے۔ خاوند صاحب رسم کی پابندی حرام خیال کرتے ہیں بیگم صاحبہ رسم کو چھوڑنا کفر۔ اس چھوٹی سی بات پر آپس میں شکر رنجی ہو جاتی ہے۔ اسوقت تک جو بحثیں اس مسئلہ پر ہوئی ہیں وہ یہ بتاتی ہیں کہ سو میں سے نوے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ رسوم محض لغو ہوتی ہیں مگر تعجب اور رونا تو اس بات کا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ گروہ جو

رسم کو کفر اور اسکے کرنے والے کو قریب کافر سمجھتا آنکھوں دیکھے کنوئیں میں گرتا اور رسموں کو پورا کرتا ہے۔ رسوم قبیحا کو چھوڑنے کا وعظ کہنے سے پہلے ہمکو ان باتوں پر غور کرنا چاہیے جو رسم کو چھوڑنے نہیں دیتیں۔ کیونکہ مرض کی تشخیص ضروری ہوتی ہے اور جب مرض تشخیص ہوجاتا ہے جب کہیں مرض کے لیے دوا تجویز ہوسکتی ہے یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ رسم کو چھوڑنے کے لیے جو چیز مجبور کرتی ہے۔ وہ یا تو کفایت کا خیال یا مفت کی پریشانی اور تکلیف سے بچنے کی ضرورت یا اس رسم کا عام تہذیب کی ترازو میں پورا نہ اترنا۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو رسم کی پابندی سے آزاد کرنا چاہے تو وہ کم از کم اس وقت تک اس سے سبکدوش نہیں ہوسکتا جب تک پہلی مرتبہ وہ اپنے مقصد کو فوت نہ ہو جانے دے۔ بادی النظر میں یہ ایک مہمل سی رائے ہے۔ جو ان لوگوں کے لیے دی گئی ہے جو دنیا۔ کنبہ قبیلہ اور لوگوں کی طعنہ زنی کا حد درجہ خیال کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس خاص پابندی سے معرّا خیال کرتے ہیں وہ بالکل آزاد ہیں یہ ممکن ہے کہ وہ رسوم کو چھوڑ کر اپنے آپ کو تکلیف سے بچالیں اور کفایت کا ضروری مقصد بھی حاصل کرلیں مگر وہ لوگوں سے اپنی تقلید نہیں کرا سکتے۔

ہندوستان میں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں میں نوے ۹۰ فیصدی آدمی ایسے ملیں گے جو نہ تو خود کفایت کرتے ہیں اور نہ کسی دوسرے کو کفایت کرتا ہوا دیکھکر خوش ہوتے بلکہ اسکو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ ہر شخص خواہ کسی حیثیت اور کسی مرتبہ کا کیوں نہ ہو نظرتاً وہ اس بات کو برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی فرد بھی اسے بے وقعت

سمجھے اور اسی لیے وہ رسوم کو چھوڑنے کے فوائد کو محض اس لیے قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کہ کہیں لوگ اسے بے وقعت خیال نہ کرنے لگیں اس لیے اس شخص کے لیے جو رسوم کی اصلاح کرنا چاہتا ہے لازم آیا کہ وہ ابتدا میں کفایت اور اپنی تکلیف کے خیال کو نظر انداز کرے۔ جب وہ دو چار دفعہ کے بعد اپنے اصل مقصد کو پورا کرسکے گا اور رسوم کی اصلاح ہونے لگے گی۔

جہاں میں رسوم کی اصلاح کا مدعی ہوں وہاں میں یہ نہیں کہتا کہ رسوم کو یک قلم ترک کر دیا جائے کیونکہ ہندوستانی عورتوں کا ملنا جلنا بہت کچھ ان رسوم پر مبنی ہے اور اس ملنے جلنے سے بہت سے ضروری کام مثلاً لباس وغیرہ کی اصلاح۔ سلیقہ شعاری اور طریقہ برتاؤ کا علم اور شادی بیاہ کے متعلق ابتدائی معاملات سرانجام پاتے ہیں۔

ایک دوسرے سے ملنے جلنے میں تخفیف کرنے کا خیال کرنا میرے نزدیک سوسائٹی کے لیے مضر معلوم ہوتا ہے اور اس مضمون کے لکھنے سے میرا مدعا یہ ہے کہ رسوم بھی رہیں اور ان میں ایسی سہولتیں بہم پہنچ جائیں جو خوبی اور لطف کے مقابلہ میں حد سے زیادہ تکلیف دہ نہوں اس خاص مسئلہ پر ملک کے اہل قلم اپنی اپنی رائے دیں۔ کہ موجودہ رسوم میں کس طرح اصلاح ہوسکتی ہے اور ان کی تکلیف دہ باتوں کی جگہ کیا کیا ایسی باتیں پیش کی جاسکتی ہیں جو سہل العمل بھی ہوں اور نسبتاً پر لطف بھی۔

اخلاق حسین۔

جون جولائی ۔ جو صاحبان جون جولائی کے پرچے ہم سے طلب فرماتے ہیں انکی خدمتیں التماس ہے کہ جون جولائی کے پرچے تمدن پریس دہلی سے شائع ہوئے تھے اور ان کے متعلق انکی پتہ پر خط و کتابت ہونی چاہیے۔

منیجر

مرد۔عورت

ذیل کے دونوں مضمون "خطیب" دہلی میں شایع ہوے ہیں۔ ہم ناظرین تمدن کی دلچسپی کی غرض سے انہیں نقل کرتے ہیں۔ پہلا مضمون "عورت سے" سید ظفر حسن صاحب علوی ناظم دائرۃ الادب دہلی کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا ایک عورت کا لکھا ہوا ہے جو حضرت نیاز فتحپوری کے توسل سے خطیب تک پہنچا ہے۔ ایڈیٹر

عورت سے

او سراب نشاط! تیری فتنہ سامانیوں نے، خدا جانے، کیا کیا بلاخیز ہنگامے راحت بخشی کے پردہ میں اب تک برپا کئے ہیں، اور کون جانتا ہے کہ ابھی تیری عجیب و غریب ذات سے کیا کیا مظالم و مصائب افسانے ہونگے، مجکو ابتک تیری سب سے پہلی نوازش یاد ہے جبکہ تیرے لئے میرے بائیں پہلو کو چاک کیا گیا تھا اور تو نامعلوم و غیر محسوس طریقہ سے میرے پہلو میری سکون نصیب خلوت پر قابض تھی۔

او فریب نشاط! "ہابیل و قابیل" کی سب سے پہلی عداوت میں تیرے ہی رخسار آتشین کا جلوہ تھا!

او ہنگامہ خاموش! "بنی اسرائیل" میں فسادات کی ابتدا تیرے ہی نگاہ فسوں ساز سے روبراہ ہوئی تھی۔

او شربت سم آلود! **او میٹھی چھری**۔ تیری ہی نامعلوم دھار برسوں مصر کے قید خانے میں ایک معصوم کی آزادی پر پھرتی رہی **کیا تو وہ نہیں ہی** جس نے ہفت خانہ بنا کر ایک نبی کی عصمت اور ناموس الٰہی کو پھسلا کر لوٹ لینا چاہا تھا!

او زاہد فریب! شیخ صنعاں کا طویل زہد کسی نے بیک اشارہ ابرو مستہ کیواسطے پامال کر ڈالا۔

ے کیا تو نہ تھی۔

برش مہم یہ غریب فریاد کا خون اب تک تیری فقرے بازیوں کا نوحہ خواں ہے۔

مقابل مجہول یہ اچھا بتلا۔ لڑکا، کسکے نام پر راکھ کا ڈھیر بنائی گئی اور نخچیر فراغت کیا لو یاد نہیں رہا۔ غریب رتن چین پر تو نے کیا کیا مصائب ڈالے اچھا وہ کون تھا جس نے ں سے حکومت چھڑائی۔ او **پیش سرو** نا شیر افگن کا رخت ہستی۔ کسکی جنگاری سے خاک ہوا

تصویر قیامت تجکو وقعہ ملنا شرط ہے پھر تو **بلائے ناگہانی** ہے جام غفلت ہے وزو صبر ہے **مرگ ہوش و حواس** ہے **زندان آزادی** ہے غرضیکہ وہ سب ہے جو ابتلائے عظیم کے لئے درکار ہونا چاہئے۔

وپھسلانیوالی گڑیا بظاہر نہایت بھولی بھالی "غریب صورت" "ترحم خواہ" "بے کس" زک یا نحیف کمزور، ہول ہلانیوالی ہے **مگر اُف** تو بڑی ظالم و جابر ہے **تو سراپا** برق بجسم ہے۔ تیرے قبضہ میں لاکھوں حیات سوز **اور اُوکا** "خون خوار ناقابل ہزیمت شکر ہے جنکے پاس **ہلالی ابروں کے دو ہرے تیغچے** ہیں جنکے نشانوں پر **شہ زوروں کی مشکین** کس لینیکو ہزاروں کمندیں ہیں۔ جن کے پاس **مسموم کر دینے والی** "گیس (شمیم زلف)" ہے جنکے پاس قلوب کے سنگین حصاروں پاش پاش کر دینی والی بجلی (او) **برق تبسم**" ہے جنکے پاس سرچ لائٹ **(رخ روشن)** اپنے شکار کو دور سے دیکھ لینے کے لئے ہے۔

تیری ان آنکھوں میں بداور رس کہاں ہے انمیں **تو وجالیت** ہے جسکو چاہتی ہیں زندہ کرتی ہیں جنکو چاہتی ہیں مار ڈالتی ہیں۔

او قیامت صغرا "خدا جانے تیرے پر آشوب سینہ پر کن عالمگیر آتش زن مادہ کا ڈھیر ہے۔ شاید آتش فشاں پہاڑ ہی ہیں۔

تیری چتون کا بل، وہ بل نہیں جو قسمت میں کبھی پڑ جاتا ہے اور کبھی نکل جاتا ہے

بلکہ یہ وہ بل ہے جو کہیں حسام زہر بنکر حلق میں اتر جاتا ہے اور کہیں خنجر جانستان بنکر کلیجہ میں تیر جاتا ہے۔

او فریب محبت تیری لگاوٹیں۔ آہ خون کو سفید کر دیتی ہیں قدرتی محبتوں کو توڑ دیتی ہیں پانی میں آگ لگا دیتی ہیں۔

او تقویٰ شکن جب تو چاہتی ہے انسانوں سے۔ خدا کو بھلا دیتی ہے۔ تیری شراب التفات کو اسقدر پر شور ہے اسقدر تند ہے کہ ناچیز انسان اس جبار و قہار کی قدرت کی پرواہ کو بھو جاتا ہے۔

او خوبصورت بلا "جب تو اپنی طرف بلاتی ہے پھر اسکو جسے تو نے بلایا کوی قوت روک نہیں سکتی۔ خواہ اسکے سامنے بھڑکتی ہوئی آگ لائی جائے۔ یا مواج سمندر۔ یا مہیب و شوار گذار پہاڑ۔ یا سنسان و وحشت خیز جنگل۔ وہ ضرور تیرے مشق ناز کیلئے تیرے پاس ہوتا ہے۔

او صبح کاذب "جب تیری زبان سے۔ کسی کے واسطے ہاں نکل جاتی ہے تو پھر ہنین "نہیں ہوتی نہیں ہوتی" خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

او سفید جھوٹ "جب تو چاہتی ہے بڑے بڑے گھرانوں کی عزتیں ...... ٹھیکری ہو جاتی ہے کیا تو وہ نہیں ہے جو راتوں کو شیطان کی پرستش کرتی ہے اور صبح کو نہیں شرماتی۔

او اکال الامم "امویوں کو تو نے کھویا عباسیوں کو تو نے برباد کیا ایرانیوں کو غارت کیا ہندوستان کو تباہ کیا۔ افریقہ کو غارت کر رہی ہے "خانوادہ حالات میں تیری لگائی ہوئی آگ اب تک نہیں بجھی باوجودیکہ لاکھوں بہادروں نے اپنی عزیز و پاک خون سے بجھائی غریب بے زبان پارسیوں پر تو نے بڑھے جن کیطرح سوار ہے۔ یورپ کو عنقریب ...... والی ہے۔ وہ کونسی ریاست ہے جسکا دامن تیرے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپٹ سے بچا ہوا ہے

پناہ بخدا۔ ‘‘الحذر الحذر’’، اچھا بتلا، تو کس طمانیت پر ہم سے چاہتی ہے کہ تجھ پر بھروسہ کیا جائے، یورپ نے تجھ پر بھروسہ کیا۔ کیا پایا۔ آج تیرے ہاتھوں وہ اسقدر مجبور ہیں کہ تیرے خلاف آواز بھی نہیں نکال سکتے۔ مشرق میں جو کچھ تو نے کیا۔ اگر وہ بھول گئی ہو۔ تو جا اور روا بشلیم کی چتا سے پوچھ یا سعدی کی قبر سے دریافت کر۔ یا ملاحسین سے معلوم کر۔ یا عنایت اللہ کی گور بے نام نشان سے سن۔ یا یورپ ہی میں تجھکو پوچھنا ہو تو شکسپیر سے پوچھ۔ پوچھتے ہوئے شرمائے تو ایڈلین کے کارخانہ میں جا جہاں فلمیں تیار ہوتی ہیں۔ چشم عبرت کھول اور اپنے سیاہ کارنامے دیکھ اپنے مظالم کی کہانیاں سن اپنی فتنہ پردازیوں کی داستانیں پڑھ اور شرما اب ہمارے پاس تیرے لئے کچھ باقی نہیں رہا۔ گو تیری چلتی ہوئی تدبیریں اب بھی بے پناہ ہیں۔

کس ضمانت پر ہم تجھکو آزادی دیں۔ کیا تو یہ چاہتی ہے۔ تجھکو دولتوں کو۔ عزتوں کو۔ نیکو نکو تباہ کرنیکے واسطے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے۔ تو اب یہ چاہتی ہے کہ تیرے عالم آشوب چہرہ سے نقاب اسلئے دور کر دیا جائے کہ قتل عام میں تجھے آسانیاں ملجائیں۔ یا تو اس سرے سے اُس سرے تک اطمینان کے ساتھ آگ لگا سکے۔ اب چار دیواریوں سے تو کیا اس باہر انا چاہتی ہے کہ ہماری رہی سہی زندگی کا بھی خاتمہ کر دے۔ او ظالم اسقدر تا بگسل مظالم پر بھی تجھکو صبر نہ آیا۔ اب بھی تیری پیاس نہ بجھی۔

گو تیرے سحر میں مسحور ‘‘لاکھ دھوکے دیں۔ تربیت اولاد تعلیم اولاد تکمیل تہذیب ترقی تمدن کے لاکھ افسانیں گائیں لیکن جنہیں خدا نے عقل دی ہے۔ وہ تیری سرشت کو تیرے انجام کو خوب پہچان گئے ہیں۔ اب تو چاہے علیگڈہ میں اپنی تعلیم و تہذیب کا ڈنکا الصنف کر یا لکھنؤ میں تیرے لئے نظامی کا یہ فیصلہ ہو اگر نیک بود سرانجام زن۔ زناں را مزن یو دے نہ زن بالکل درست ہے تو اسی کی مستحق ہے۔ جا سامنے سے دور ہو اور کسی پاگل کو تہذیب و تعلیم کا تازہ فریب دے۔ تو جن کیلئے مایۂ ناز ہے انہیں کے سروں پر سوار ہو۔ اور انہیں ک

اپنی شرارتوں کا آلہ بنا۔ کوئی عقل مند تجھکو منہ نہ لگائے گا۔ تو غضب الٰہی کی متحرک تصویر ہے

مرا دامن چھوڑ چھوڑ۔ معاف کر۔ (باقی آئندہ)

(مظفر حسن علوی)

مرد سے

اے احسان فراموش! اے تو وہ کہ تجھے کبھی حقیقت کے انکار کرنے سے شرم نہیں آئی اور اے تو وہ کہ تجھے کبھی صداقت کو دنیا سے مٹا دینے کے لئے اپنی جسارت سے شیکایت نہیں ہوتی، دیکھ مجھکو اپنے اُن کارناموں کی یاد نہ دلا، جو ہر چند تیرے ناصیہ کا زیب کے لئے طرہ فخر و امتیاز ہوں، مگر ہماری جنس کی تباہی اور بربادی کی سخت دردمند المناک داستانیں ہیں، اے حق ناشناس! آج تو اپنے بائیں پہلو کے چیرے جانیکی شکایت کرتا ہے (مدعا یہ ہے کہ میری اولین آفرینش کو بھی اپنے لئے باعث تکلیف ثابت کرے) حالانکہ تجھے یاد ہوگا کہ تو باوجود ایک وسیع فضا والی پُربہار جنت کے مالک ہونیکے بھی افسردہ و مضمحل تھا۔ تو جنت سے بیزار تھا، تو نے اُس سے فریاد کی کہ خلد سونی کیوں ہے؟ خدایا باوجود تمام اسباب راحت و نشاط کے مہیا ہونے کے یہ ایک غیر ممکن ویرانی سے کیا ہے، فردوس جسے حقیقتاً گلشن ہی کہنا چاہیئے کیوں اُجاڑ سا نظر آتا ہے، کیا ان لہلہانے والے پھولوں، تر و تازہ پھلوں، شاداب درختوں، ان سکون نظر نہروں کے علاوہ بھی کسی اور چیز کی ضرورت ہے جو باغ جناں میں نہیں ہے، اگر ہے تو وہ کیا ہے؟، جب بارگاہ قدس میں اس تیرے غم و الم اس بیقراری و اضطرار کو فرشتے لے گئے، تو تیرا وہ کھویا ہوا سکون جس کے لئے تو تڑپ رہا تھا تیری وہ حقیقی طمانیت و راحت جسکا عوض جنت کی کوئی چیز نہ ہو سکتی تھی، تجھے میری صورت شکل میں عنایت ہوئی

اب چاہے تو پہلو کے چیرے جانے کی فریاد کرتا پھر یا کوئی اور الزام خدا پر دے، کیونکہ (جیسا آگے میں ظاہر کروں گی) تو الزام رکھنے میں بڑا مشاق و شاطر ہے مگر یہ تو سمجھ کہ تجھے (بقول تیرے) اس عمل جراحی کی ضرورت تھی یا نہیں، اگر ہم مان بھی لیں کہ جب تیری پسلیاں ایک دوسرے سے جدا کی گئیں تو تجھے تکلیف ہوئی، لیکن اے کم فہم کیا تجھے اس تکلیف سے یہ سبق نہیں ملا کہ دنیا میں تجھے کوئی راحت کوئی لذت نہیں مل سکتی جب تک تو پہلے صعوبتوں کو برداشت کرے، اور اسی کے ساتھ کیا یہ تیری فطرت نہیں ہے کہ پھر اس چیز کی تو زیادہ قدر کرتا ہے جو زیادہ محنت و مصیبت سے ہاتھ آتی ہے۔ لیکن اے تو وہ فریب مجسم کہ جب تک کوئی چیز تجھے دستیاب نہ ہو سراپا عہد و پیمان ہے اور جب ملجائے تو تو یکسر غفلت و نسیان، تجھے یہ بات تو یاد رہ گئی کہ میں تیرے لئے جراحت پہلو تھی، لیکن یہ بتا کہ راحت پہلو کون تھا۔ اگر احسان بھلا دینا تو اپنی خو نہ کر لیتا، اگر احسان کرنے والے کو ٹھکرا دینا تیری زندگی کا اہتمام بالشان کارنامہ نہ ہوتا، اگر حمیت و غیرت کے الفاظ تیرے لغت میں اصطلاحات مہملہ نہ ہوتے۔ اگر تو نکتہ شناس ہوتا تو اے خیرہ چشم، تو سمجھتا کہ میرا تیرے پہلو سے پیدا کیا جانا سوائے اس کے کوئی معنی رکھتا ہی نہ تھا کہ تو مجھے ہمیشہ اپنے پہلو سے لگائے رکھتا، اور تو قدر کرتا کہ میں تیرے اس پہلو کا جزو لطیف ہوں جہاں اے ظالم تیرا دل اب بھی تیری بیرحمیوں پر سر دھن رہا ہے۔ اے صداقت نواز ہاتے تو وہ کہ کذب و افترا کا تہا نایک بنا بیٹھا ہے، ہابیل و قابیل کی باہمی عداوت کا ذمہ دار تجھے نظر آتا ہے، بنی اسرائیل کی تباہی میرے سر تھوپتا ہے، شاہان سلف کی بربادیاں میری وجہ سے بتاتا ہے، زاہدوں کی لغزش کو میری خطاؤں میں شمار کرتا ہے، مجھے ہنسی آتی ہے (حالانکہ میرا ہنسنا بھی تیرے نزدیک جرم عظیم ہے) اور عجب نہیں جو اتنا کہہ دینے سے اپنے کسی اور گناہ کو بھی جس کا ذکر کرنا تو پہلے بھول گیا ہو، اب اس میری ہنسی کی وجہ سے بتلا دے۔ لیکن میں ہنسوں گی

اور کیوں نہ ہنسوں، جب میں یہ دیکھتی ہوں کہ تو نے اپنے زعم باطل پر اعتماد کرکے غریب تاریخ کو بھی مجروح کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا جس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ وہ بھی بدقسمتی سے مونث ہی بولی اور لکھی جاتی ہے، کیا تجھے خبر نہیں کہ تیرے بھائی قابیل کی قربانی خدا نے رد کردی تھی، اور ہابیل کی قبول کرلی تھی، کیا تجھے علم نہیں کہ قابیل و ہابیل کی باہم عداوت کی وجہ یہ تھی، مگر جب تیری انتشار میں کسی پر بہتان رکھنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، تجھے کیا تو کہدیگا کہ "اگر قربانی کا جھگڑا تھا تو کیا ہوا۔ قربانی بھی تو آخر مونث ہی ہے"

بنی اسرائیل کی تباہی میرے سر تھوپتا ہے۔ اے کافر نعمت، من و سلوی کھاتے کھاتے لہسن پیاز کو تیرا ہی جی للچایا ہوگا، موسے جب کوہ طور سے لوٹے ہونگے، تو گوسالہ سامری کی پرستش کرتے مجھی کو دیکھا ہوگا، احکام خدا و رسول سے سرتابی میں نے کی ہوگی، تباہ و برباد ہوا اپنی نافرمانی سے اور الزام رکھے مجھ پر مگر کہدے کہ "نافرمانی بھی تو مونث ہی ہے۔

بنی امیہ کی بربادی کا سبب مجھے بتاتا ہے، بنی عباس کا زوال میری ذات سے متعلق کرتا ہے، مگر جب تو نے مجھکو مجرم گردانے میں تاریخ کی ورق گردانی ہوگی، تو کیا تیری نگاہ سے یہ نہ گذرا ہوگا کہ بنی امیہ کی سلطنت حسین کے خون سے قایم ہوئی اور اس لئے وہ سلطنت جو ایسے حادثہ کبریٰ سے شروع ہوئی ہو، اور جس کے تمام افراد نے بنی فاطمہ کے تباہ کرنے میں بیجا ظلم وستم اپنا شعار کرلیا ہو وہ زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رہ سکتی ہشام بن عبدالملک کا حال پڑھ جو ایک قوی تاجدار اس خاندان کا تھا اور سمجھ کہ کیوں اس کے مرتے ہی سلطنت کا زوال شروع ہوگیا اور کیوں ٩٠ برس کی مختصر مدت سلطنت حکومت زوال سب ہی کچھ ختم ہوگئی، بنی عباس اور بنی فاطمہ جو دونوں ایک دادا کی اولاد تھے۔ چاہئے تھا کہ بنی امیہ کے بعد ملکے زندگی بسر کرتے، مگر نہیں وہ باہم صلح و آشتی سے نہیں رہ سکتے تھے

کیونکہ وہ مرد تھے جنکے خمیر میں باہم جنگ و فساد موجود ہے، بنی عباس نے بھی بنی فاطمہ پر وہی بلکہ اس سے زیادہ ظلم توڑے جو بنی امیہ نے کیے تھے۔ کیا عبداللہ نبیرۂ حسن بن علی کو منصور عباسی نے قید کر کے مار نہیں ڈالا، کیا عبداللہ کے تیسرے بیٹے یحییٰ کو ہارون الرشید نے زہر سے نہیں مار ڈالا، کیا خلیفہ ہادی عورت تھا جس نے حسن مثلث پوتے حسین کو موضع فخ میں تہ تیغ کر دیا، کیا خلیفہ معتصم مرد نہیں تھا جس نے عمر بن علی بن حسین کے پوتے محمد کو قید میں گھلا گھلا کر مار ڈالا، کیا ہلاکو تیری جنس کا ایک بہادر فرد نہیں تھا جسنے خلافت عباسیہ کا تختہ بغداد میں جا کر اولٹ دیا، مگر تو جواب دیگا کہ بنی امیہ تباہ ہوئی بنی فاطمہ کی بغاوتوں سے، بنی عباس برباد ہوئی اس وجہ سے کہ اخیر وقت میں وزرار سلطنت بنی فاطمہ سے ملگئے تھے اور چونکہ بنی فاطمہ، فاطمہ کی اولاد تھے اسلئے تیرا الزام پھر بھی وہی رہا کیونکہ فاطمہ بھی عورت ہی تھیں۔ باقی دارد

صبح کا ستارہ

ازجناب نند محمد صاحب انور سیالکوٹی

بظاہر دیکھنے میں تو بہت حیران ششدر ہے
حقیقت میں ہزیمت خوردہ فوج سکندر ہے

بھلا تو ہی بتادے تیری غم میں کیسی حالت ہے
تجھے کس کی محبت ہے تجھے یہ کیسی فرقت ہے

خموشی ہی خموشی دہر میں ہر سو برستی ہے
تری تاب تکلم کہنے سننے کو ترستی ہے

چلا ہے آخر شب تو وطن سے بیوطن ہوکر
چمن کو چھوڑتا ہے ورنہ ہے زیب چمن ہوکر

طیور بوستاں فرقت میں تیری محو گریانی
ترے جانیسے لیلائے فلک کی ہوگی عریانی

جو سمجھا باغباں شبنم یہ آنسو ہیں نہیں شبنم
کسی کا درد خاطر ہے کسی کا گریۂ پیہم

ابھی آیا ہے محفل میں ابھی یاں سے رواں ہوگا
ترے پیچھے رواں تاروں کا سارا کارواں ہوگا

مکالمۂ زبان و قلم

از جناب حسن مرزا صاحب شررؔ مشہدی لکھنوی

پھر گلفشاں زباں گہر افشاں قلم ہے آج
پھر مجھکو باغ و گنج مضامین ہم ہے آج
پھر سامنے تجمل طبل و علم ہے آج
پھر دست زور وار میں تیغ دو دم ہے آج
پھر ہے شررؔ کے نام کا جھنڈا گڑا ہوا
پھر معرکہ ہے کلک و زباں میں پڑا ہوا

دعویٰ قلم کا ہے کہ میں شاہ سخن بڑا ہوں
دنیا میں صلح کل ہوں مگر صف شکن بھی ہوں
بے انتہا کریم بھی ہوں سر فگن بھی ہوں
میں منکسر مزاج بھی ہوں تیغ زن بھی ہوں
کس طرح متصف ہوں نہ لاکھوں صفات سے
ہے انتظام ملک سخن میری ذات سے

گویا ہے یوں زباں مرے سر کوئی نہیں
مجھ سے حجاب و شرم میں بہتر کوئی نہیں
میری طرح سے صاحب جوہر کوئی نہیں
مجھ سے نہ کام لے تو سخنور کوئی نہیں
ہر بات میں بشر کو مری احتیاج ہے
سن اے قلم کلام کو مجھ سے رواج ہے

کہتا ہے کلک میرے لئے ہے ایاغ علم
میں نے کیا زمانہ میں روشن چراغ علم
میری شمیم سے ہے معطر دماغ علم
دریا دلی سے میری ہے سرسبز باغ علم
سب جانتے ہیں وجہ بقائے بیاں ہوں میں
دست کدیور چمن بے خزاں ہوں میں

یہ قول ہے زباں کا خامے سے ہمدم
میری ہے احتیاج بہت اور تیری کم
شامل اگر نہوں تو نہ کچھ ہو سکے رقم
میرے بغیر تو بھی ہے بیکار اے قلم

بلبل اشارہ یہ رکھتی ہے مجھ سے ترانے میں
محتاج ہے ہر ایک زبان کے زمانے میں

کہتا ہے اب قلم یہ زباں سے بہ انکسار — میری ضرورتیں بھی ہیں دنیا پہ آشکار
تحریر میں کروں تو بیاں کا ہو اعتبار — میرے سبب سے ہے ترے ہر قول کو قرار
آنے دیا نہ فرق کبھی میری بات میں
سب ہیں قلم کے دست نگر کائنات میں

کہتی ہے یہ زباں کہ عبث کرتے قیل و قال — کیونکر کلام تونے کیے یہ تو کر خیال
میری طرح سے اپنے بیاں کر گیا کمال — اس بات کے لئے کوئی صورت نئی نکال
قوت سے میری قدر نہ اپنی بلند کر
تو اپنے حسب حال خموشی پسند کر

خامہ کا ہے یہ قول سنے تجھے کیا خیال ہے — یہ مجھ میں اسکی شان سے طرفہ کمال ہے
دعوی کروں زباں کا مری کیا مجال ہے — لیکن مجھے خموش کرے تو محال ہے
سمجھوں شریک کیوں تجھے اپنے کلام میں
قوت کو اپنی آنے نہ دے میرے کام میں

بس اب خموش ہو تجھے لازم ہے انفعال — تو ہے زباں دراز بہت اور بری خصال
قادر ہے بات بات پہ وہ رب ذوالجلال — مجھکو عطا کریم نے کی ہے زبان حال
رتبے خواص کے ہیں زیادہ عوام سے
بہتر ہے خامشی کہیں طول کلام سے

ہے یہ بیاں زباں فصاحت شعار کا — سب مجھ سے ذکر کرتے ہیں پروردگار کا
کہتی ہوں حق ہے حال دل بیقرار کا — دیتی ہوں ساتھ عابد شب زندہ دار کا
جو ذی حیات ہے مرا احسان مند ہے

تسبیح خواں مجھی سے ہر اک حق پسند ہے

گر میں نہ ہوں تو علم بھی حاصل نہ ہو سکے — گر میں نہ ہوں تو حل کوئی مشکل نہ ہو سکے
گر میں نہ ہوں تو ایک بھی قائل نہ ہو سکے — گر میں نہ ہوں تو حلِ مسائل نہ ہو سکے
جنبش ہو کیوں لبوں کو جو منہ میں زباں نہ ہو
تقسیم نقطۂ دہنِ شاہداں نہ ہو

گر میں نہ ہوں تو پھر نہ مقرر کا نام ہو — کیونکر کوئی کسی سے بھلا ہم کلام ہو
میرے بغیر کام ہر اک ناتمام ہو — کس طرح سے حصول ثوابِ سلام ہو
مجلس میں آکے کوئی کرے پھر خطاب کیا
سب لاجواب ہوں تو کوئی دے جواب کیا

میں ہوں کلید قفل دہن ملب گواہ ہیں — ہر اک کے کام آتی ہوں میں سب گواہ ہیں
شاہد ہے علم اور مخاطب گواہ ہیں — میرے بیاں کئے ہوئے مطلب گواہ ہیں
آگاہ گوش دل سے ہوں نہ کیوں ہر سعید کے
معنے سنے ہیں مجھ سے کلام مجید کے

ناطق اگر نہ میں ہوں تو انساں کوئی نہ ہو — ذکر مصائب شہ ذیشان کوئی نہ ہو
میرے بغیر حق کا ثنا خواں کوئی نہ ہو — گر میں نہ ہوں تو حافظ قرآں کوئی نہ ہو
باعث ثواب ذکر کلام خدا کی ہوں
میں نرو باں بلندیٔ ذہن رسا کی ہوں

دنیا میں لطف زیست کی صورت مجھی سے ہے — ہر بات کی زمانہ میں زینت مجھی سے ہے
عالم میں کل علوم کی شہرت مجھی سے ہے — جاری تمام علم قراءت مجھی سے ہے
صحت حروف کی مرے دم سے بیاں میں ہے
ترتیل کا رواج مجھی سے جہاں میں ہے

مجھکو ہر ایک عاقل و دانا سے پوچھ لو ہر بات میں شریک ہوں دنیا سے پوچھ لو
نغموں کو میرے بلبل شیدا سے پوچھ لو مُردے جلا دیے ہیں مسیحا سے پوچھ لو
مرغوب کردگار بھی ہے التجا مری
مقبول بارگاہ صمد ہے دعا مری

قوت وہ کی عطا مجھے رب کریم نے مانا جسے ہر ایک عقیل و فہیم نے
ایسی بنائی بات غفور الرحیم نے پایا مجھی سے نام جناب کلیم نے
دیکھی مرے بیاں کی رسائی جو دور تک
حد ہو گئی کہ جل گیا خود کوہ طور تک

ہے یہ کلام اب قلم مشک بار کا ہر سو ظہور ہے مرے نقش و نگار کا
راقم ہوں حسن صانع فصل بہار کا چہرہ کشا ہوں قدرت پروردگار کا
باغ جہاں میں نقش مرے جزو کُل پہ ہیں
سو رنگ کے خطوط ہر اک برگ گل پہ ہیں

چاہا جو میں نے قطرے کو گوہر بنا دیا ذرہ کو مثل خسرو خاور بنا دیا
ضو دے کے ایک نقطہ کو اختر بنا دیا اکثر عروس نظم کا زیور بنا دیا
حرفوں کو حسن طرۂ لیلی پہ فوق ہے
جو دائرہ ہے وہ گلِ مضموں کا طوق ہے

طالب کو اپنے میں نے سخنور بنا دیا جاہل کو عالموں کے برابر بنا دیا
دے کر زر علوم تونگر بنا دیا ادنیٰ کو بادشاہ کا ہمسر بنا دیا
میں نے کب اہل علم کو رتبہ دیا نہیں
فضل خدا سے میری قلمرو میں کیا نہیں

جسکو ہے میری یاد وہ عالی خیال ہے جو میری ذات میں ہے صفت بیمثال ہے

وہ شمع ہوں کہ جسکی ضیا لازوال ہے   روشن مجھی سے مجلس اہل کمال ہے

کٹتا ہے سر تو اور بھی بڑھتی ہے ضو مری
سمجھے ہیں لوگ جسکو زباں ہے وہ لَو مری

شہرے تمام خلق میں ہیں جا بجا مرے   رتبے بہت بلند رہے ہیں صدا مرے
چلتا ہے کون کاغذ زر پر سوا مرے   کہتے ہیں جنکو حرف وہ ہیں نقش پا مرے

حاصل یہ بات مجھکو خدا کے کرم سے ہے
جو فیضیاب ہے وہ مرے دم قدم سے ہے

حاصل ہے مجھکو قرب بھی رب غفور کا   میں نے کیا ہے حال رقم کوہ طور کا
سب کو نشاں بتاتا ہوں اہل قبور کا   زندہ مجھی سے نام ہے ہر ذی شعور کا

میں رہ چکا ہوں دست جناب امیر میں
تاثیر لفظ قم کی ہے میری صریر میں

میں فضل کردگار سے عالی صفات ہوں   باغ جہاں میں باعث لطف حیات ہوں
ہر علم کے لیے میں ہی وجہ ثبات ہوں   سب جانتے ہیں منتظم کائنات ہوں

چلتا ہوں پہلے لوح پہ پیک اجل سے میں
فرمانروائے خلق ہوں روز ازل سے میں

عالم پہ آشکار ہے جاہ و حشم مرا   ہر معرکہ میں رہتا ہے آگے قدم مرا
تابع ہر ایک ہوتا ہے وقت رقم مرا   چلتی ہے لے کے فوج مضامیں علم مرا

روشن مجھی سے ملک سخن میں چراغ ہے
سلطاں وہ ہوں کہ جس کا خزانہ دماغ ہے

ہوں سربلند مشک فشاں آبنوس بھی ہے   مجھ سے گل سخن میں ہے رنگ اور مہک بھی ہے
رتبہ میں مجھ سے پست کہیں عرش تک بھی ہے   روشن مجھی سے نام دبیر فلک بھی ہے

شاہد ہے آسماں مرا شہرا کہاں نہیں
ہے قیس کی کشش کہکشاں نہیں

غزل ظرافت

نتیجہ فکر جناب سید ظریف حسین صاحب ظریف متوطن قصبہ تسنہ ضلع مظفرنگر وارد حال دہلی

تمہاری چاہ مبارک رہے عدو کے لیے
اگر یہ چاہنے والے ہیں آخ تھو کے لیے

پڑھی نماز تیمم سے ہم نے دلّی میں
ٹکے کو آتی ہے بدھنی یہاں وضو کے لیے

بتائیں کیا تمہیں صرف کثیر شوق جمال
ہزار جوتیاں ٹوٹیں اک آرزو کے لیے

ازل سے تم نے نہ کی اپنے فائدہ پہ نظر
کہ جتنے چاہنے والے لیے وہ بھو کے لیے

ملو جو غیر سے تو اُس سے پوچھنا یہ بات
چکن کے چوک سے کسکے لیے شلو کے لیے

تمہارے لال کا دامن نکل گیا مریم
منگا کے سوزن عیسےٰ رکھو رفو کے لیے

ظریف ہے یہ تمنا ظریف کو دیکھیں
تڑپتا رہتا ہے دل اپنا لکھنؤ کے لیے

گھریلو شاعری

محبت اپنی بیوی سے یہ دروازہ ہے ایماں کا
بھٹکنا چار سو اچھا نہیں ہوتا ہے انساں کا

جھٹکے مارتی ہے اُسپہ بچے پیار کرتے ہیں
تعلق کسقدر گہرا ہے بلّی اور انساں کا

بہت ہی سخت ہے پردہ کے بارے میں مری ماما
ڈپٹتی ہے اگر دیوار سے بچے نے بھی جھانکا

جہاں بخیہ کیا ہے سالے دامن میں محبت سے
لگا دو اچھی بھابھی تم گریباں میں بھی اک ٹانکا

بھلا مجھلی بہو کیونکر نہ سب کے دل میں گھر کریں
اطاعت انکی دیکھو اور غصہ نانی اماں کا

جذبۂ عشق

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدست دگرداں وحیراں بودن

عشق اگرچہ حکماے متقدمین ان تین حرفوں کی بس اتنی فلاسفی کرکے خاموش ہوگئے ہیں کہ دل و دماغ کے ضعیف ہونے سے اک مرض پیدا ہوجاتا ہے جو اکثر انسان کو عمر بھر پریشاں رکھتا ہے۔ انھیں ہی ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اسکو ایک لطیف ترین جوہر شرافت کا اثر کہتا ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ عشق کی کنہ ذات کی طرف بہت ہی کم توجہ کی گئی ہے۔ فی الاصل یہ اگر کوئی مرض ہے تو اسکے لیے کوئی نہ کوئی دوا ہونا لازمی تھا کیونکہ تجربہ بتاتا ہے کہ دنیا میں ایسا مرض کوئی بھی نہیں ہے جسکی دوا نہ ہو۔ بخلاف عشق کے کہ اکثر اسکے مریضوں کو مجنوں اور سلاالعقل تصور کرکے لا علاج چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جو ان کے لیے اُلٹا اثر پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔ تذکرۂ بالا جملے کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ جب کلیہ یہ ٹھہرا کہ ہر مرض کی کوئی دوا ہے تو عاشق کے لیے بھی اُسکی معشوق کا وصال بہترین نسخہ ہے۔ مگر ہم لکھ آئے ہیں کہ دنیا میں دوا کا پیدا ہونا لازمی ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ مثال کے لیے لیجیے کہ ایک شخص عاشق الٰہی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی حکیم کوئی طبیب اُس دوا کو اُسکے لیے مہیا کر سکے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ اس مثال میں ہمیں ایک نئی بات پیدا کرنی پڑے گی۔ کہ عاشق الٰہی کی دوا۔ دنیا میں ملنا نا ممکن ہے۔ کسی طبیب سے اُسکا مداوا محال ہے کسی کیمیا سے اُسکا علاج۔ یعنی وصال الٰہی مشکل ہے۔ البتہ یہ درد عشق ہی اُسکی دوا ہو جائیگا اگر ممکن ہے تو یہی ممکن ہے کہ جوں جوں عشق الٰہی ترقی کرتا جائے گا۔ اور صفات

اور ذات واجب الوجود میں عاشق صادق کو انہماک اور استغراق ہوتا جائے گا۔ اُسی طرح وہ اپنے معشوق حقیقی سے قریب ہوتا رہے گا۔ گویا اس جگہ ہمیں مرزا غالب کا شعر ماننا پڑے گا ؎

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا		درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

تو اس سے ثابت ہوا کہ کبھی کبھی درد بھی درد کی دوا ہو جاتا ہے۔ اور یہ غیر ممکن ہے۔ اور اس سے دور لازم آتا ہے۔ اسکو ختم کرنیکے بعد ہم دوسرے مقولہ پر نظر ڈالتے ہیں کہ عشق شرافت انسانی کا ایک بہترین جذبہ ہے " اگر اسکو تسلیم کر لیا جائے تو اس بات پر بھی نظر ڈالنی ضروری ہوگی کہ عوام الناس انکے اس مقولہ کو کیوں تسلیم نہیں کرتے اور وہ ایسے اشخاص کو جنکے جذبات بہترین شرافت انسانی تسلیم کیے گئے ہیں بیکار اور لاشئے سے کیوں تعبیر کرتے ہیں اور کیوں عاشقوں کی کوئی وقعت نہیں کیوں اسکی باتیں دیوانہ پن کی بے تکی بڑ ہیں۔ اُنکے کام لا اُبالی۔ اُنکے حرکات مجنونانہ تصور کیے ہیں۔ آخر یہ کس الزام پر۔ کیا خارج میں کوئی دوسری مثال بھی ایسی مل سکتی ہے کہ انسان اپنی کسی انتہائی شرافت کے جذبہ کے استعمال سے مجنوں اور سودائی کہلانے کا مستحق ہو۔ ممکن ہے کہ اسپر یہ خیال کیا جائے کہ عشق اختیاری شئے نہیں ہے اور انسان کی عزت اور وقعت اُسی ہنر اور اُسی شرافت کے اعلے جوہر کی وجہ سے کی جا سکتی ہے جو اختیاری ہو۔ اور جو مادہ اختیاری نہیں ہے وہ کچھ اہمیت نہیں پا سکتا اور اہل جہاں اُسکو وقعت نہیں دے سکتے۔ اگر ایسا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسی ایک خاص صفت کے ماسوا اور صفات انسانی کے جو فطرتاً اور خلقتاً نیچر کی طرف سے اُسے عطا ہوئی ہیں کیوں انسانیت کا بہترین جزو تسلیم کی جاتی ہیں۔ مثالاً شاعری کو لیجیے ظاہر ہے کہ شاعری ایک ایسا مادہ اور ایک ایسا علم ہے جو سکھانے سے نہیں آتا بلکہ قدرت کے فیاضانہ جود و عطا کے

سبب اس کو تفویض ہوتا ہے ۔ یا یہ الفاظ دیگر یوں کہیے کہ ایسا مادہ ہے جو خود بخود اُمڈا آتا ہے مگر یہی شاعری اگر کسی میں حدِ کمال کو پہنچی ہوئی ہے اگر کسی شاعر کو یہ قدرت حاصل ہے۔ کہ وہ اپنے ایک مصرعہ یا اپنے ایک شعر یا ایک نظم سے سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرسکتا ہے اگر اُس میں یہ طاقت ہے کہ وہ انسان کے غصے اور ترحمانہ صفات کو جوش میں لاسکتا ہے تو وہ صرف قابل عزت ہی نہیں بلکہ اپنی قوم اپنے ملک وغیرہ کی نظروں میں عزیز تر مانا جاتا ہے ما اینکہ کلیہ بالا کے لحاظ سے عوام یا خواص کی طرف سے اسکے واسطے یہ محبت کا استعمال صحیح نہیں ہے ۔ ایسے ہی اور بہت سی مثالیں موجود ہیں مگر آہ عاشق ان سب باتوں سے محروم ہے تو ہمیں ضرور فرض کرنا اور ماننا پڑیگا کہ عشق ان دونوں شے میں سے کچھ نہیں ہے وہ کوئی اور ہی چیز ہے جو ہمارے حواس خمسہ کے حدود سے باہر۔ اور بالا ہے۔ ان دونوں باتوں سے عشق کا بری ہونا۔ ہمیں یہ جرأت دلاتا اور ہمیں یہ صلاح دیتا ہے کہ ہم عشق کی ہستی ہی سے انکار کردیں ۔ مگر ساتھ ہی جب یہ ارادہ کرتے ہیں تو دلی احساس یہ بھی نہیں کرنے دیتا۔ کیا معنی کہ سریلی آواز خوشنما چیز خوبصورت انسان کو دیکھکر کوئی شے کانٹے کی طرح ہمارے دل میں کھٹک جاتی ہے جس سے مجبور ہو کر کچھ دیر کے لیے دل و جگر پر ہاتھ رکھنے پڑتے ہیں۔ مگر ہماری سماعت اور بصارت اور ہماری تمام قوتیں اسکو دیکھ۔ سن ۔ اور پا نہیں سکتیں۔ کہ وہ شے کیا ہے اور کیسی ہے ۔ ہاں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔

خامشی بے سبب نہیں غالب   کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

اور یہ حالت ایک انسان ہی کی ذات تک محدود نہیں ہے۔ ذوی العقول کے سوائے غیر ذوی العقول۔ اور غیر ذوی العقول کے سوائے غیر ذی روح تک اسکے اثر اور اس جذبہ سے بری نہیں ہیں۔ بچہ لاعقل محتاج ۔ بے اختیار ۔ پیدا ہوتا ہے اُسوقت ظاہراً سوائے تکلیف شاقہ کے کوئی بہتری کی اُمید اُسکی ذات سے نہیں کی جاسکتی مگر

کوئی شے ضرور ایسی ہے کہ ماں باپ کو مجبور کرکے اُسکی بزرگ داشت پر معین کردیتی ہے
بچے کی تکلیف ان کی تکلیف اور بچے کی راحت انکی راحت ہوجاتی ہے اسمین اتنی
گنجایش باقی ہے کہ کہدیا جائے یہ ساری باتیں اُس سے آیندہ کی بہتری۔ اور مستقبل
کے فرح کی امید کراتی ہے مگر جب غیر ذوی العقول جانوروں کی طرف نظر ڈالتے
ہیں تو اسوقت یہ کُنیہ بھی باطل اور بے معنی ثابت ہوتا ہے کیونکہ ظاہراً اُنھیں کوئی
ایسی اُمید نھیں ہے جس میں ان کی آیندہ کی بہتری متصور ہو۔ کیونکہ ساری اُمیدیں
صرف عقل پر منحصر ہیں۔ وہاں عقل کا لطیف جوہر ہی موجود نہیں۔ تو پھر امید کیسی
اس رتبہ اور اس درجہ سے بھی بالاتر وہ درجہ ہے جو انھیں لاالعقل جانوروں میں
ہمیں نظر آتا ہے ممکن ہے کہ بچے کا عشق اُسکی نگہداشت صرف اسوجہ سے کیجاتی ہو
کہ وہ ایک مدت معینہ کی تکلیف کا ثمرہ اور اپنا جزو بدن ہے۔ مگر جب ہم چکور کو چاند
پر دوڑتے۔ بلبل کو گل کی طرف بار بار چکر لگاتے۔ بھونرے کو کلیوں کے ارد گرد
منڈلاتے دیکھتے ہیں تو یہ خیال بھی کافور ہوجاتا ہے اور فوراً سمجھ میں آتا ہے
کہ یہ بزرگداشت یہ حفاظت وغیرہ نہ اپنے جزو بدن کے لحاظ سے ہے نہ محنت کے
سبب ہے۔ بلکہ کوئی اور نشتر ہے جو بار بار دل میں چبھتا ہے۔ اس سے زیادہ
تعجب انگیز وہ جذبہ ہے جو غیر ذی روح میں پایا جاتا ہے سورج مکھی کا سورج کے رُخ پر پھرنا
کنول کے پھول۔ یا گل نیلوفر کا چاند کی صورت دیکھتے ہی خوشی سے کھل کھلانا
چاند کو دیکھتے ہی کتاں کا پارہ پارہ ہوجانا۔ کاہ و کہربا کا عالم۔ مقناطیس کی
کشش وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں ہیں جنھیں دیکھکر کامل یقین ہوتا ہے کہ کچھ دال
میں کالا ہے اور۔ کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔ ہم ایک درخت
کے ہرے بھرے پودے کو ایک خشک جگہ سے کھود کر نہایت احتیا کے ساتھ کسی
کھاد کی جگہ لگا دیتے ہیں۔ اور جسقدر خدمت ہم سے ہوسکتی ہے کرتے ہیں۔

مگر کچھ مدت گذرنے بغیر وہ پودا سرسبز و شاداب نہیں ہوتا بلکہ بعض اشجار سوکھ جاتے ہیں حالانکہ جس جگہ یہ اب ہے وہ جگہ اسکے لیے پہلی جگہ سے ہر طرح موزوں اور مناسب ہے۔ مگر لاکھ تدبیر کریں نہ چند روز بغیر نشو و نما کے اُداس کھڑا رہے گا۔ ثابت ہوا کہ اسے اُس پہلی جگہ سے کوئی نہ کوئی خاص لگاؤ تھا جس سے جدا ہونا اسے بیحد شاق گذرا۔ اس فن باغبانی کے جاننے والے لوگ من گھڑت باتوں سے بہت سا حاشیہ چڑھا سکتے ہیں مگر ہم اسلیے اوپر ہی لکھ آئے ہیں کہ نہایت احتیاط سے اکھیڑا جائے کہ اُسکے تنہ اُسکی بیخ و بن کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اُسے اپنی پرورش کے لیے پہلے سے بہتر ساماں میسر ہو۔ بہر حال معلوم ہوگیا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ مگر وہی شے دل سے زبان تک نہیں آسکتی قوت مدرکہ اُسکو پاتی ہے مگر کوئی قوت اسکے بیان اور دوسروں کو وہ کیفیت دکھانے کے قابل نہیں ہے۔

ایک زبردست حکیم کا قول تھا کہ یہ درجہ انسان کو اُسوقت نصیب ہو سکتا ہے جب حواس خمسہ کی محدود آگاہی سے بالا ہو۔ مگر یہ درجہ نصیب ہونا مشکل ہے جنھیں کسی طرح حاصل بھی ہوگیا وہ اسکے بیان کرنے سے قاصر ہیں ؎ آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد۔ اسی عشق کا ایک نام محبت بھی ہے جسے مذہب و ملت نے بھی ضروری مانا ہے اور فی الاصل اگر اُسکو ضروری نہ تسلیم کیا جائے تو دنیا سے ہمدردی اُٹھ جائے اور فوراً نظام عالم درہم و برہم نظر آئے۔ پہاڑوں کا زمینوں پر دباؤ۔ سبزہ اور اشجار کا زمین پر لہلہانا یہ سب باتیں ایسی ہیں جنسے عشق کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر یہی عشق جب تک بیغرضانہ ہے عشق اُسکا نام ہے جسوقت کہ اس درجہ سے نکلکر کسی غرض میں شامل ہوگیا وہ عشق نہیں رہی یہ بات کہ عشق کیونکر پیدا ہوتا ہے اسکے اسباب ظاہر میں کسی اچھی شے کے دیکھنے۔ یا سُننے سے عشق کا دلمیں پیدا ہو جاتا ہے۔ جس شے کا اثر دل پر پڑے وہ معشوق کے نام سے تعبیر کی جائے گی۔

(باقی آیندہ)

عبدالباری آسی

غزلیات

مولانا صفی صاحب لکھنوی مدظلہ العالی

وہ آئیں گے یہ قیامت تک اعتبار نہ تھا　　سکون دل کا بہانا تھا انتظار نہ تھا
فقط مقدمۂ اضطراب دل تھا سکون　　جسے قرار سمجھتے تھے وہ قرار نہ تھا
بہار آنے سے پہلے بھی دل یہی تھا مگر　　جنوں کے ناخن سرتیز سے فگار نہ تھا
چھلک رہا تھا وہ کیفیت شباب کا رنگ　　نشیلی انکھڑیوں میں یار کے خمار نہ تھا
اک آبلہ سا جو دل ہو رہا ہو سینہ میں　　وہ اسطرح سے فلک لائق فشار نہ تھا
گناہگاروں کو پوچھا جب اسکی رحمت نے　　بہت خفیف ہوا جو گناہگار نہ تھا
ہوائے کوچۂ جاناں ذرا ادھر آئی　　ادھر ہمارے دل تنگ میں غبار نہ تھا
وہ دل جو تھا بھی تو کیا تھا ہمارے پہلو میں　　جب اس پہ زور نہ تھا کوئی اختیار نہ تھا
ہزار شکر کہ شبنم نے آبرو رکھ لی　　کوئی بھی گور غریباں پہ اشکبار نہ تھا

پڑھا نہ فاتحہ احباب نے کبھی آکر
مگر مزار ہمارا صفی مزار نہ تھا

کل ہم آئینہ میں رخ کی جھریاں دیکھا کیے　　کاروانِ عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کیے
زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے　　آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے
بستیاں ویراں ہوئیں آباد ویرانے ہوئے　　شعبدے تیرے یہی اے آسماں دیکھا کیے
ہوں نہ یارب دیکھنا دشمن کو بھی وہ دن نصیب　　جو فراق یار میں ہم نیم جاں دیکھا کیے
دل تہ و بالا جو تھا سودائیاں زلف کا　　گہہ زمیں دیکھا کیے گہہ آسماں دیکھا کیے
جب اسیر دام ہو کر ہم چلے سوئے قفس　　دور تک مڑ مڑ کے اپنا آشیاں دیکھا کیے

چشم ہمدردی صفی جن سے تھی وہ بیٹھے ہوے
اشک کی جا خون انکھوں سے رواں دیکھا کیے

فخر المتقدمین و متاخرین ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب۔ سائل دہلوی داماد حضرت فصیح الملک داغ

اصول کائنات عاشقی ہے داستاں میری — پھر انداز بیاں میں خوبی طرز زباں میری
کبھی ہونٹوں پہ پپڑی ہے کبھی آنکھوں میں آنسو ہیں — چھپاؤں کیا پریشانی ہے صورت سے عیاں میری
مرے دست جنوں کی چارہ گر بھی داد دیتا ہے — کہ پوری پوری سب زخموں پہ ہیں دھجیاں میری
بہار جامۂ گلگوں نہیں دیکھی تو اب دیکھو — کھلا دیتی ہے کیا گل لالہ چشم خونفشاں میری
مرا احوال یوں کہہ دے تو کہہ دے نامہ براں سے — دہن میں کاٹ کر اپنے لگا لے گر زباں میری
ادھر گلچیں کی نیت ہے ادھر صیاد کی نظریں — جھکی جاتی ہے بار گل سے شاخ آشیاں میری
ملاقاتوں کی شکلیں ہیں یہ اپنی اپنی مرضی ہے — جہاں تیری وہاں تیری جہاں میری وہاں میری
مرے دل میں ہی رہنے دو شکایت ہائے دشمن کو — نہ رسوائے جہاں تم ہو نہ کھلواؤ زباں میری

وہ کہتے ہیں کہ بدلو نام سائل ورنہ تم جانو
نبھے گی تم سے مشکل سے سراج الدین خاں میری

جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی مدظلہ العالی

ہمت شکن جہاں میں جفا ہے جمال کی — ہوتے ہی عشق پڑ گئی عادت سوال کی
میں اور صبح ہے یہ تمنا محال کی — جتنی مری حیات ہے شب اتنے ہی سال کی
اک کیف بیخودی میں کٹی شب وصال کی — اچھا ہوا خبر نہ ہوی اپنے حال کی
ممنوں لطف خانہ بدوشی ازل سے ہوں — جس جا پہنچ گیا وہی منزل خیال کی
شاکی ہیں خاک ڈالنے والوں کے اہل قبر — مٹی میں دب گئی ہے خبر انکے حال کی
ہے کون سا یہ صید کہ دم توڑتا ہے یوں — صیاد ٹوٹتی ہیں رگیں تیرے جال کی
ہر قطرہ خون دل کا ہے قاتل سے نو درد ار — یارب دراز عمر ہو مدعی سوال کی

روک اپنی آہ گرم کو بس عندلیب بس
اُڑنے لگی ہے باغ سے سبزی نہال کی

تارِ کفن بھی گل گئے کیا جاؤں حشر میں
اے دل تو ہی اوڑھا دے ردا انفعال کی

جز رنج و غم کچھ اور نہ دیکھا تمام عُمر
راحت بھی تھی مگر وہی خواب و خیال کی

برباد میرے بعد نہ ہو کائناتِ دل
کوئی جگہ نکال دو میرے ملال کی

بند آنکھ کر کے بیٹھ کہ پہلو میں دل رہے
عالم نظر فریب ہے دنیا ہے چال کی

رہنے کو آشیانہ بنایا تو کیا ملا
تنکوں نے مل کے کھینچ دی تصویر جال کی

ٹھوکر سے خاک میں بھی ملا دو تو خوب ہے
مٹی نہ ہو خراب دلِ پائمال کی

غش کا پیام ضعف میں لائی نسیم صبح
ٹھنڈی ہوا نے اور طبیعت نڈھال کی

برسوں سے صاف کرتا ہوں اشکوں سے لوحِ دل
تصویر چاہتا ہوں رُخِ بے مثال کی

خود رفتگیِ عشق میں کیا کام دل سے لوں
گم ہیں حواس بند ہیں راہیں خیال کی

طے کر رہا ہوں کب سے تجھے اے شبِ فراق
اب کتنی دور رہ گئیں راتیں وصال کی

سجدے میں جا کے سر کو اُٹھانا پڑا مجھے
رحمت نے بات رکھ لی مرے انفعال کی

ہر رگ لہو اُگلتی ہے مُنھ اپنا کھول کر
اک زخم ہو تو فکر کروں اندمال کی

اُترے ہوئے ہیں قافلۂ ہستی و عدم ..
ثاقب عجب وسیع ہے منزل خیال کی

محفل سنوار لی مرے دل نے خیال کی
تصویر کھینچ کر ترے حُسن و جمال کی

حیران ہوں کدھر سے بلا آئی جال کی
دھوکا دیا زمیں نے کہ گردش نے چال کی

کب سے ہے غم خبر نہیں کچھ ماہ و سال کی
گنتا ہوں ایک عمر سے گھڑیاں ملال کی

سب کو ہے تیرے ساتھ خبر میرے حال کی
یا داستان عشق کی ہے یا جمال کی

اپنا سا زور کر کے تھکے منعمانِ دہر
مٹھی نہ کھل سکی مرے دستِ سوال کی

اچھے نصیب تھے کہ گلستانِ دہر میں
دو دن کی زندگی بھی غموں نے وبال کی

داغ چمن کے ساتھ ہزاروں ہی زخم ہیں
دل میرا چھان ڈالا ہے چادر نے جال کی

یادِ مریض ایک مرض ہے خدا بچائے
بھولے سے پوچھیے نہ خبر میرے حال کی

اتنا بدل دیا تھا مرا رنگ ہجر نے
منھ دیکھتی رہیں مرا راتیں وصال کی

سُنیے کہ جاگ جاگ کے برسوں کیا ہے یاد
یہ داستان غم نہیں خواب و خیال کی

ہاں پائے حرص روک کے قارونکے سر کو دیکھ
کشتی زمیں میں ڈوبتی جاتی ہے مال کی

جس دل میں زخم تھے وہ لہو ہوکے بہ گیا
اچھا ہوا خلش تو مٹی اندمال کی

تم کو جواب دینے لگا کیوں خرام ناز
سبزہ تھا یہ۔ کہ قبر کوئی پائمال کی

آؤ تو ہم دکھائیں تمھیں اک نیا جہاں
آباد ہے خیال میں دنیا مثال کی

الزام قید سب ہوس زندگی پہ ہے
صیاد کی نہ کوئی خطا ہے نہ جال کی

یکجا ہوئے ہیں دور سے آ آ کے اہل قبر
دل ہو تو دیکھ آئیے محفل خیال کی

کس سنگدل کا در ہے کہ ملتا نہیں جواب
ٹکرا کے پھر رہی ہیں صدائیں سوال کی

بھر جائینگے کبھی نہ کبھی خاک قبر سے
زخموں کو احتیاج نہیں اندمال کی

بدلا مزاج دہر۔ مٹا دل تھکے طبیب
حالت وہی رہی مرض لازوال کی

اوراقِ شامِ غم شبِ تربت سے جا ملے
آخر کتاب ختم ہوئی میرے حال کی

کیوں آؤ۔ دور ہی سے سنو میری سرگذشت
تم کو خدا دکھائے نہ صورت ملال کی

کچھ آگے بڑھ چلے ہیں شفیعان روز حشر
تاثیر تو ضرور ہوئی انفعال کی

پہنچا دیا کلام کو ثاقب نے عرش پر
تقلید کرکے میرے صاحب کمال کی

جناب منشی سید وحید الدین احمد صاحب بیخود دہلوی مدظلہ العالی

پامال نقش کیوں نہو مجھ خستہ حال کی
تعلیم دے رہے ہیں قیامت کو چال کی

کھٹکے گی بعد مرگ بھی حسرت وصال کی
نکلی نہ تم سے پھانس کسی خستہ حال کی

رہ رہ کے یاد آئی ہے شوخی جو چال کی — مٹ مٹ گئی ہے قبر ترے پائمال کی
ہمکو نہیں ہے تجھ سے ضرورت سوال کی — خود منھ سے بولتی ہے تمنا وصال کی
آئینہ کیا بتائے گا مجھ سے ملاؤ آنکھ — میری نظر کسوٹی ہے حسن و جمال کی
ہم کیوں یہ سمجھیں ہم بھی ہیں عالم میں ہم کہاں — اپنا خیال ہی غلطی ہے خیال کی
پہرے لگے ہوئے ہیں تصور میں غیر کے — رہتی ہے روک ٹوک ہمارے خیال کی
پردے کی بات کے لیے پردہ ضرور تھا — پہلو میں دل ہے دل میں تمنا وصال کی
اے دل ہماری بات سنے اب تری مجال — ہے دھن لگی ہوئی تجھے اُنکے وصال کی
ارمان وہ نکالنے آئے ہیں نزع میں — کیا لوٹ مچ رہی ہے مسافر کے مال کی
دل میں وفا ہے درد ہے الفت ہے سوز ہے — فہرست لکھ رہا ہوں یہ میں اپنے مال کی
غصے میں بھی تو اس نے نہ چھوڑی ادائے حسن — ماتھے کی ہر شکن میں ہے صورت ہلال کی
ہم نے جتا دیا تھا کہ دشمن ہے بے وفا — تم سمجھے اس سے جو ڈ چلا اس نے چال کی
برسوں رہے ہیں حضرت موسیٰ کے ہوش گم — دیکھی تھی اک جھلک ترے حسن و جمال کی
بچنا تمام عمر تم اس فتنہ ساز سے — دیکھو عدو کی آنکھ ہے بھوکی جمال کی
دل میں کبھی چھپے کبھی آنکھوں میں چھپ گئے — ہوتی ہے اُن سے آنکھ مچولی خیال کی
تم چھپ کے سات پردوں میں مجھ سے نہ چھپ سکے — آنکھوں سے دور بیں ہیں نگاہیں خیال کی
جو ابتدا میں رنگ تھے وہ انتہا میں ہیں — تفریق عشق میں نہیں ماضی و حال کی
ہیں کشتۂ نگاہ تغافل شعار ہوں — پرسش نہ ہوگی حشر میں بھی میرے حال کی
سب بھید اُسکے کھول لیے جس سے جا ملی — اس شوخ کی نگاہ بھی ہے کس کمال کی
کچھ اس ادا سے وصل میں روٹھے ہیں آج وہ — برسوں رہے گی ہم کو تمنا ملال کی
دھوکے میں پہلے حضرت واعظ نے پی تو تھی — جب نشہ کھل گیا تو بہت قیل و قال کی
ہم تجھ سے اور تیرے سوا کیا طلب کریں — منظور کب ہے قدر گھٹانی سوال کی

یہ ابر یہ ہوا یہ جوانی یہ فصل گل / زاہد ابھی سے تجھکو پڑی ہے مآل کی

ظلم و ستم کے شکوہ پہ شوخی تو دیکھیے / صورت بنائے بیٹھے ہیں وہ انفعال کی

ویران کرکے دل کو اسے ڈھونڈتے ہیں ہم / صحرا میں جستجو ہے رمیدہ غزال کی

بچتا مریض ہجر کا کچھ کھیل تو نہ تھا / برسوں رہا علاج بہت دیکھ بھال کی

جو تجھ پہ مٹ گئے جنھیں تو نے مٹا دیا / وہ لوگ لوٹ لے گئے دولت وصال کی

کچھ ایکے گر کے برق نے تنکے جلا دیے / کچھ آگ آشیانے میں تھی پچھلے سال کی

بیخود کی خامشی کا سبب ان سے پوچھیے
اسکو تو کچھ خبر ہی نہیں اپنے حال کی

آغا غلام حسین ارشد قزلباش مدظلہ العالی

ہوں وہ مجنوں جسے فکر سر و ساماں ہی نہیں / غیرت چاک جگر چاک گریباں ہی نہیں

تھا کبھی حسن بتاں سے جو پرستاں جہاں / آج اس دل سا کوئی خانۂ ویراں ہی نہیں

زخم شمشیر زباں زخم سناں سے بھی ہے تیز / یہ وہ ہے درد کہ جو قابل درماں ہی نہیں

ہے عبث فکر دوائے دل زار تسلیم / عشق کا درد تو منت کشِ درماں ہی نہیں

کنج خلوت کے برابر نہیں جلوت کے مزے / ساز یہ وہ ہے جسے حاجت ساماں ہی نہیں

اثر نالۂ شبگیر ہو پیدا کیونکر / اب وہ پہلو میں ہمارے دلِ نالاں ہی نہیں

واہ رے ضبط کہ دل غنچہ صفت خوں ہے مگر / کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ پریشاں ہی نہیں

ہے وہ پہلی سی کہاں کیفیت جوش جنوں / اب وہ لیلا نہیں وہ قیس و بیاباں ہی نہیں

ذبح بے تیغ کیا انکی ادا کے میں نثار / اور اس ناز کے قرباں کہ پشیماں ہی نہیں

کیا کریں اس بتِ کافر سے نبھائیں کیونکر / جسکو کچھ پاس وفاداریِ پیماں ہی نہیں

کیا ہوا دل ہے اگر محو جمال خوباں / بندۂ حسن پریزاد و سلیماں ہی نہیں

ہاتھ پھیلا کے جنوں عشق میں یہ کہتا ہے / جو نہیں چاک وہ عاشق کا گریباں ہی نہیں

کیا وہ آکر مرے تابوت کو کاندھا دیگا — جس ستمگار کا دل خوگرِ احساں ہی نہیں
وائے ناکامیِ قسمت کہ وہ آئے لیکن — ضعف سے قوت پابوسیِ جاناں ہی نہیں
زخمِ دل ڈھونڈھے۔ ہاں کوئی سامانِ طپش — دستِ قاتل میں مگر آج نمکداں ہی نہیں
اپنی ہُو حق ہی کیا کر تو خدا کے بندے — تجھکو صوفی خبرِ مستیِ رنداں ہی نہیں
مفت میں اسکو تڑپنے کا مزا ہی کیا ہے — جس کلیجے میں ترے تیر کا پیکاں ہی نہیں
ہے وہ پتھر نہیں جس دلکو بتوں کی الفت — بندۂ عشق نہیں ہے جو۔ وہ انساں ہی نہیں
چمنِ دہر کے نظارہ کو نرگس کی طرح — پاس کچھ اپنے بجز دیدۂ حیراں ہی نہیں
محرمِ ذوقِ تبسم ہو تو کیا غنچۂ دل — وائے قسمت کہ میسر لبِ خنداں ہی نہیں
عندلیب اپنا کہیں اور ٹھکانا کرلے — نازتھا جسپہ تجھے اب وہ گلستاں ہی نہیں
ہوں وہ شبنم کہ فنا ہوتا ہوں میں آپسے آپ — تابشِ منتِ خورشیدِ درخشاں نہیں نہیں
ہے تری تیغ کے مانند جہاں تشنۂ خوں — اک مری جان کا دشمن ترا درباں ہی نہیں

رازِ الفت کا نہ دو دن بھی چھپایا ارشد
تجھ سا کمبخت جہاں میں کوئی ناداں ہی نہیں

عرضداشت

جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی مدظلہ العالی

جانشینی میرؔ و غالبؔ کی کہاں اور میں کہاں — وہ خدائے فن تھے اُنسے مجھکو نسبت کچھ نہیں
ہوگئے مشقِ سخن کرتے ہوئے پینتیس ۳۵ سال — اور ابتک حاصلِ رنج و مشقت کچھ نہیں
دوست اپنے حُسنِ ظن سے مجھکو جو چاہیں کہیں — واقعہ یہ ہے کہ مجھ میں قابلیت کچھ نہیں
آپ نے مجھکو بُرا سمجھا بہت اچھا کیا — آپ نے تعریف کی تو اسکی حاجت کچھ نہیں
نازشِ فن کیا ہے کہتے ہیں کسے دعوائے نظم — اعتراف بے سوادی ہے رعونت کچھ نہیں
آگیا ہوگا کہیں سے میرؔ و غالبؔ کا مذاق — اپنے دلمیں تو بجز ذوقِ جہالت کچھ نہیں
خاطرِ عزلت گزیں ہے دشمنِ نام و نمود — مرمٹی ہے جسپہ دنیا اُس سے رغبت کچھ نہیں
اپنے لطفِ طبع کے باعث ہے شغلِ شاعری — آپ خوش ہوں سنکے اسکی بھی ضرورت کچھ نہیں
چپ رہی محفل تو شانِ بے کمالی کیا گھٹی — واہ وا کا غل ہوا بھی تو فضیلت کچھ نہیں
جوہرِ قابل ہے جسکو مان لیں اہلِ مذاق — خود وحیدِ عصر بن بیٹھے تو عزت کچھ نہیں
مجھکو دنیا نے نہ پہچانا۔ غنیمت ہے یہی — شکر ہے اس ناشناسی کا شکایت کچھ نہیں
ذوقِ فطری چھیڑتا ہے جب تو کہہ لیتا ہوں کچھ — وہ بھی جز افشائے اسرارِ محبت کچھ نہیں
دل نے سمجھایا مجھے ثاقبؔ یہ مفہومِ خطاب — دوستوں کی بذلہ سنجی ہے حقیقت کچھ نہیں
خیر مقدم ہے "تمدّن" کا بھی لازم اسجگہ — یہ تو اپنا ہی جگر ہے اجنبیت کچھ نہیں
اے خوشا اقبالِ ما۔ خوش آمدی۔ خوش آمدی — یہ نہ کہنا لکھنؤ کو ہمسے الفت کچھ نہیں
ہائے تم کب آئے جب اپنا بھرا گھر لُٹ گیا — خاک اُڑتی ہے یہاں سامانِ راحت کچھ نہیں

خیر آؤ۔ ہم بھی ہیں موجود خدمت کے لیے
پیشکش ہے نقدِ دل حاضر میں حجت کچھ نہیں

ساتھ اصولاً کسی بات میں اختلاف نہیں کیا۔خواہ وہ امور عبادات سے تعلق رکھتے ہوں یا معاملات اور احکام جزاو سزا سے۔ بلکہ بہت غور و خوض اور تجربہ کے بعد مجھے تو یہ ثابت ہوا ہے کہ اس مذہب کی بنیاد دیگر مذاہب سے کہیں بڑھکر پائدار اور قوی اصولوں پر رکھی گئی ہے کیونکہ دین مسیحی جو اسلام سے صدیوں پہلے دنیا میں ظاہر ہوا۔ اور بہت زور شور کے ساتھ پھیل بھی چکا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد دنیا میں اپنے تمام پیرواؤں کی جمعیت عظیم کو اس حالت میں چھوڑ گیا کہ اُنھوں نے اُس مذہب کو بالکل ترک کر دیا اور اسکے نذریں اصول کے خلاف عملدرامد کرنے لگے تھے۔ گو وہ جہالت اور تاریکی کا زمانہ تھا لیکن جوں ہی اسلام کی شعاعیں عالم معمور میں پھیلیں طبیعتوں نے اُنھیں ذوق و شوق سے قبول کرنا شروع کر دیا جس شخص کو یہ معلوم ہے کہ مذہب اسلام کے ابتداءً ماننے والے وہ لوگ تھے جو فہم و فراست اور زباں آوری میں دنیا کی تمام معاصر قوموں پر فائق۔ شاعرانہ خیالات کے سب سے بڑے مرد میدان اور اعلےٰ درجہ کے ذہن و ذکاوت میں فرد تھے۔ وہ لا محالہ کہہ اُٹھے گا کہ اس پاکیزہ دین کے حقائق پر ایک غائر اور محققانہ و منصفانہ نظر ڈالنا ہر شخص کا فرض ہے۔

چونکہ مجھے مذاہب عالم کی تحقیقات کا خاص طور پر شوق تھا۔ اور میں اس بارہ میں لوگوں کی زبانوں سے سُنی سُنائی باتوں پر وثوق نہ کرکے اُن مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا۔ اور ان سے ذاتی رائے قائم کرنے کے واسطے مصالحہ بہم پہنچاتا تھا اس لیے میں نے فارس کے ایک مشہور زبردست عالم سید حسن بزرگ سے مدد لی۔ جنسے میں شہر خراسان میں ملا تھا۔ اور ہم دونوں میں نہایت گہری دوستی ہو گئی تھی۔ کیونکہ اُنھوں نے معقول بحث کے ذریعہ سے میرے خیالات اور حالات کا پتہ لگایا تھا۔ نہ کہ عیب جو جاسوس بن کر۔ بدنیوجہ

میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی شناسائی میری خوش قسمتی کا باعث ہوئی۔ میں ان کی خدمت میں پورے ڈیڑھ سال تک رہا۔ اس اثنا میں ہمارے مابین بہت سے اسلامی مسائل پر بحث ہوا کرتی تھی۔ اور اُن مباحثات کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس بات کو بخوبی سمجھ گیا کہ مذہب اسلام صرف ایک خدا کو پرستش کے قابل بتاتا ہے۔ اور توحید باری کے ایسے قوی دلائل پیش کرتا ہے جن کو مسیح علیہ السلام کے تبع لوگ بالکل جانتے بھی نہیں نیز یہ کہ اسلام حضرت موسیٰ اور حضرت عیسےٰ (علیہم السلام) کی نبوت کا اقرار اور ان کی تعظیم بدرجۂ غایت کرتا ہے۔ وہ اگلوں کے قصے پچھلوں کو صحیح صحیح اور بوضاحت سنا کر بدیوں پہ معقول عبرت انگیز سزائیں تجویز کرتا ہے اور اُن باتوں کا مرتکب فوراً اُن سے متنفر ہو کر نیکیوں کا شیدا بن جاتا ہے۔

یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اسلام پاکیزگی ظاہر و باطن مروت اور جوانمردی کا مذہب ہے۔ وہ اپنے پیرووں کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ جبتک دوسرا آدمی تمکو نہ ستائے۔ تم اُس پر ہرگز کوئی جفا نہ کرو۔ وہ شجر علم کی خوشہ چینی کا حکم دیتا ہے چاہے وہ درخت آباد دنیا کے انتہائی گوشہ پر ہی کیوں نہ ہو۔ اسکے علاوہ مذہب اسلام محتاجوں اور مسافروں کی خبرگیری۔ یتیموں پر مہربانی اور بددیانتی اور دروغگوئی سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔

ہاں میں اس بات کا انکار نہیں کرتا کہ خوبیوں کی مشترک روح جیسی مذہب اسلام میں ہے ویسی ہی اور مذاہب میں بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اسلام میں فلسفہ عمرانیہ کا باب بہ نسبت اور ادیان کے کہیں بڑھکر وسیع ہے۔

اور چونکہ انسان کو اپنے عمرانی[1] کے آغاز۔ اُبھار۔ اور اُٹھان کے زمانہ میں ہر ایک چیز کے مطالعہ اور جانچ کی طرف توجہ ہوتی ہے اور وہ دنیا کے اسرار پر اس نظر سے

---

[1] مذہب کی وہ اصولی خصوصیات مراد ہیں جو قوم کے بننے اور ترقی کرنے میں موثر ہیں۔ (ایڈیٹر)

واقف ہونا چاہتا ہے کہ حقیقی اور اصلی باتوں کی پیروی اور لغو باتوں کو ترک کرے۔
اس لیے جاپانیوں کی جدید زندگی کی رفتار بھی ایسی ہی واقع ہوی ہے۔ اور جیسا کہ
ہم کو پچھلے دنوں جاپانی رسالہ شیو کیمیا سے معلوم ہوا ہے "نگاساکی" مجلس مذاہب نے
دین اسلام کی چھان بین شروع کردی ہے۔ خاصکر جب سے ٹوکیو کالج کے تعلیم یافتہ
چینی مسلمان حسان شیوشن نے جاپانی زبان میں اپنی تازہ ترین تالیف (جسکا ذکر
وکیل میں آچکا ہے۔ ایڈیٹر) شائع کی ہے اسوقت سے تو مجلس مذکورہ کی تحقیقات
میں اور بھی زیادہ سرگرمی پیدا ہو گئی ہے۔ مؤلف نے اس کتاب کا نام "کادویاما"
(یعنی یکتا مذہب) رکھا ہے۔ اور اسمیں فضائل اسلام سے بحث کی ہے جاپانی قوم کو
اس دین پر غور کرنے کے لیے اُبھارنا اور اُسکے قبول کرنے پر آمادہ کرنا چاہا ہے کیونکہ
یہ پاک مذہب اسلام سعادت دنیوی و اُخروی کا ضامن اور انسان کو جوانمردی میں
شیر ببر اور اخلاق میں ملکوتی صفات بنا دینے والا ہے ؎

مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جاپانی لوگ جو ہر معاملہ میں چھان بین کرنے
کے بیحد شائق ہیں۔ عنقریب اپنی خوش فکری کی قوت سے اس مذہب کے اسرار میں
کوئی ایسا مسئلہ حل کرلیں گے جسکو سُنکر ہم لوگ بھی خوش ہوجائیں۔ کیونکہ ہم
(یوروپی عیسائیوں) کو اس مذہب کے ساتھ خواہ مخواہ بغض للّٰہی پیدا ہو گیا ہے بلکہ
ہم نہایت بدمزاجی اور جھلاہٹ کے ساتھ اسکے دشمن بنگئے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اکثر
مدبر اور دانشمند اس دین سے محض ناواقف ہیں۔ اور اسکو گالیاں دینے اور عیب
لگانے اور طرح طرح سے متہم کرنے میں صرف اُن لوگوں کے بیانوں کو سند بناتے
ہیں جنھوں نے ممالک مشرق میں جاکر کوچبانوں۔ گدھے والوں۔ اور کمینوں کے
سوا اور اعلےٰ طبقہ کے لوگوں سے ملاقات تک نہیں کی۔ بجالیکہ جن لوگوں سے وہ ملے
ہیں انکو اس مذہب کے سمجھنے سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اور یہ پاک دین ایسے

لوگوں سے بالکل بری ہے۔

مَیں نہایت وثوق سے کہتا ہوں کہ اگر میرے امریکن بھائی سیدھے اور شائستہ طریقہ سے اس مذہب کی تحقیقات کرینگے اور ایسے معاملہ فہم اور باخبر مسلمانوں سے اسکے مسائل حل کرینگے جو انہیں ہماری ہی زبان میں اس دین کی حقیقت کی طرف رہنمائی کرسکیں۔ تو وہ بہت کچھ فائدہ اُٹھائیں گے۔ اور اس سے ویسے ہی واقف ہوجائیں گے جیسا کہ مَیں واقف ہوگیا ہوں۔ اگرچہ ابتک مَیں اس مذہب کے بعض حقائق شلاً تعدد زوجات اور میراث کی نسبت۔ جو دونوں بہت کچھ قابل غور اور بحث طلب ہیں۔ پورا اطمینان کرنے اور باقی ماندہ شبہات رفع کرنے کے لیے کوشش کررہا ہوں مجھکو اس بات کا ذرا بھی شائبہ نہیں ہے کہ مسلمان لوگ اپنے دین حق کے ثابت کرنے اور اسکو غیر مذاہب والوں کے حملوں سے بچانے میں کمی کرتے ہیں۔ اور یہ بے حسی کی حالت جو آجکل اُنکے اوصاف میں داخل کی جاتی ہے اسے دین اسلام کے احکام سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ . . . .

. . . . جوان کے قابل قدر افراد کو اُبھرنے نہیں دیتے۔ ورنہ جمہوریت اور شوریٰ اور ملکی انتظام کو بہترین طریقہ سے نباہنا اسی مذہب کا حصّہ ہے۔ اگر یہ مسلمان لوگ اسلام کی خدمت پر کمربستہ ہوں اور اسکی تعلیمات کے اچھے عالم اُسکی نصرت کریں۔ کیونکہ جہانتک میں نے دیکھا اسکی تعلیمات بیحد شُستہ اور دلپسند ہیں تو انکی جماعت جاپان کی جانب روانہ ہوکر شہر نگا ساکی میں داخل ہو جسکی طرف مَیں خود بھی عنقریب سفر کرنے والا ہوں۔ تو میں بھی اُن سے مل کر وہان کام کرونگا اور اس دین کی جو روح میری سمجھ میں آئی ہے وہ جاپانیوں کو بھی سمجھاؤں گا اسوقت میں علماے اسلام سے تعدد زوجات اور میراث کے مسئلوں پر بحث کرکے اپنے شبہات اور شکوک مٹا رہا ہوں۔ اور جسوقت یہ دونوں مسئلے بھی اُسی

اندازے سے سمجھ لوں گا جس طرح اور مسئلوں کو سمجھ چکا ہوں اور ان کی صحت کا قائل ہو جاؤں گا تو بیشک میں خود بھی مشرف باسلام ہو کر اُن کا دست و بازو بنوں گا۔ اور پھر انشا اللہ مذہب اسلام کا تعارف جاپانیوں سے بخوبی تمام کردوں گا۔"

اس مضمون پر رسالۂ مذکور کے ایڈیٹر نے یہ نوٹ دیا ہے :۔

ہم مسٹر بنک روز کی دماغ سوزی کے قائل ہیں۔ مگر اس مضمون میں انھوں نے اپنے قلم کو حدِ اعتدال سے بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ اسلام جو ایسی وحشی اور جاہل قوموں کا مذہب ہے جنھیں باوجودے کہ ان دنوں ہم نے بہت کچھ انکی رہنمائی و اعانت کی ہے پھر بھی وہ زندگی کے معنوں سے سراسر بےخبر اور ہمارے ہی دست نگر ہیں ایسے مذہب کو قابل مضمون نگار نے اتنے اعلےٰ مرتبہ پر پہنچا دیا کہ کوئی مذہب دنیا میں اسکے ساتھ مل کر ٹکر ہی نہیں کھا سکتا۔ ہماری رائے میں جاپانی اس مذہب کی طرف ہرگز مائل نہ ہونگے۔ کیونکہ وہ بڑے روشن خیال ہیں۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ ایسے مذہب کو قبول کریں جسکے پیروؤں کے تنزل اور ضعف نے اسکی کمزوری اور اسکے اصول کی لچریت کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہو۔ مسٹر بنک روز اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی تردید کے واسطے جو سمجھتے ہیں کہ انکے معدودے چند دماغ دنیا کے تمام عیسائیوں کے دماغوں سے فائق ہیں اتنا ہی لکھنا کافی ہے تاکہ وہ آئندہ ایسی باتوں کے سُنانے سے ہمارا دماغ پراگندہ کرنے کی جرأت نہ کریں۔ کیونکہ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ناظرین اس مضمون کو نظر توجہ سے دیکھنا درکنار اسے پڑھکر ہی مضمون نگار کی حماقت پر قہقہہ لگائیں گے۔"

"دی ورلڈ" کے ایڈیٹر نے اس نوٹ میں اپنی کمظرفی کا پورا ثبوت دیدیا ہے

"از کوزہ ہماں بروں تراود کہ دروست" اس نے اسلام یا مسلمانوں پر جو داغ لگانا چاہا ہے دین اسلام اُس سے بالکل بری ہے۔ اُسے خبر نہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی وخستہ حالی محض ان کی غفلت اور احکام اسلام کو پس پشت ڈالدینے کے وجہ سے ہے۔ مذہب کا اسمیں کچھ قصور نہیں۔ اور اڈیٹر کے خیالات کی تردید کے لیے صرف یہی ایک بات کافی ہے کہ اگر اسلام ایک فطری مذہب اور عبادات و معاملات وغیرہ کے بارہ میں توفیق وسعادت کی مستحکم ترین بنیاذں پر مبنی نہ ہوتا تو یہی چند سال جنہیں ....

.........اسلام اور اہل اسلام دونوں کو فنا کردینے کے لیے بس تھے۔ یہ اس مذہب کی صداقت ہی کا زور ہے کہ باوجود مسلمانوں کی اسکے احکام و اصول سے خلاف ورزی کے اسکی اشاعت میں بجاے کمی کے روز افزوں ترقی ہے۔ اور منصف مزاج وروشن خیال یوروپین فاضل خود بخود اس کی جانب مائل ہوتے جاتے ہیں۔ جنہیں سے ایک مسٹر بنک روز بھی ہیں۔ مسٹر بنک روز کے خیالات کی داد دینا ہمارے امکان سے خارج ہے۔ ہم انکے لیے حق سبحانہٗ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انکو راہ راست دکھا کر اپنے سچے دین کا پیرو بنائے۔ اور اسلام کو جسکی خدمت موجودہ مسلمانوں سے نہیں بن پڑتی ایسے ہی نئے مردان غیب کے ہاتھوں قوت وعظمت عطا کرے۔ آمین۔

مسٹر بنک روز نے مسلمانوں کے بغرض اشاعت اسلام جاپان جانے کی جو رائے دی ہے یہ ایک ایسا امر ہے جسکے واسطے ہم نے مدت تک قومی دولتمندوں کو اُبھارا اور اُنھیں اپنی خداداد دولت میں سے کچھ حصہ اسلام کی حمایت کے لیے دینے پر آمادہ بنایا مگر ہنوز روز اول ہے۔ کاش خدا ئے کریم ہمارے دولتمند بھائیوں کو آنکھیں دیتا کہ وہ دنیا کی حالت اور اسلام کی

ضرورتوں کو دیکھتے۔ اور اپنا سرمایہ ایسے کاموں میں لگاتے جن کا بے حساب اجر اسی کریم کے دربار سے ملے گا جسکے خزائن رحمت بیحد و بے پایاں ہیں۔ الغرض میں سر پر پاؤں دھر کے روانہ ہوگیا۔ جاڑے کا موسم شروع تھا۔ موٹی روئی کا لحاف اور کپڑے جلدی جلدی سلوائے۔ پسے ہوئے مصالحے اور مرچیں اور بیسیوں خاک بلا دوائیاں ساتھ لیں۔ میرے جانے کا اعلان وکیل مطبوعہ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳ پر ان الفاظ میں ہوا:۔

سفر جاپان ہمارے دوست قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی جن سے پبلک ایک حد تک واقف ہے۔ اپنی فرلو کا ایک حصہ جاپان میں صرف کرنے کی غرض سے ۱۱ نومبر ۱۹۰۵ء کو جہاز لائٹننگ پر سوار ہو کر کلکتہ سے روانہ ہو گئے۔ اُن کا پتہ فی الحال معرفت ڈاکخانہ ناگاساکی ملک جاپان ہوگا۔ ؎

بسفر رفتنت مبارک باد
بسلامت روی و باز آئی

ہمیں امید ہے کہ قاری صاحب اپنے سیر و سفر میں جاپان کی مذہبی حالت کا مطالعہ کریں گے اور اپنی قابل قدر تحقیقات کے نتائج سے وقتاً فوقتاً وکیل کے کالموں کو مزین فرماتے رہیں گے۔

"خدا خود میر سامان است ارباب توکل را" کے ثبوت میں اپنا یہ ذاتی تجربہ بیان کرتا ہوں کہ کلکتہ پہنچنے کے وقت تک میں جاپان میں کسی شخص کو نہیں جانتا تھا محض خدا کے توکل پر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کلکتہ میں اتفاقاً ایک بمبئی کے سوداگر سے ملاقات ہوی۔ اُنھوں نے سنگاپور میں مسٹر ابراہیم بھائی (رنبرگان سر فاضل بھائی کریم بھائی) کے منیجر کے نام خط تعارف دیا۔ وہاں پہنچنے پر اُنھوں نے

اپنے ہانگ کانگ کے منیجر (سار بھائی) کے نام چٹھی دی سار بھائی بڑی عنایت سے پیش آئے اور اُنھوں نے اپنے شنگاہی کے منیجر کے نام چٹھی دی۔ پھر انھوں نے اپنے کوبے کے ایجنٹ کے نام چٹھی دی۔ مگر مجھے ناگاساکی جانا تھا جو جاپان کا پہلا بندرگاہ ہے اور کوبے اُسکے آگے دوسرا بندرگاہ ہے۔ بہرحال اسقدر ڈھارس بندھ گئی تھی کہ کوبے میں پاؤں ٹیکنے کو جگہ ہے۔

الغرض دوشنبہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۱۵ء کو میں ناگاساکی پہنچا۔ میرے اُس شہر میں وارد ہونے کی اطلاع وہاں کے مشہور انگریزی اخبار" ناگاساکی پریس" نے اپنے ۱۳ر دسمبر کی اشاعت میں حسب ذیل الفاظ میں شائع کی:-

ترجمہ

ناگاساکی پریس ۱۳ر دسمبر ۱۹۰۵ء

"محمد سرفراز حسین نامی ایک صاحب پیر کو جرمن میل اسٹیمر سے ہندوستان سے یہاں وارد ہوئے ہیں۔ وہ جاپان بدھ مذہب کا مطالعہ کرنے کے لیے آئے ہیں اور وہ خوش ہوں گے اگر کوئی صاحب ان سے تمام مذاہب کے متعلق عموماً اور اسلام کے متعلق خصوصاً تبادلۂ خیالات کریں۔ نیو یارک کے کسی اخبار میں ایک نامہ نگار نے شائع کیا تھا کہ مذاہب کی معلومات کا ایک ایسوسی ایشن ناگاساکی میں منعقد ہونے والی ہے اور اس خبر کو ہندوستان کے اخبار نے نقل کیا تھا۔ محمد سرفراز حسین یہاں چند دنوں ایسوسی ایشن کے ممبروں سے خط وکتابت کرنے کے لیے قیام کرینگے۔ وہ ہندوستانی گورنمنٹ کے ایک افسر ہیں اور اپنی فرلو کے زمانہ میں جاپان آئے ہیں۔ انکا موجودہ پتہ جاپان ہوٹل ہے۔"

اصلی حسن افزا صابون

معزز اصحاب و حکمائے یونان کے ہزاروں سارٹیفکٹ موجود ہیں
خبردار ہوشیار رہنا ایسا نہ ہو کہ دھوکہ کھا جاؤ کیونکہ بہت سے
جعلی اشتہار حسن افزا صابن کے نام سے شائع ہو رہے ہیں۔

جو گورے و خوبصورت ہونے کی بے نظیر ایجاد ہے۔ تازہ تازہ پھولوں اور طبی ادویات سے تیار کیا جاتا ہے جو حسن کو دوبالا کرتا منہ اور ہاتھوں کو آئینہ وار شفاف بنا دیتا ہے اور جلد کی تمام جھائیاں بھاے۔ داغ۔ دھبے۔ پھوڑے۔ پھنسیاں زائل کر دیتا ہے اور جلد کو مخمل کے مانند ملائم اور گلاب کی پتی کی طرح خوبصورت بنا دیتا ہے صرف سات روز تک استعمال کرنے سے کالا رنگ کملایا ہوا چہرہ صاف ہو کر بدن گورا و خوبصورت نکل آتا ہے بدن پر شنجرف کی سی سرخی نظر آنے لگتی ہے۔ معزز رئیسوں اور خاص بیگمات نے پسند فرمایا ہے قیمت بھی معمولی ہے یعنی فی بکس تین ٹکیہ مع ایک نفیس صابن دانی کے صرف ایک روپیہ (?) دو آنہ (?)

روغن دل بہار گیسو دراز یہ نفیس تیل جو اپنی خوشبو میں لاجواب ہے۔ اس کو خواتین نے خاص طور پر پسند فرمایا ہے۔ اسکے استعمال سے دماغ کو تازگی اور دل کو فرحت ہوتی ہے خشکی کا علاج کر کے دفع کرتا ہے اسکے استعمال سے بال [illegible] ایک [illegible] ریشم کی طرح ملائم ہو جاتے ہیں۔ اسکی بھینی بھینی خوشبو سے [illegible] دماغ [illegible] ہر وقت سرور رہتا ہشاش بشاش [illegible] قیمت [illegible]
[illegible] دواخانہ کی [illegible] فہرست [illegible]

[illegible] دواخانہ

[illegible]

حصہ نہم — قسم دوم — مسلسل

جلد — نومبر ۱۹۱۵ء — نمبر

تمدن

معاشرتی تمدنی ادبی فلسفی اخلاقی تاریخی وطنی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر ایم اے قادری (علیگ) و مولوی [illegible] (علیگ)

فہرست مضامین

شعلہ

وہ جو کوہ طور پر بھڑکا تھا۔ وہ جو فاران کی چوٹیوں پر جلوہ گر ہوا تھا۔ آپ کاغذی لباس پہن کر ایک رسالہ کی شکل میں نمودار ہے۔ مردہ دلوں میں روح پھونکے گا۔ اخلاقی وعظ سنائیگا۔ نورانی شعلوں کی تابش سے نفسانی ظلمتوں کو نیست و نابود بنائے گا۔ وہ سینے جو آتشِ محبت سے سوختہ نہیں وہ قلوب جو سوز و دروں سے خالی ہیں اسطرف متوجہ ہوں عشقِ الٰہی کی لپٹیں گداز طبیعتوں سے لپٹنا چاہتی ہیں شاہدِ حسن بے نقاب ہوکر مشتاق آنکھوں کو فرحت پہنچانے کے لیے حاضر ہے۔ بس شعلہ کی خریداری کے لیے جو ہر مہینہ آپ کی دلبستگی کا بہترین مجموعہ ہے۔ درخواستیں روانہ کیجیے لکھائی چھپائی بہت عمدہ قیمت سالانہ درجۂ عام دو روپیہ آٹھ آنے (عہ) مع محصول نمونہ چار آنے کے ٹکٹ پر بھیجا جاتا ہے۔

المشتہر

منصرم رسالہ دفتر شعلہ محلہ چوڑیگران۔ دہلی

تمدّن

لکھنوی "تمدّن"

شکر ہے کہ یہ پرچہ پورا لکھنوی "تمدّن" کہلانے کا مستحق ہے۔ کیونکہ اب یہ چھپے گا بھی لکھنؤ میں اور شائع بھی لکھنؤ سے ہی ہوگا۔ اسوقت تک "تمدّن" وقت پر شائع نہیں ہوتا تھا ہم نے چاہا تھا کہ یہ ہمارے ہاتھ میں آتے ہی باقاعدہ ہو جائے مگر "ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال" کی مستند ضرب المثل نے ہم پر بھی وار کیا اور دہلی میں چھپنے کی وجہ سے ہم "تمدّن" کو وقت پر شائع نہ کر سکے گو پچھلی حالت اور اب کی حالت میں فرق تو ضرور ہوا کہ اب کم از کم ہر مہینہ ایک پرچہ شائع تو ہونے لگا۔ اس کلیہ کے مطابق نومبر نمبر اکتوبر نمبر کے پورے ایک ماہ بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہے اور یہ بھی پوری ایک ماہ کی دیر سے شائع ہوا ہے۔ دسمبر کا پرچہ البتہ وقت پر جناب کی نظر سے گذرے گا یعنی دسمبر کے اخیر ہفتہ سے کچھ قبل ہی وہ جناب کی خدمت میں باریاب ہوگا اور آئندہ انشاء اللہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ ود

"تمدن" جو عرصہ سے بے قاعدہ رہ کر اپنی ہستی کو بھی پورے طور پر قائم نہ رکھ سکا تھا اپنے ناظرین کی خدمت میں ہر ماہ کی ٹھیک ۲۰ تاریخ کو روانہ کر دیا جائے گا۔ اسوقت تک جو تاخیر اسکی اشاعت میں ہوتی تھی اس کا الزام بہت کم ہم پر لگایا جا سکتا ہے آئندہ جو کچھ بھی دیر ہوگی (اگر خدانخواستہ ہوئی) تو وہ حقیقت میں ہماری طرف سے ہوگی اور اسکے لیے ہم قابل الزام ہوں گے۔ ہم نے "تمدن" کے سب سے پہلے پرچہ میں جو ہمارے ہاتھوں شائع ہوا۔ وہ مضامین شائع کیے تھے جو حضرات لکھنؤ کی خدمت میں ہماری طرف سے بطور التماس یا نذر پیش کیے گئے تھے مگر شومی قسمت سے وہ نمبر لکھنوی نمبر نہ ہوا اور اسکا فخر اس نمبر کو حاصل ہوا۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرات لکھنؤ کی قدردانی کی توقع پر "تمدن" کو اب لکھنوی تمدن کہا گیا ہے اور ہمیں پوری امید ہے کہ ہماری یہ توقع پوری کی جائے گی۔

"تمدن" کے نقل مکان کے متعلق دو رباعیات اور ایک شعر حضرت واسطی نے عنایت کیا ہے ہر چند انکے چھاپنے سے ہم اپنا ڈھنڈورہ آپ پیٹنے کے مجرم قرار دیے جا سکتے ہیں مگر ہم انکی محبت سے لکھی ہوئی چیز کو نہ چھاپنا بھی کفران نعمت خیال کرتے ہیں اور اسلیے بے کم و کاست ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :۔

رباعی

حالات "تمدن" کا ہوا جب احساس ۔۔۔ دلی سے اسے لکھنؤ لائے عباس
اللہ عطا کرے ترقی شب و روز ۔۔۔ پورب کی اسے آب ہوا آئے راس

نکلا تو ہے اب "تمدن" اپنے گھر سے ۔۔۔ جب لطف ہے بہتر بنے بہتر سے
جو دیکھے جگہ دل میں اور آنکھوں پر دے ۔۔۔ اور گھر میں ایڈیٹر کے سدا دھن برسے

"تمدّن" مایۂ نازش نہ بھلا کیوں لکھنؤ بھر کا
ہے اس کے سر پہ سایہ قاری وسجاد حیدر کا

حضرات لکھنؤ میں سے حضرت مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی نے چند شعر عنایت کیے ہیں جو عرضداشت کے عنوان سے خیر مقدم کے ذیل میں زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہیں چنانچہ ہم انکو اور حضرت شرر مشہدی لکھنوی کے (نثر) خیر مقدم کو جو انھوں نے "دلی کا تمدّن لکھنؤ میں" کے جواب میں ہمیں عنایت کیا تھا شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

خیر مقدم

(۱)

خیر مقدم ہے "تمدّن" کا بھی لازم ہے جگہ — یہ تو اپنا ہی جگر ہے اجنبیت کچھ نہیں
اے خوشا اقبال ! خوش آمدی خوش آمدی — یہ نہ کہنا لکھنؤ کو ہم سے الفت کچھ نہیں
ہائے تم کب آئے جب اپنا بھرا گھر لٹ گیا — خاک اڑتی ہے یہاں سامان حسرت کچھ نہیں
خیر آؤ ہم بھی ہیں موجود خدمت کے لیے — پیشکش ہے نقد دل حاضر ہیں حجت کچھ نہیں

(۲)

خیر مقدم - یا و للکم

خوش آمدید

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اے ہمارے پیارے اور ہر دلعزیز مہمان ہم تیری تشریف آوری کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں ہم بہت خوش ہیں کہ تو نے از راہ کرم ہمارے کاشانہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے رونق بخشی اور ہمیں شکر گذاری کا موقع عنایت کیا۔

ہماری شادمانی کی کوئی حد نہیں ہماری مسرت کا اندازہ مشکل سے ہو سکتا ہے کیونکہ تجھ ایسے معزز اور ہردلعزیز مہمان نے ہم پر کرم کیا۔ ہم جہانتک اپنی خوشی کا اظہار کریں کم ہے ہم تیرے لیے اپنی آنکھیں بچھا دینے کو تیار ہیں۔ ہم تیری خاطر و تواضع میں کوئی دقیقہ فروگذاشت کرنا گناہ خیال کرتے ہیں ہمارے جذبات دلی کے تقاضے تو بیحد ہیں جنکے پورا کرنے کے لیے ہم کو شاید کافی وقت بھی نہیں مل سکتا اور ہم بالکل مجبور ہو جاتے ہیں تاہم ہماری ہمت کو تیری آمد کی خوشی نے اسقدر مستقل کر دیا ہے کہ ہمیں ہر مشکل آسان معلوم ہوتی ہے اور ہم تیری مہمانداری سے اپنے مکان کی رونق دوبالا پاتے ہیں۔ ہماری چیزوں کی رونق تو درکنار تو نے ایک مدت سے ہمارے دلوں کو اپنی طرف ایسا گرویدہ کر لیا ہے کہ ہماری مشتاق آنکھیں تیرے دیدار کی بہار لوٹنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔

رواق منظر چشم من آشیانۂ تست
کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

جب تو نے پہلے پہل دہلی میں قدم رکھا تو تیری عالمگیر شہرت نے ہم کو ایسا مشتاق بنایا کہ جب تجھکو دیکھا تو فوراً دل میں جگہ دی اور آنکھوں سے لگایا اور یہ جذبات ہم میں محض تیری دلاویزیوں سے پیدا ہوئے تھے اے تمدن اور اے ہمارے نئے مہمان اب سے چند سال پہلے ہمکو یہ امید کب ہو سکتی تھی کہ تو ہندوستان میں قدم رکھتے ہی ایسی شہرت اور ایسی ناموری حاصل کرے گا اور تیرے جملہ مضامین دلکش اور تیرے سارے انداز ایسے نرالے ہونگے۔ کیونکہ ایسا دار السلطنت جسکے زوال کو سالہا سال گذر چکے ہوں اسمیں کہاں یہ امید باقی رہ سکتی ہے کہ تیری داشت اور تیری نگرانی کامل طور پر انجام پذیر ہو سکے گی۔ لیکن خدا کے نیک اور مستعد بندے اللہ کے فضل اور اپنی ہمت پر بھروسہ کرنیوالے سب کچھ کر سکتے ہیں اور ہر طرح

اسی بات کو دکھا دیتے ہیں کہ دیکھو کسی بات کی ابتدا یوں کرتے ہیں اور یوں انتہا تک پہنچا دیتے ہیں جیسا کہ پہلے مخزن سے ظاہر ہوا اور پھر وہی جلوہ "تمدن" میں چمک اٹھا اور اسکی چمک نے سب کی آنکھیں جھپکا دیں اور اسکی روشنی نے سب کو باخبر کر دیا کہ دیکھو میں بھی وہ مشعل مشتعل ہوں کہ جو دنیا کو روشن کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں بھی وہ آفتاب ادب ہوں جسکی ابتدائی دھیمی شعاعیں ہندوستان کے گوشہ گوشہ کو جگمگا دیں گی اور میری گرمی افسردہ خون میں بغیر حرارت پیدا کیے ہوئے نہ رہے گی اور واقعی ایسا ہی ظہور پذیر ہوا ابھی چار پانچ برس تک جس آب و تاب کے ساتھ یہ ادبی رسالہ نکلتا رہا وہ اظہر من الشمس ہے خوبی اقبال اور قادر ذوالجلال کے کرم سے جو نعمتیں اسکو نصیب ہوئیں اسکے گواہ حال خود اسکے مضامین ہیں جنکی قدر و قیمت ابتک وہی ناظرین جان سکتے ہیں جنکی خدمت میں حضوری کا شرف حاصل ہو چکا ہے آئندہ وہ حضرات بھی باخبر ہونگے جنکی خدمت میں اب اسکو شرف حضوری حاصل ہوگا۔ یہ بھی خدا کی عجیب نعمت ہے کہ یہ اپنے گھر سے چلا اور اپنے ہی گھر میں آیا عالیجناب قاری عباس حسین صاحب جو پہلے خود دہلی سے تشریف لائے اور لکھنؤ کو اپنے قیام سے رونق بخشی بعدہ (تمدن) آیا اور انھیں کا مہمان ہوا اور اب تو اصل میں ہمارا مہمان ہے اور ہم اسکے میزبان۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اسکی خاطرداری میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کریں اور نہ کرنا چاہیے کیونکہ خدا کی عنایت سے ایک ایسا معزز مہمان آیا ہے جسکی ہمکو ضرورت بھی تھی اور تمامی لکھنؤ چشم براہ تھا۔ حالانکہ جب وہ دہلی دہلی نہ رہی تو وہ لکھنؤ لکھنؤ کیونکر رہ سکتا ہے۔ مگر پھر بھی یہ اپنی مہمانداری اور مدارات ہی کی وجہ سے دنیا کے ہر حصہ میں مشہور ہے (چنانچہ میں نے خود ایران کے سب سے بڑے شہر یعنی خراسان میں جو روس سے بہت ہی قریب ہے اسکا نام بارہا وہاں میں ایرانیوں کی زبان سے سُنا اور بہت تعجب ہوا) اور اب گری ہوئی حالت میں

بھی بہت کچھ سامان فراہم کرسکتا ہے بلکہ بسر وچشم اسکی خدمت کے لیے حاضر ہے لیکن مجبوری اور سخت مجبوری تو صرف اسقدر ہے کہ اتبو ہماری قوم بھی اس نازک حالت میں ہے کہ کسی ترقی پذیر امر کی برداشت سے قاصر ہے پھر ہم کس منھ سے دعوی کریں کہ ہم سے اسکی داشت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہوگا۔ اور رہم اسکی تواضع میں پوری کامیابی حاصل کرسکیں گے مگراس قاعدے کی رو سے کہ جو مہمان کسی کے یہاں فروکش ہوتا ہے تو اُسکے جملہ احباب اُسکو دعوت دیتے ہیں اور اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوے اسکی تشریف آوری کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں اسلیے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ لکھنؤ کیا تمام ہندوستان میں اسکی ضیافت طبع کے سامان بہم پہنچاے جائینگے اور یہ ہمیشہ خوش وخرم رہے گا۔

علے الخصوص لکھنؤ جسکو "تمدن" نے اپنے پہلے اشتہار میں ایک بزرگ مانا ہے اور اظہار خلوص وسعادت مندی کرتے ہوے سرپرست جانا ہے۔ اسکی نگرانی وبہبودی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے گا اور حتی المقدور اسکی بھلائی اور کامیابی کی کوشش کرے گا اور اس کی ہمیشہ یہ دل سے دعا رہے گی کہ خدا اس نونہال کو سرسبز و شاداب رکھے اور یہ پھولے پھلے اس کے سایہ میں لوگ آرام پائیں اور اس کی داشت کرنے والے اپنی ریاضت کے پھل کھائیں آمین ثم آمین۔

الحمد للہ ہر آن چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

شرر مشہدی لکھنوی

خط وکتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیے۔ منیجر

یادِ رفتگان

ہمارے کرمفرما جناب غلام محمد صاحب طور ایم۔اے نے یہ نظم ہمکو عنایت کی ہے جو انھوں نے قلعہ لاہور کی سیر سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اسمیں ان مختلف محسوسات و سوز و گداز کا اظہار ہے جو بالطبع ایک شاعر کے یہے رجسکے دل میں اپنے ملکی اور قومی آثار قدیمہ دیکھنے سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے سرمایۂ ناز کہے جا سکتے ہیں) لاہور کے قلعہ کی سیر سے قدرتاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آج اسکے مکین کہاں ہیں؟ وہ دنیا کی تمام قیود سے آزاد ہو کر عالم بالا کی سیر کر رہے ہیں حضرت طور نے خصوصیت کے ساتھ اسی خیال کو نظم کیا ہے۔

ایڈیٹر

کیسی دشواری ہے مجکو آج اے میرے خدا
ہے اکیلی جان مری اور سینکڑوں رنج و بلا

آج کیوں اندوہ و غم نے آکے گھیرا ہے مجھے
آج اوساں کس لیے میرے خطا ہونے لگے

یاس و حسرت کیوں اُمنڈ آئے ہیں مجھ ناشاد پر
ہو رہی ہے کس لیے اقلیم دل زیر و زبر

کیوں ڈبونے کو ہے مجکو موج بحر اضطراب
کیوں بہا جاتا ہوں اس دریا میں مانند حباب

بیقراری کیوں گلوے جاں کا میرے ہار ہے
درد میرے پاس دل کے واسطے کیوں خار ہے

سینہ کاوی دلخراشی جانکنی ہے کس لیے
ہائے ننھی سی مری جاں پر بنی ہے کس لیے

کیوں پسینوں پر پسینے ہیں مجھے یوں آرہے
ضعف ہم آغوش ہے مجھ سے الٰہی کس لیے

کس لیے لحظہ بلحظہ مجکو آتی ہے غشی
ایک حالت جا رہی ہے ایک حالت آرہی

کیوں تلاطم میں ہے اے دریاے چشم خونفشاں
تیرے ہر قطرے میں ہے سامان بحر بیکراں

بے طرح میری طبیعت ہو رہی بیتاب ہے
دل مرے پہلو میں ہے یا ماہی بے آب ہے

ہوں ترا دلدادہ اے احساسِ یادِ رفتگاں — شوق سے آ، اور لے پہلو میں میرے چٹکیاں
میری قسمت میں ازل سے ہے لکھا سوز و گداز — میرے سینے میں خدا نے ہے بھرا سوز و گداز
برقِ خرمن سوزِ حسنِ اولیں کی مجھ میں ہے — آتشِ عشق اک مہِ پردہ نشیں کی مجھ میں ہے

درد کہتے ہیں جسے میں اسکی اک تصویر ہوں
درد کی یعنی بنا ہوں، درد کی تعمیر ہوں

عالمِ عقبیٰ کو جانیوالو! ہو دل شاد تم — قیدِ ہستی کی سلاسل سے ہوا اب آزاد تم
تم کو اب گلگشتِ فردوسِ بریں سے کام ہے — رات دن تمکو میسر راحت و آرام ہے
کینہ و بغض و حسد سے اب تمھیں خطرا نہیں — دشمنوں کی دشمنی کا اب تمھیں کھٹکا نہیں
تم غرور و کبر و خودبینی سے کوسوں دور ہو — ایک ہی صہبائے وحدت کے نشے میں چور ہو
اب تمھاری جان کو خوفِ ریاکاری نہیں — جامۂ یاری میں پنہاں یعنی غداری نہیں
اب ہوا و حرص اور لالچ تمھیں اصلا نہیں — سیم و زر کے جمع کرنے کا تمھیں سودا نہیں
فکرِ اسبابِ معیشت سے رہا ہو تم رہا — ہے یہ دامنگیر اہلِ عالمِ اسباب کا
جد و جہدِ زندگی سے تم کو فرصت مل گئی — یعنی دنیا کے مشاغل سے فراغت مل گئی
ہیچ و ذم سے تم کو استغنا ہوا اچھا ہوا — آفریں کی ہے تمھیں پروا، نہ نفریں کا گلا
زندگی بھر کے تمھارے عیب اور جرم و خطا — رحمتِ باری نے دامن میں لیے اپنے چھپا
اب عروسِ دہر کے ناز و ادائے دلنشیں — گھر تمھارے خانۂ دل میں بنا سکتے نہیں
اب زمانہ کے تغیر اور جہاں کے انقلاب — کر نہیں سکتے تمھیں غرقابِ بحرِ اضطراب
چرخِ گرداں لاکھ گھومے کچھ تمھیں پروا نہیں — گردشِ گیتی سے اندیشہ تمھیں اصلا نہیں
اب ستارے بھی فلک کے کھوٹی قسمت کی کتاب — کر نہیں سکتے تمھاری آنکھ سے کافور خواب
تا ابد اے جانیوالو خوش رہو اور شاد تم — خوب عشرت اور عافیت کی اب ہو داد تم

پھر خدا معلوم کیا دور تمھیں دکھلائے گا
دل میں مسرت لائے گا یا سر پہ آفت ڈھائیگا

طور

مرد۔عورت

گذشتہ سے پیوستہ

تو نے فرہاد و مجنوں، رتن سین، کا بھی دکھڑا رو یا لیکن میں اسپر التفات نہیں کرتی کیونکہ تجھے کیا خبر کہ انھیں کوئی تکلیف تھی بھی یا نہیں۔ ممکن ہے کہ جسے تو ناکامی سمجھ رہا ہے اُن کے لیے کامرانی ہو اور جس سے تو اب نفرت کر رہا ہے وہ انکے لیے باعث محبت و راحت ہو تو ان باتوں کا کیوں ذکر کرتا ہے جن سے تجھے کبھی واسطہ نہیں پڑا اور اسکو یہ حال کیا بتاتا ہے جس سے تو نابلد ہے۔ زلیخا کا ذکر یوسفؑ سے کرکے پوچھو کہ پیغمبری کیونکر ملی ہی کافی ہے۔ اے گندم نما جو فروش! یہاں تک تو مختصراً جواب تھا۔ تیرے رکیک الزاموں کا اب سُن کہ جن کی تو شکایت کر رہا ہے وہ تیرے کسقدر شاکی ہیں اور جن کی داستانِ ظلم تو نے سُنائی ہے وہ کتنی دُکھ بھری کہانیاں اپنے دلوں میں لیے ہوے ہیں۔

عورت کی جنس اس لحاظ سے ہے کہ وہ انبیا کی ماں تھی۔ اولیا اور فقرا کی ماں تھی ساری دنیا کی ماں تھی اُسکا احترام کیا جاتا۔ لیکن اے مرد کہ تو نے ہمیشہ عورت کے نام سے نہ ہرا گوارا۔ تو ایک ماں کی بھی عزت کیوں کرتا اور تو یوں کیا عزت کرتا۔ تو نے یہ بھی تو گوارا نہ کیا۔ کہ خدا کی دی ہوی عزت اُسکے پاس باقی رہے عیسٰےؑ بن باپ کے پیدا ہوے یہ معجزہ تھا مریمؑ کا لیکن تو نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ایک عورت حامل معجزہ ہو اسلیے آج دنیا میں کوئی مریمؑ کا نام اس لحاظ سے نہیں لیتا۔ اور یہ شرف بھی عیسٰےؑ کو

دیا گیا۔ ایران جس کی تباہی کا تو نے دکھڑا رویا۔ ہندوستان جس کے تباہ ہونے پر تو نے ماتم کیا۔ کیا تجھے خبر ہے کہ وہ کیوں برباد ہوئے۔ اور کیا تجھے علم ہے کہ وہاں میرے ساتھ کیا سلوک ہوتا تھا۔ ایران میں تو تیری جنس نے بیوی بہن کی تمیز اٹھا دی تھی۔ اور ہندوستان میں ایک عورت تمام بھائیوں کے تصرف میں رہتی تھی، کیا تو ایسا کرنے پر بھی دنیا میں جینے اور باقی رہنے کی تمنا کرتا ہے۔ میری جنس کی وہ رہبانیں جن کی لغزش کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا جاتا ہے، تجھے خبر ہے کہ اُن کی خانقاہیں اُن کے معابد کیا تھے، مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے یورپ چلے جاؤ اور اُن سے کھدوا کر دیکھو اب بھی تمہیں تہ خانوں میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے ڈھانچے اُن معصوم بچوں کے مل جائیں گے۔ جو ماؤں کی گودوں سے چھین کر زندہ دفن کرا دیے گئے تھے۔ صرف اس لیے کہ دنیا میں تیرے عیب ظاہر نہ ہونے پائیں۔ اور تو دنیا کا ویسا ہی زاہد بنا رہے ہزاروں لڑکیاں جو تیرے تقدس مآب گروہ کے پاس طلب آخرت وہمت توبہ و سلوک کے لیے آتی تھیں بند کر دی جاتی تھیں کنواریاں۔ اور لوٹتی تھیں زبردستی مائیں بن کر۔

کیا تو نے رومۃ الکبریٰ کی تاریخ نہیں دیکھی، جہاں آن واحد میں ہزاروں عورتیں [illegible] ایک ایک مقدس راہب کے ادنیٰ اشارے پر شاہراہوں پر ذبح کر کے ڈال دی جاتی تھیں۔

[illegible]ء میں پاپائے روم کے حکم سے میری جنس کی ہزاروں عورتیں صرف اس لغو شبہ پر گرفتار ہو کر سولی پر نہیں چڑھا دی گئیں کہ تمہیں سحر آتا [illegible] کیا سترھویں صدی کے وسط میں غریب عورتیں اس بیہودہ اعتقاد کی

بنا پر گرفتار ہوتی تھیں تو وہ اقرار نہ کر لیتی تھیں صرف اس ڈر سے کہ اگر انہوں نے انکار کیا تو ناخنوں میں کیلیں کس سے ٹھکوائی جائیں گی۔ گرم لوہے کے داغ کس سے کھائے جائیں گے۔

اے مرد تیرے الزاموں کا کچھ ٹھیک ہے انگلستان کی لانگ پارلیمنٹ کے زمانے میں کیا تو نے ایک عورت پر یہ الزام رکھ کر کہ وہ اپنی جرابیں اُتار کے اور صابون میں گھول کر طوفان برپا کر رہی ہے۔ پہلے اُسکے نوزائیدہ معصوم بچے کو اور پھر اُسے سولی پر نہیں چڑھایا۔ کیا تو نے اُس سال ایک خاص قانون عورتوں کو پکڑ پکڑ جلانے مار ڈالنے کا نافذ نہیں کیا تاریخیں اُٹھا اور اپنے کارناموں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو کہ تو نے کوئی دقیقہ ہماری جسمانی واخلاقی تباہیوں کے لیے اُٹھا نہیں رکھا مگر وہ خدا جس نے تجھے اور ہمیں اس دنیا میں یکساں حقوق دے کر بھیجا تھا۔ زیادہ عرصے تک اس طوفان عدوان بغاوت کو نہ دیکھ سکا۔ اور اُس نے سرزمین عرب سے ایک ایسے شخص کو پیدا کیا جس نے سب سے پہلے ہماری خراب حالت پر دل دُکھایا اور اپنی تعلیمات سے اپنی عملی زندگی سے دنیا کو بتایا کہ عورت تو دنیا کی محبوب ترین اشیاء میں سے ہے۔

اے ظالم اگر تو عورت پر ستم کرنا روا رکھتا ہے تو تجھے کیا حق حاصل ہے کہ تو عورت سے محبت و لطف کا طلبگار رہے لیکن نہیں۔ تو ان تمام زیادتیوں پر منفعل ہوگا۔ شرمائے گا اگر کبھی تجھے ہمارے دل کی حقیقی حالت کا اندازہ ہو جائے گا۔ کہ ہم تو اب پھر بھی کچھ نہیں کہتے اور تیری اطاعت فرض جانتے ہیں مگر تو اُن چھالوں کی جو تیرے لیے چکی پیسنے میں پڑجاتے ہیں تو اُن ہڈیوں کی جو تیری پرورش و خیال میں غریب عورت کی نصف زندگی ہیں۔ قدر

کرینگے اہل نہیں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ تو اس قابل تھا ہی نہیں کہ تیرے لیے اتنا دُکھ درد برداشت کیا جاتا۔ تو میری بیوفائیوں کی شکایت کرتا ہے لیکن کیا تجھے یہ کہتے شرم نہیں آتی جبکہ وہ تمام باتیں جو میرے لیے باعث ننگ و عار قرار دی جاتی ہیں تیری بے حمیت زندگی کے لیے مایۂ نشاط ہیں اور یہی لغزش میں تو عورت کو گھر سے نکال دینے کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے۔ حالانکہ اُسی طرح کی ہزاروں لغزشوں سے تیری ہر رات معمور ہوتی ہے۔ مگر عورت تجھ سے یہ بھی سوال نہیں کرسکتی کہ۔ بہ ہر کہ بودی امشب۔

اگر میں یہ کہوں کہ کائنات کی ساری رونق گیتی کا یہ بازار عمل سب میرے دم سے ہے تو تو فوراً انکار کردے گا۔ کہ مرد کا بھی اسمیں برابر کا حصہ ہے لیکن تیرا انکار خدا کے فیصلہ سے انکار کرنا ہوگا جس نے مریمؑ کے پیٹ سے عیسٰے کو پیدا کرکے یہ دکھلادیا کہ اگر تو دنیا میں نہوتا تو بھی یہ ساری آبادی یوں ہی تیار ہوسکتی تھی۔ اب تو کوئی مثال ایسی بتا کہ (بغیر عورت کے) صرف تو نے کبھی کوئی بچہ جنا ہو۔

میں بھی اگر تیری طرح الزامات لگانا چاہوں تو کہہ سکتی ہوں۔ کہ ابلیس جس نے سب سے پہلے خدا کے انحراف کی بنیاد ڈالی۔ مرد ہی تھا وہ کوئی ابلیسہ نہ تھی۔ اگر تھی تو قرآن حدیث تاریخ سے تلاش کرکے مجھے بتا۔ کہ کبھی کسی عورت نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ یہ تیری ہی انانیت ہے کہ اُسنے تجھ سے یہ فقرہ تخت جبروت و جلال پر انا ربکم الاعلیٰ کہوایا۔ اور یہ تیری ہی سرکشی و نافرمانی تھی۔ کہ مسلمہ کو کذاب و دجال کا خطاب عنایت کرایا۔

تو شکایت کرتا ہے کہ یورپ میرے ہاتھوں سے تنگ ہے۔ حالانکہ تو میرے

دیکھو ظلم اور کیا کر سکتا تھا کہ تو نے مجھ سے میری انسانیت چھین لی ۔
تو نے چاہا کہ تو ہی وہ سب کام کرے جو تو نہیں کر سکتا تھا ۔ تو آزادی کا
الزام عورتوں پر رکھتا ہے ۔ حالانکہ تو ہی وہ تھا جس نے سب سے پہلے
ہماری طبیعتوں کے خلاف ۔ ہماری فطرت کے منافی ہمارا پردہ توڑنا
چاہا لیکن اے نٹ کھٹ پہلے تو خود ہی میرے چہرے سے نقاب نوچ کر
پھینک دیا ۔ اور پھر خود ہی بگڑ بیٹھا ۔ کہ یہ نقاب کیوں جدا ہوا ۔ اللہ رے
تیری ستم آرائیاں ۔

تو تو اُس دیوانے کی طرح ہے جو خنجر و شمشیر سے اپنی حالت صحت میں
کام لینا اچھی طرح جانتا تھا لیکن جب تیرا دماغ پھر گیا اور ان کا استعمال
بھول گیا اور اس طرح اپنا ہاتھ آپ کاٹ لیا ۔ تو تلوار توڑ ڈالی کہ سارا
قصور اسی کا ہے خنجر پھینک دیا ۔ کہ اسی نے میرا ہاتھ زخمی کیا ۔ مگر کیا کوئی
ذی فہم صرف اس وجہ سے تلوار اور خنجر کو بُرا سمجھنے لگے گا ۔ تجھی کو الزام
دے گا کہ تو اُن کا اہل نہیں رہا ۔

سُن اور کان کھول کر سُن :-

میں ایک نغمۂ نشاط ہوں ۔ اگر تو قرینہ سے ر ہے لیکن یہ کتنا ظلم ہے
کہ وہ نغمہ جو تیرے کانوں کے لیے ہے تو اسے پکڑ کے کانوں میں رکھنا
چاہتا ہے ۔ اے دیوانے ۔

میں ایک نکہت دل آویز ہوں اگر تیرے حواس خراب نہ ہوں لیکن یہ
کیسی قیامت ہے کہ وہ شمیم جو صرف تیری شامہ کے لیے ہے ۔ تو اسکو اپنی آغوش میں
لے کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا آرزو مند ہے ۔ اے پاگل ۔

میں ایک پھول ہوں اگر تجھے کچھ تمیز ہو ۔ لیکن یہ کیا ستم ہے کہ وہ پھول

جس کی خوشبو اور رنگینی صرف تیرے دل کو مسرور بنانے کے لیے ہے اسکی پنکھڑیاں الگ الگ کر کے تو اسے کھا جانا چاہتا ہے۔ اے بد دماغ۔

مَیں ایک نورانی تسلی ہوں اگر تجھ میں کچھ عقل ہو۔ لیکن یہ کیسا غضب ہے کہ وہ سکون جو صرف تھکے ہوئے دماغ اور کسلمند طبیعت کے لیے تھا تو اس سے طمانیت نہ پانے کی شکایت کرتا ہے حالانکہ تیرے دماغ نے کوئی کام نہیں کیا کہ وہ تھک جائے اور پھر میری تلاش کرے تیری طبیعت محنت سے کسلمند نہیں ہوئی کہ اسے میرے وجود کی ضرورت ہو اگر تو میری حقیقی وقعت کرنی جانتا اور تجھے میری لذتوں کا علم ہوتا تو تو رات دن کام کرتا محنتیں کرتا۔ دنیا میں بیکار نہ رہتا اور پھر جب تجھکو شگفتگی اور تازگی کی ضرورت ہوتی تو میری جستجو کرتا اور پھر تازہ دم ہو کر کام میں لگ جاتا۔

تو شاعر ہے یعنی اپنے جذبات کے ساتھ میرا ذکر کرنا تیرا شعار ہے لیکن تجھے شرم نہیں آتی کہ کسقدر خلاف واقعہ تو میری توہین کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ تو محافل میں میری برائیاں بیان کرتا ہے میری اُن بے وفائیوں کا ذکر کرتا ہے جو مجھ میں نہیں ہیں اور تو نے کبھی ان مظالم کا حال بیان نہیں کیا جس سے تیری زندگی نے تربیت پائی ہے تو سمجھتا ہے کہ عورت صرف سلسلۂ تناسل کا ذریعہ ہے لیکن اے خیرہ نگاہ تجھے یہ خبر نہیں کہ میرا احترام کرنے میں حقیقی راز ترقی کا نہاں ہے۔ مجھے بتا کہ اس عورت سے کسی مرد نے کوئی اچھی صحیح الدماغ اور تنومند و توانا اولاد پیدا کی جس سے اس نے نفرت کا اظہار کیا؟

اے بے خبر وہ صرف عورت کی معاشرت پر موقوف ہے چاہے دنیا میں تیری نسل کو بگاڑ دے چاہے بنادے۔ دیکھ اسقدر بیزاری کا اظہار نہ کر

تجھے معلوم ہوگا کہ لوط کی قوم نے مجھسے بیزار ہو کر کیا ثمرہ پایا۔ اللہ نے وہ بستی کی بستی اُلٹ دی جبمیں وہ نابکار مردود و ملعون قوم عورت سے نفرت کرنے والی رہتی تھی تو کہتا ہے کہ "میرا دامن چھوڑ" میں کہتی ہوں کہ چل ہٹ مجھ سے بات نہ کر کہ تجھ سے بوئے خون آتی ہے۔ تو نے اپنی عاقبت بگاڑی تو میں کیوں تیرے پیچھے اس عذاب میں مبتلا ہوں جو تیرا انتظار دست خدا میں کر رہا ہے۔

ریویو

ہمارے پاس ایک کتاب بعنوان "گوکھلے بحیثیت انسان" ریویو کے لیے آئی ہے یہ کتاب مسز سروجنی نائڈو کی انگریزی کتاب کا اُردو میں ترجمہ ہے جو نہایت قابلیت سے سید خورشید علی صاحب نے کیا ہے۔ اس کتاب میں مسز سروجنی اور مسٹر گوکھلے آنجہانی کی ملاقاتوں اور خط و کتابت کا ذکر ہے جس سے مسٹر گوکھلے کے ہمدرد انسان اور محب وطن ہونے کا ثبوت ملتا ہے سید خورشید علی صاحب نے اصل کتاب کے ساتھ ایک دیباچہ لگایا ہے جس میں مسز موصوف کی زندگی کی مختصر تاریخ لکھی گئی ہے کتاب کی لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ خورشید علی صاحب نے ہم کو لکھا ہے کہ جو قیمت اسکی فروخت سے وصول ہوگی وہ "گوکھلے میموریل فنڈ" میں دیدی جائیگی یہ ۱۰۰ صفحہ کی کتاب بقیمت ۴ر سید خورشید علی صاحب خورشید کاٹیج حیدرآباد (دکن) سے مل سکتی ہے۔

چالیس سال میں ایک ہی موقعہ

دسمبر ۱۹۱۵ء میں اخبار نیر اعظم مرادآباد کی عمر کا چالیسواں سال پورا ہوتا ہے اسکی خوشی میں خدا کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ پبلک کو کوئی خاص رعایت دینا بھی ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں نیر اعظم بک ایجنسی کی تمام نایاب زمانہ کتب علاوہ خرچ رعایتی کے ایک تہائی قیمت پر دی جائینگی۔ صرف اُن درخواستوں پر رعایت دی جائیگی جو ۱۳ر دسمبر تک ڈاکخانہ میں ڈالی گئی ہوں۔ تازہ فہرست کتب جس میں اصلی قیمت درج ہے فوراً مع نمونہ اخبار طلب فرمائیے۔ اسی کے ساتھ نیر اعظم بھی نصف قیمت میں دیا جائیگا۔ ایک روپیہ سے کم فرمایش نہ ہو۔

المشتہر نیر اعظم بک ایجنسی مرادآباد۔ یو۔ پی

حُسن

(۲)

شاعر اگر اپنی بدقسمتی سے اُکتائے تو بس اتنا کہہ سکتا ہے۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے   نالہ پابند نے نہیں ہے

شہرت جسقدر بھی جی چاہے حاصل کرے حالانکہ اسمیں بھی شرط حتی المقدور کی ضرور ہے۔لیکن خیر پھر بھی اسکو لوگ گوارا کر سکتے ہیں۔

لیکن چاہیے اس سے اسکو کچھ مالی منفعت ہو یہ غیر ممکن۔ایک صنعت و حرفت والا دن بھر کام کر کے جب اُٹھے گا تو اُسکو کم از کم دو چار روپیے ضرور مل جائیں گے۔

مگر جب ایک شاعر دن بھر فکر کر کے اُٹھے گا تو اُسکے ہاتھ میں سوائے چند پرچوں کے کچھ نہو گا۔یا گھر کی اور بال بچوں کی فکر دامن گیر ہو گی۔ اس کے وجوہ اہل بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کا پہلا قوی سبب اپنے ہم زبان حکام کا نہ ہونا ہے۔دوسرے شاعری کوئی ایسا آلہ نہیں جو سوائے دماغی ضرورتوں کو پورا کرنے کے جسمانی راحت و آرام کے سامان مہیا کر سکے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ شاعر وہی سمجھا جائے گا جس کا دماغ ہر چیز سے بے نیاز ہو چکا ہو لیکن دوسروں کے خیالات کو فائدہ رسانی میں کامل ہو اور اسکے سوائے چند دور کے ہر دور میں شاعری کی قدر زیادہ نہیں ہوئی ہے - ہاں موجودہ زمانہ میں صفات اپنی حد کو پہنچ چکی ہے [illegible]

اردو شاعری کا وجود بھی باقی نہ رہے تو کچھ بعید نہیں۔ کیونکہ اردو شاعری کیلیے سب مشکلات موجود ہیں الحاصل جب شاعر اپنی شاعری سے روپیہ پیدا نہیں کرسکتا تو وہ بیچارہ اچھا لباس کہاں سے بنائے۔ موٹر کیونکر اڑائے۔ ہوائی جہاز تک کس طرح سے جائے۔ کیونکہ اسکے پاس پر پرواز تو ہیں ہی نہیں بقول سعدی۔ (جامہ ندارم دامن از کجا آرم)

اب بہ لحاظ صورت شاعر میں حسن اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ فکر تو ہر وقت اسکے دل و دماغ کا خون چوستی رہتی ہے اور جسم میں خون پیدا کرنے والی چیزیں اس سے بھاگتی اور نفرت کرتی ہیں۔ وہ روز بروز دبلا اور لاغر ہو جاتا ہے اور آخر میں تھک کر یہ کہنے لگتا ہے۔

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

شاعر کے حسن ظاہری اور حسن باطنی دونوں ہی کا ست نکلکر اسکی شاعری میں آجاتا ہے۔ اور وہ یا کچھ اسکا دماغ دنیا میں برائے نام زندہ رہتا ہے اور چند روز کے بعد وہ بھی خاک میں مل جاتا ہے۔ مگر اسکی شاعری میں اسکے حسن کی جھلک ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

طبقۂ حکماء کا حسن ظاہری دو صورتوں میں نظر آتا ہے موجودہ زمانہ نے حکماء یونان اور حکماء انگلستان کے لباس اور وضع ظاہری میں بھی بین فرق پیدا کردیا ہے پرانے زمانہ کے حکیموں کے لباس میں پنج گوشیہ ٹوپی۔ انگرکھا۔ ڈھیلے پائنچوں کا پائیجامہ گھیتلا جوتا فنس کی سواری رائج تھی جو ان کے پیشہ کے مناسب انکا حسن ظاہری کہا جاسکتا ہے مگر اب اس وضع کے حکماء بھی بہت کم نظر آتے ہیں موجودہ زمانہ کے

حکیموں اور طبیبوں کے لباس میں بہت کچھ تبدیلی آگئی ہے۔

فی زمانہ ایرانی یا ترکی ٹوپی۔ شیروانی یا اچکن قمیص۔ کالر علیگڈھ کاٹ کا پائیجامہ۔ موزہ اور بوٹ۔ ہاتھ میں چھڑی۔ سواریوں میں فٹن بالکی گاڑی تانگہ رائج ہے اور یہی وضع اُن کا حُسن ظاہری کے جاننے کی مستحق ہے۔ اسیطرح حُسن سیرت میں بھی تھوڑا سا فرق رفتار زمانہ نے پیدا کر دیا ہے۔ پہلے حکیموں کے لیے زہد و ورع۔ عبادت۔ شب بیداری۔ رحم دلی۔ استغنا کفایت شعاری پرہیزگاری مسن ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا مگر موجودہ زمانہ نے ان باتوں میں بھی بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کو دخل دیا ہے جس سے حُسن سیرت میں بہت کمی واقع ہو گئی ہے۔

فلاسفر اور سائنس داں طبقہ کے لوگ اونچی ٹوپی کو زیادہ پسند کرتے ہیں ڈاکٹروں کے حُسن ظاہری میں بھی اونچی ہی ٹوپی مزیب سمجھی گئی ہے۔ مگر یوروپین طبقہ کا لباس قریب قریب ایک ہی اُن میں ڈاکٹر ہوں یا بیرسٹر حکام ہوں یا فلاسفر سب ایک ہی طرح کے لباس میں نظر آتے ہیں شکل و شمائل اور رنگ وغیرہ میں بھی کوئی زیادہ فرق پایا نہیں جاتا۔ سواریوں میں موٹر۔ موٹر سائیکل۔ دو پہیہ رائج ہے اور یہی حالت مجموعی اُن کا ظاہری حُسن سمجھا جاتا ہے۔

حسن سیرت میں خوش اخلاقی مستقل مزاجی۔ وعدہ وفائی۔ پابندی اوقات۔ نیک چلنی۔ کفایت شعاری۔ انصاف پسندی سب سے اچھے اوصاف سمجھے جاتے ہیں۔

اب رہا وہ حُسن جس سے محض خوبصورتی مراد لی جاتی ہے اور طبقۂ نسواں کے لیے خاص کر استعمال کیا جاتا ہے اور اسکے اثرات سے لوگ

متاثر بھی ہوتے ہیں اُس میں بہت کچھ جذب وکشش اور دلی تعلقات کو دخل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بجائے خود حُسن ایک ایسی مستقل اور باثر شے ہے جس کے کیفیات اور جس کے جذبات کی کوئی حد معین ہونا مشکل اور بہت مشکل ہے لیکن حُسن سیرت کا مرتبہ اُس سے بالا ہے اور بغیر حُسن سیرت کے حُسن صورت محض ایک تکلیف رساں اور ضرر رساں شے سمجھی جاتی ہے جس سے انسان تھوڑی دیر متاثر ہونے کے بعد اپنے دلی خیالات کا بھی مخالف ہو جاتا ہے اور اپنے ہی دل کی طرفداری اُسے سخت ناگوار معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ خود اپنے دل کا دشمن ہو جاتا ہے اور دل و دماغ میں ہمیشہ کے لیے مخالفت کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ اور اگر حُسن صورت کے ساتھ حسن باطنی بھی موجود ہے تو ایسا حُسن والا دوسرے کو ہمیشہ کے لیے اپنا سچا چاہنے والا اور سچا عاشق بنا سکتا ہے۔ درحقیقت (بیوٹی) چند قدرتی مناسبات اور تناسب اعضا کا نام ہے جو تمام افراد میں سے کسی کسی کو ودلیعت ہوتا ہے یہ حسن ہر ایک کا حصہ نہیں ہاں کم وبیش تقسیم اسکی تمام موجودات میں ہوی ہے۔ اور یہی حال حُسن سیرت کا بھی ہے خواہ حسن صورت کیسا ہی ہو۔

میں نے حُسن کے مناظر ترک اور ایراں میں بہت دیکھے لیکن سیرت کی جانچ پرتال کا موقع بہت کم ملا اور جہانتک ملا اُسکی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ حُسن سیرت بھی بہ نسبت ہندوستاں کے بہت زیادہ ہے۔

کئی ماہ چلنے کے بعد میرا ایک ایسے مقام میں گذر ہوا جہاں کے لوگ پردے کو جانتے ہی نہ تھے کہ پردہ کیا چیز ہے۔ اور حُسن بھی بدرجۂ اتم تھا وہاں کا لباس بھی قابل الذکر ہے۔ تمام عورتیں سر پر سیاہ سیلے باندھے ہوئے تھیں جن کے شملے ساق پا تک لٹکے ہوئے تھے۔ بر میں بہت لانبے نیلے رنگ کے

کُرتوں پر ایرانی مخملی کوٹ ڈٹے ہوئے تھے۔ اور وہ سب مثل مردوں کے طرزِ معاشرت میں یکساں شامل تھیں۔ یہ دیکھکر مجھے بہت تعجب ہوا کہ ان پر بے پردگی کا کوئی بھی بُرا اثر نہیں ہے حالانکہ شرع کے بالکل خلاف آزادی کا جامہ پہنے ہوئے ہیں۔

الحاصل حسن کی یہ دو قسمیں یعنی حُسن ظاہری اور حُسن باطنی جنکو حسن صورت اور حُسن سیرت کہہ سکتے ہیں کم و بیش ہر شے میں موجود ہیں مگر کسی میں حسن صورت بہت زیادہ ہے اور حسن سیرت بہت ہی کم۔ ایسا حُسن نہایت ضرر رساں اور خوفناک ہوتا ہے۔ کسی میں حُسن سیرت بدرجۂ اتم ہے اور حُسن صورت بالکل ہی نہیں۔ ایسا آدمی اُس سے کہیں زیادہ اچھا ہے جس میں حُسن ظاہری تو ہے مگر حُسن باطنی کا حصہ بہت کم ملا ہے۔

اور جس میں یہ دونوں صفتیں نہیں اُسکا شمار جمادات میں ہے ایسا شخص آدمی یا انسان کہے جانے کا مستحق بالکل ہی نہیں۔

اور جس میں یہ دونوں صفتیں پائی جائیں وہ تمام افراد میں فردِ کامل کہا جائے گا۔ مگر ایسے افراد ہر اقلیم میں بہت ہی کم پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ (غالب) کے اس مطلع سے ظاہر ہو رہا ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

احسن مرزا شرر مشہدی
لکھنوی

پردہ اور
تعلیم نسواں

مجھے بحیثیت عورت ہونے کے ضرورت محسوس ہوتی ہے بلکہ ہمدردی ہمجنس تقاضا کرتی ہے کہ ضرور میں بھی پردہ کے اہم مسئلہ پر قلم اُٹھاؤں اور اپنی جنس کو پردہ کے نقصان و مفاد سے آگاہ کردوں۔ جبکہ پردہ اُٹھا دینے کے مضامین کی بوچھاڑ نے قوم کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ ہماری قوم کے بعض مرد۔ مرد تو ایک طرف ہمارے ہاں کی بعض عورتیں کیوں اسقدر بے چینی سے مخالفت پردہ پر کمربستہ ہوکر اس بے چارہ کے پیچھے پڑگئی ہیں اور کیوں اسکو غیرضروری سمجھ کر عضو بیکار خیال کیا جارہا ہے اور پردہ اُٹھا دینے پر آمادہ نظر آرہی ہیں۔ پھر طرہ یہ ہے کہ کچھ دور ہی نہیں جاتے قرآن مجید سے پردہ نہ ہونے کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ میری عقل اس جولانگاہ میں سرگرداں ہے کہ وہ کونسی آیات سے پردہ نہ ہونے کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ قرآن یا شریعت کے سر تو یہ الزام روا نہ رکھیں بلکہ یوں کہیں کہ ہماری خواہشات پردہ نہ ہونے کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ چونکہ قرآن تو پکار پکار کر پردہ کرنے کا حکم دے رہا ہے دیکھو آیۂ کریمہ حجاب تفسیر بیضاوی جزو؟ ہیجدہم سورۂ نور قل للمومنین یغضوا ابصارھم ویحفظوا فروجھم۔ ترجمہ اے محمد صلعم کہدے مومنیں مردوں کو کہ بند کریں آنکھیں اپنی نامحرم عورتوں سے (یعنی نامحرم عورات کو دیدہ دانستہ چھپ کر یا کسی دیگر طریقہ سے دیکھنا ممنوع ہے) اور حفاظت کریں شرمگاہوں

اپنوں کی بدکاری ہی۔(۲) و قل للمومنات یغضضن ابصارھن ویحفظن
فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن
علی جیوبھن ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن تا آخر آیات۔ ترجمہ
اے محمد صلعم کہدے عورات مومنات کو کہ نہ نظر کریں طرف نا محرم مردوں کے
اور محفوظ رکھیں شرمگاہوں اپنی کو بدکاری سے اور نہ ظاہر کریں زینت
اپنی کو مگر آنچہ ظاہر ہو اُن دونوں سے یعنی مُنہ اور ہاتھ اور چاہیے کہ سر سے
پاؤں تک اپنے اوپر چادریں ڈالیں اور نہ آشکارا کریں زینت اپنی کو
نامحرموں پر لیکن واسطے شوہروں اپنے کے وغیرہم۔
اب آیات متذکرۂ بالا میں بہت اختلاف پڑ گیا چونکہ کہیں تو اللہ تعالےٰ
ایک دوسرے سے آنکھیں بند کرنے کا حکم فرماتا ہے اور کسی جگہ دست
و رخساروں کو دیگر بدن سے مستثنےٰ کرکے کھولنے کا حکم دیتا ہے اور سارا دار
مدار ہی مونہہ ہاتھوں پر منحصر ہے دیگر ایک ہی آیات میں دُو دفعہ زینت کو
بیان فرمایا گیا ہے جو خلاف فصاحت و بلاغت ہے حالانکہ کلام الٰہی فصیح و
بلیغ تسلیم شدہ ہے کیا کوئی صاحب عقل تسلیم کرسکتا ہے کہ ایک جگہ تو آنکھیں
بند کرنے کو فرمائے اور پھر دوسری جگہ مُنہ کھولنے کا حکم فرمائے حاشا و کلا۔
جاننا چاہیے کہ و قل للمؤمنات الا ما ظھر منھا آیات ایک ہے
مگر دو جملے ہیں و لا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا میں واو حالیہ
یا بیانیہ ہے اور الا حرف استثنا کا ہے جو باقی بدن سے مُنہ ہاتھوں کو مستثنےٰ
کر رہا ہے۔ اے پردہ اُڑانے کے شائق بھائیو! و بہنو! یہ آیات جنہیں
دیگر بدن سے مُنہ ہاتھ مستثنےٰ کیے گئے ہیں نماز کے واسطے نازل ہوئی
ہے چونکہ نماز میں تمام بدن اور زینت چھپانے کا حکم ہے مگر مُنہ ہاتھ اگر

چھپے ہوئے ہوں تو نماز صحیح نہیں ہے دیگر گھر کی چاردیواری میں محارم کے سامنے بھی ننگے سر اور دیگر جسد کا ننگا رکھنا جائز نہیں ہے اس لیے الا منہ ہاتھوں کو مستثنیٰ کر رہا ہے تاکہ نامحرموں کے سامنے منہ کھولنے کے واسطے نیز دوسری آیات کے سیاق سے بھی صاف ظاہر ہے کہ آیت متذکرہ نماز کے واسطے نازل نہوی ہے اگر یہ آیت نماز کے واسطے نہ ہوتی تو دوسری جگہ اللہ تعالےٰ ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن تا آخر نہ فرماتا کیونکہ پہلے بھی تو ذکر زینت کے چھپانے کا ہوا ہے اور منہ اور ہاتھوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اور پھر دوسری جگہ بھی زینت کے چھپانے کا حکم فرمایا گیا ہے اور پھر یہاں بھی الا حرف استثنا کا ہے جو محارم کو نامحرموں سے مستثنیٰ کر رہا ہے اس صورت میں آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ نہ ظاہر کرو تم زینت اپنی کو نامحرموں پر مگر واسطے محرموں اپنے کے پھر دوسری جگہ فرماتا ہے ملاحظہ ہو تفسیر مذکور جز بست و دوم سورۂ احزاب یا ایھا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المؤمنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذلک ادنی ان یعرفن فلا یؤذین - ترجمہ - اے پیغمبر کہدے تو اپنی ازواج مطہرات و دختران کو اور عورات مومنین کو کہ چادریں ڈالیں اپنے اوپر یہ نزدیک زیادہ ہے تاکہ شناخت کی جائیں غیر مسلم عورتوں و فاحشہ عورتوں سے تاکہ بدمعاش ان کو فاحشہ و آوارہ گرد سمجھکر ایذا پہنچانے کی جرات نکرسکیں عرب کے موجودہ پردہ کی تقلید کرنا مناسب نہیں ہے چونکہ موجودہ عرب کا پردہ نہ شریعت کے شرائط کو پورا کرتا ہے اور نہ مخالفین پردہ کی خواہش پوری کرتا ہے کیونکہ شرع نہ مستورات کو قیدی پردہ کا حکم دیتی ہے اور نہ آوارہ گردی کی اجازت دیتی ہے - عرب کا مروجہ پردہ اسلیے مخالفین

پردہ کی خواہش کو پورا نہیں کرتا کہ عورات عرب اعلےٰ نسب سے بے گراؤنے تک نقاب منھ پر ڈالے رہتی ہیں اور شرع کے شرائط کو اسواسطے پورا نہیں کرتا کہ عرب کی مستورات بعض اوقات بلا اشد ضرورت کے بازاروں میں پھرتی نظر آتی ہیں کیا ہمارے مسلم بھائیوں کی غیرت یہی تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنی مستورات کو ایسی حالت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں کہ وہ نامحرموں کے ساتھ اہل مصر - قاہرہ - بیروت وغیرہ کی عورات کے مانند قہوہ خانوں ہوٹلوں اسٹیجوں سڑکوں پر دست بدست ہوکر ماری ماری پھریں - ہماری دلی دعا ہے خدا وہ وقت نہ لائے کہ ہماری شرمگیں نگاہیں نامحرموں سے چار ہوں بعض بھائی عفت کو عورت کی شرشت میں بتاتے ہیں اور بعض پردہ کے احاطے میں محدود کردیتے ہیں میں یہ کہوں گی کہ عورت کی عفت پردہ میں محفوظ ہے لیکن یہ جاننا چاہیے کہ مرد عورت کے واسطے بے عفت ہونے کا کہیں جواز ثابت نہیں ہے ہمارا موجودہ مروجہ پردہ ہمارے ہندوستان کے واسطے نہایت موزوں ہے ہرگز اسمیں تخفیف نہ کی جائے یعنی ابھی شرعی پردہ کا زمانہ بہت دور ہے اور جب تک کہ ہر دو فریق مہذب نہ ہوں اسوقت تک موجودہ پردہ کو بدستور قائم رکھا جاوے میں یہ پوچھتی ہوں کہ ہمارے بہی خواہ ہم کو بے پردہ کرکے ہم سے کون سا کام لینا چاہتے ہیں کیا وہ ہم سے ریلوے کلسریٹ وغیرہ کی ملازمت کرانا چاہتے ہیں کیا انتظام خانہ داری ہمارے واسطے کچھ کم ہے؟ یا ہمیں بے پردہ کرکے جلسوں یا پارٹیوں میں داخل کرنا چاہتے ہیں کیا قومی جوش یہی رہگیا ہے کہ وہ پارٹیوں میں اپنی قومی بہنوں کو نامحرموں کے پہلو بہ پہلو بیٹھکر غیروں سے سر اجلاس گفتگو کرتے دیکھیں حیف ہے

ایسی قومیت پر۔ ہاں جن بہی خواہ حمایت کنندگان تعلیم نسواں کا یہ خیال ہے کہ پردہ میں بیٹھ کر کما حقہٗ تعلیم حاصل نہیں ہو سکتی، جس تعلیم کی ہمیں ضرورت ہے اور جسکا حکم شرع دیتی ہے وہ ہمیں پردہ میں رہ کر بخوبی حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن میں یہ پوچھتی ہوں کہ ہمارے خیرخواہ ہمیں کونسی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس کے واسطے ہمارا پردہ ہارج ثابت ہو رہا ہے کیا وہ ہمیں بی۔اے کی ڈگریاں پاس کراکے چیف کورٹ کا وکیل بنانا چاہتے ہیں یا جج کی کرسی پر ممتاز فرمانا چاہتے ہیں "العلم فریضة علیٰ کل مسلم ومسلمة ولو با العین۔ اسکا مفہوم یا مطلب یہ نہیں ہے کہ لڑکیوں کو اسکولوں۔کالجوں میں داخل کراکے انگریزی سائنس وغیرہ کی تعلیم دیجائے بلکہ اس حدیث سے وہ تعلیم مراد ہے جسکے واسطے ہمارا پیغمبر مبعوث کیا گیا ہے یعنی اسلامی تعلیم۔ اے میرے محترم بھائیوں اگر تم تعلیم نسواں سے مفاد اٹھانا چاہتے ہو تو پہلے اُن کو اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کروتاکہ اُنکا رجحان طبع اپنے پاک اسلام کی طرف مائل وراغب رہے اور وہ حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ کہلا سکیں۔ نیز یہ بھی لازم ہے کہ لڑکیوں کو تعلیم پورے طور پر کما حقہٗ دی جائے ناقص تعلیم پھر بُرے نتائج پیدا کرتی ہے میں انگریزی تعلیم کی بھی مخالف نہیں ہوں مگر اُسوقت تک جب تک کہ اُنکے دماغ میں اسلامی تعلیم نشو ونما نہ پائے پھر اگر بقدر ضرورت انگریزی تعلیم دی جائے تو چنداں مضر نہیں۔ لیکن پردہ بیچارہ کا قصور معاف کریں یہ کسی کو بخیال مخالفین پردہ اگر فائدہ نہیں پہنچاتا تو نقصان بھی نہیں دیتا۔ اگر میری بعض قومی بہنیں اور بھائی پردہ اُٹھا ہی دینے کے درپے ہیں اور اسی خبط میں وہ بے چین و سرگرداں ہیں تو بسم اللہ چشم مار وشن دل ماشاد"

والدہٗ ممتاز حسین

کیوپڈ و سائک

حضرت نیاز فتحپوری نے نقاد کے آخری پرچہ میں جو خدا کرے آخری نہ ہو اور ملک پر ناقدردانی کا بدنما دھبہ نہ لگائے یہ مضمون شائع کرایا ہے یہ مضمون بہت دلچسپ اور ادبی حیثیت سے بہت کچھ قابل داد ہے۔ گو اسمیں بعض جگہ ایسے جذبات کا اظہار بھی کیا گیا ہے جو ہندوستان کی اخلاق و تہذیب کی میزان میں پورے نہیں اُترتے تاہم ہمارے بعض قابل قدر نامہ نگاروں اور خریداروں کا اصرار ہے کہ اسکو "تمدن" کے فائل میں جگہ دیجائے۔ چنانچہ ہم نومبر اور دسمبر میں اس مضمون کو نقل کرتے ہیں اور اُن حضرات سے تاخیر کی معافی چاہتے ہیں جنکے مضامین دفتر میں وصول ہو چکے ہیں۔ (ایڈیٹر)

میں نے ایکدفعہ تصاویر متحرکہ میں یہ افسانہ دیکھا تھا مجھے نہیں معلوم کہ انگریزی یا یونانی لٹریچر میں اسکو اس شرح و بسط کے ساتھ لکھا گیا ہے یا نہیں۔ بہرحال میں نے اُسے نہیں دیکھا اور خود اپنے جذبات کو جو کچھ بھی اُن تصاویر کے دیکھنے سے پیدا ہوئے قلمبند کر لیا امید ہے کہ وہ حضرات جو ادب لطیف سے دلچسپی رکھتے ہیں اسمیں کہیں کہیں غیر معمولی لطیف تاثرات کا اظہار پائیں گے اور یہی میرا مدعائے سخن ہے۔ نیاز فتحپوری

یونتو یونانیوں کے عہد زریں کا ذرہ ذرہ بجائے خود ایک "حسن آباد" تھا لیکن "سائک" کے شباب نے جس رعنائی حسن کا نمونہ پیش کیا، وہ حقیقتاً "عورت کی دنیا" میں ایک اعجاز تھا۔ حسن کی نسبت بہترین شاعرانہ تخیلات کے زیر اثر ایک مشاق ترین مصور کا قلم بھی صفحۂ کاغذ پر کوئی ایسی تصویر پیش نہیں کر سکتا تھا، جسکو "سائک" کے حسن عالم افروز کے ساتھ کوئی نسبت دیجا سکتی۔ پھر یہ خدا کی شان ہے کہ "کیس" "یونان" کی دو بیٹیاں علاوہ "سائک" کے

اور بھی تھیں، لیکن جب رات کو شاہی باغ کے صحن اور اسکے کنجوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو ہو کر غائب ہو جاتی اور اکثر ایسا ہوتا تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ آج "سائک" باغ میں نقاب اُلٹ اُلٹ کر پھول توڑ رہی ہے۔

اگلارس وکیو پڈس بھی کوئی معمولی حسین لڑکیاں نہ تھیں، اور اگر قدرت کے پاس اک آخری تصویر حُسن و شباب "سائک" اور نہ ہوتی تو اسمیں کلام نہیں کہ اگلارس وکیو پڈس بھی وہ چیز تھیں کہ دنیا انھیں کے لیے ترستی انھیں کے لیے تڑپتی۔ پھر اگر وہ اپنی چھوٹی بہن سے کچھ خوش نہ تھیں، علے الخصوص اسوقت جبکہ اُن کے حُسن کا مہ چار وہ بھی بیداغ تھا، تو کوئی جائے عجب نہیں، لیکن اُن کی شادی ہونے والی تھی، دو حسین نوجوان لڑکے اُنکے لیے منتخب ہو چکے تھے اور اس لیے وہ اپنی تسلی اسی خیال سے کرلیتی تھیں کہ گو "سائک" زیادہ حسین و جمیل سہی لیکن کم از کم ابھی وہ اُن لذات سے تو آشنا نہیں ہو سکتی جن سے ہماری راتیں بہت جلد لبریز ہونے والی ہیں" ــــــــ کیا واقعی "سائک" کی زندگی میں کوئی رات نہ تھی؟ ــــــــ اب رئیس یونان کے پیش نظر صرف یہی ایک فکر تھی جس میں وہ رات دن مستغرق رہتا۔

دنیا کے ہر گوشے سے پیغام آتے خدا جانے کتنے شاہزادوں اور سرداروں کی تصویریں مختلف سلطنتوں سے آئیں، لیکن "سائک" کے لیے کیونکر کوئی منتخب کیا جائے؟ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آتی تھی۔

"سائک" اب کوئی بچہ تو تھی نہیں کہ بُرے بھلے کی اُسے تمیز نہ ہوتی۔ اور یوں آسانی کے ساتھ وہ کسی ایک کے سپرد کر دی جاتی وہ پوری جوان تھی اور اس لیے انتخاب شوہر کی حس جو عورت کی پرشباب زندگی کی تنہا حس ہے، اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی اوّل تو بہت سی تصویریں اُسکے سامنے پیش ہی نہ کیجاتی تھیں اور چند اسکی کنیزوں کے ذریعہ سے پہنچتی بھی تھیں، تو سوا اسکے اور کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ ایکبار تصویر پر نگاہ ڈالتی

لانے والے کو نہایت غور سے سرتا پا دیکھ لیتی! ہاں اُسے اپنے حسن وجمال پر ناز تھا، اپنی جوانی اور بانکپن پر غرور تھا، بارہا ایسا ہوا کہ اُس نے اُن تصویروں کی پشت پر یہ لکھکر واپس کر دیا کہ "اگر یہ انسان ہے تو مجھے انسان کی ضرورت نہیں" مگر اُسے کیا خبر تھی کہ اس فقرے سے اپنی آیندہ زندگی کے لیے ایک سچی پیشین گوئی کرتی تھی۔ وہ بہرحال اسے اچھی طرح محسوس کرتی تھی کہ اُسکے باپ کو کیا فکر لاحق ہے اور اس لیے جب اسے معلوم ہوگیا کہ دنیا کے ہر گوشہ میں اُسکے حُسن کا چرچا ہو رہا ہے تو اُسکی زندگی میں ایک نمایاں فرق ہوگیا۔

وہ کسی شاعر کی تصنیف اُٹھا لیتی اور جذبات حُسن و عشق کے بیان میں یہانتک مستغرق ہو جاتی کہ کتاب اُسکے ہاتھ سے چھوٹ جاتی اور وہ یہی سمجھا کرتی کہ میں اب بھی اُسے دیکھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور سمجھ رہی ہوں۔ بارہا ایسا ہوتا کہ جب وہ کتاب دیکھتے دیکھتے اپنی اُسی حالت انہماک میں کسی پھول کو دیکھنے لگتی تو وہ شرما جاتی اور پھر اُٹھکر ٹہلنے لگتی غرضکہ اُس کی تنہائی کی کوئی گھڑی ایسی نہ تھی، خلوت کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جسے وہ اپنے ہی حُسن کی رنگینی سے معمور نہ پاتی ہو اور اسکا کوئی تخیل ایسا نہ تھا جسکا اختتام حجاب و انفعال پر نہ ہوتا ہو چنانکہ قریب قریب نصف حصہ اُس کے اوقات کا اسی تخیل میں گذرتا تھا یا پھر ایسے کھیلوں میں جنہیں وہ خود کسی کا ڈھونڈھنا اپنے تئیں کسی سے ڈھونڈھا جانا پسند کرتی (یہانتک کہ بعض دفعہ جب کوئی اور نہ ہوتا تو وہ مہندی کی پھول بھلیاں میں گھس جاتی اور اس طرح وہ آپ اپنی تلاش کرتی) اسلیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ستایک نصف عورت تھی اور نصف انفعال و جستجو۔

دن گذر گئے، یہانتک کہ ستایک کا شباب سکر، اور سکر سے سرشاری کی حد تک پہنچ گیا، لیکن اسوقت تک کوئی فیصلہ انتخاب بر کے متعلق نہو سکا چاندنی رات تھی اور چاندنی بھی موسم بہار کی اور موسم بہار بھی پونا کا جسکی زمین کی نسبت فرش گل کا

تخییل ایک ادنیٰ تخئیل ہے سا ایک باغ کے ایک تاریک کنج میں بیٹھی ہوی تھی کیونکہ اب وہ اپنی زندگی سے جسے وہ صرف ایک طویل دن سمجھتی تھی یہاں تک بیزار ہوگئی تھی کہ اکثر تاریک خلوتوں میں وقت صرف کرنا پسند کرتی، مگر وہ دیکھکر کسقدر گھبراتی کہ ہر تاریکی اُسکے لیے روشنی ہے اور اُسکی ہر رات چاندنی،

وہ کنج کے اندر فرش سبزہ پر بیٹھی ہوی پنکھڑیوں کے ڈھیر کو ایک ہاتھ سے منتشر کرتی جاتی تھی اور پتیوں اور نازک شاخوں سے چھن چھن کے آنیوالی کمزور شعاعوں کو دیکھ دیکھ کر گردن اُٹھائے ہوئے اپنے ہی تصنیف کیے ہوے شعر گن گنا رہی تھی اور گن گنا کیا رہی تھی اپنا درد کہہ رہی تھی شکایتیں کر رہی تھی کہ:۔

"اے چاندنی تو تو آسمان کی سا ایک ہے آسمان ہی میں رہ دنیا کو تیری ضرورت نہیں کہ وہ پہلے ہی ایک سا ایک سے بیزار ہے اگر تجھے بھی کسی کی تلاش ہے تو مایوس ہو جا، کیونکہ زمین جسمیں اب مرد کی جنس پیدا ہونا بند ہوگئی ہے سنسان ہے لیکن نہیں تو مجھے اپنا پتہ بتا، تو تو روز یہاں آکر ڈھونڈھ جاتی ہے، میں بھی تیرا ملک دیکھوں گی۔ شاید میری راتیں وہیں چھپی ہوں "

"چراغ کی طرف پتنگا بیتابانہ آتا ہے، میں اُسے پکڑ لیتی ہوں اور گھنٹوں دیکھا کرتی ہوں میں کوشش کرتی ہوں کہ کلی پر بیٹھنے سے پہلے ہی بھونرے کو گرفتار کر لوں، تو ہنسے گی کہ میں نے اپنے مکان سے شمعیں اُٹھوا دیں، اپنے باغ سے کلیاں نکلوا دیں دیعنی) جب شمع نہ ہوگی تو پتنگے کیا کرینگے، کلیاں نہوں گی تو بھونرے کہاں جائیں گے، لیکن اے چاندنی میں تجھے یقین دلاتی ہوں کہ اگر رات کو میری اُنگلیوں کے سرے چراغ کی جوت ہیں تو دن کو وہ چمپا کی کلیاں ہیں۔ مگر آہ، میری تو گردن جسپر ہر نوکی گردنیں فدا ہیں ڈھلی جاتی ہے آنکھ جسپر جنگلی کالا ہرنی آنکھیں جان دیتی ہیں سونا چاہتی ہے اور میرا وہ چہرہ جسپر اے چاندنی ہر نقاب تیرا ہی ایک ٹکڑا نظر آتا ہے مضمحل و افسردہ ہے کیونکہ دنیا میں

کوئی مصور ایسا نہیں جو میرے بعد میری یادگارِ حُسن کو قائم رکھے کوئی شاعر ایسا نہیں جو میری تمناؤں کو لکھ سکے اور کوئی مغنی ایسا نہیں جس کے بربط کے تار میری تعریف میں پوری طرح کانپ سکیں۔ بہرا ے آسمان کی اچھی سائیک تو ہی بتا کہ، ایسا شخص جو نور کی تصویر بنا سکے جو سمندر کے طوفان کو لکھ سکے اور جو نکہت کو گا سکے کہاں ملیگا؟

سائیک جیسی حسین وجمیل تھی، ویسی ہی لطیف الخیال شاعرہ، اور نازک دست مصورہ بھی تھی اور اسلیے وہ اسی بات کی خواہشمند تھی کہ اُسکی زندگی کا ہمدم بھی ایسا ہی حسین، اسی درجہ کا شاعرانہ مزاج رکھنے والا اور ویسا ہی بےمثل نقاش ہو۔

وہ دیر تک اپنے بنائے ہوئے گیت گاتی رہی اور بربط اُٹھا کر بجایا کی، یہانتک کہ وہ کچھ تھک سی گئی اور ایک آخری ضرب کے ساتھ جس سے تار دیر تک گونجا کیے اُس نے بربط کو پھینکدیا اُس نے چاندنی میں ایک جمائی لی، ایک انگڑائی لی اور وہیں لیٹ گئی۔

وہ سونا چاہتی تھی، یعنے اُسکی شرابی آنکھیں جو یوں بھی ہمیشہ نیم خواب رہتی تھیں اب بالکل غافل ہو جانا چاہتی تھیں ـــــ اور غافل ہوگئیں ـــــ اب ساری فضا سو رہی تھی، آسمان و زمین سو رہے تھے، وہ شاہراہ زریں جس پر چاند کی شعاعیں اک مستقل خاموشی کے ساتھ چڑھ اُتر رہی تھیں سو رہی تھی مگر آہ، سکوتِ خواب تو اُس خوش نصیب کُنج کا تھا جو بیہوش سائیک کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے سو رہا تھا ـــــ آہ نیچر اس حالت کو گھنٹوں تک دیکھتا رہا!

پایان کار چڑیوں کی شیریں موسیقی شروع ہوگئی، یعنی صبح جاگی، ہر شاخ پھول ہی پھول ہوگئی، یعنی کلیاں جاگ اُٹھیں اور سائیک نے بھی آنکھیں کھولدیں یعنی کُنج بھی اپنے تبسم آباد میں جاگ اُٹھا۔

وہ یہاں حقیقتاً سونے نہیں آئی تھی اور نہ اُسے یہ گمان تھا کہ وہ اسقدر جلد یہاں

سو جائے گی اور اگر سو جائے گی تو اتنی دیر تک سوتی رہے گی، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اُسکی نزاکت موسیقی کا بار نہ اُٹھا سکی کیونکہ اسکے ہر اُتار چڑھاؤ میں گویا اُسکا شباب صرف ہو رہا تھا، گیت کے بول اُسکو بہت جلد خستہ کر دینے والے ثابت ہوئے، کیونکہ وہ حقیقتاً اُسکے حسیات لطیف نغمے جو اُسکی عمق روح سے نکل رہے تھے۔ چنانچہ وہ سو گئی اور انھیں تمناؤں، شکایتوں اور بیزاریوں کو لیے ہوئے سوئی جو اُسکے اجزائے روح تھے ہیں نہیں معلوم کہ اُسکی پیاری پیاری آنکھوں نے بند ہونے پر کیا دیکھا، مگر ہاں جب اُٹھی تو اُسکے اعضا دکھ رہے تھے اس کا سارا بدن خستہ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اُلٹ کر اپنی کافوری پیشانی کو چھوا اور پھر اپنے گورے گورے بازوؤں کو اپنے ہاتھ سے ایک آدھ دفعہ مروڑ کر اپنے منتشر بالوں کو سمیٹتی ہوئی اُٹھنے کو تیار ہوئی اور فوراً کنج سے نکلکر آہستہ آہستہ روشوں پر چلنے لگی۔

چھریرا بدن ہو اور لوچدار کمر تو رفتار میں لچک کا پیدا ہونا ضروری ہے لیکن اگر رفتار کا لوچ صرف نزاکت کمر ہی کا تخیل نہیں بلکہ کوئی مستقل چیز ہے اگر سبک خرامی صرف کشیدہ قامتی کی صفت لازم نہیں بلکہ کوئی جدا حُسن ہے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ سوائے سایک کی چال کے اور کسکی چال کی تعریف کرنی چاہیے۔ نغمہ کا کوئی نقش نہیں مگر ہوا اس سے معمور ہے۔ کبنبھیری اُڑ کر نکل گئی مگر اُسکا رقص خرام اب بھی نگاہوں میں تھرتھرا رہا ہے۔ سایک کنجوں میں غائب ہو گئی لیکن اُسکی رفتار کا ارتعاش اب بھی روح میں ملا ہوا ہے۔

وہ دبے پاؤں اپنی خوابگاہ میں پہنچی اور جس دروازہ کو کھولکر وہ بغیر کسی کے علم کے رات کو باہر نکل آئی تھی اُسی میں پھر داخل ہوئی اور اپنی سیج پر گر پڑی، اُسنے سمجھا کہ بدن کا درد، اعضا کی دکھن عدم آسودگیِ خواب کی وجہ سے ہے اور اس لیے اُس نے چاہا کہ میں پھر سو جاؤں، لیکن وہ ابھی کروٹیں ہی لے رہی تھی کہ نسرین جو

سائیک کی محبوب مطربہ تھی اپنا زریں بربط لیے ہوئے آئی اور بائیں کی طرف فرش پر بیٹھ گئی اُس نے بربط کی طربیں اپنی نازک اُنگلیوں سے درست کیں اور یہ دیکھکر کہ شاہزادی سائیک کی رات شاید کرب میں گذری اور وہ ابھی سونا چاہتی ہے اُس نے یہ افسونِ خواب نہایت نرم و شیریں لہجے میں گانا شروع کیا :-

"اے نیند آ، اور گھنی پلکوں کو پھر ملا دے کہ ابھی اُن میں کچھ نشہ باقی ہے۔ اے نیند آ، اور آنکھوں کو پھر بند کر دے کہ ابھی اُن میں کچھ خمار ہے۔ والیِ یونان کی بیٹی فشردۂ انگور سے بے نیاز ہے دن کو نہیں مگر ہاں جب رات ہو جائے تو دیکھ کہ اسکا شباب ایک شراب ہے۔ میں نے تو چاندنی راتوں میں صحنِ باغ کے اندر اُسے ٹہلتے دیکھا ہے اور اگر کسی رات کو وہ مجھ سے چھپکر چلی گئی ہے تو صبح کو میں نے روشوں پر سے اُسکے نشاناتِ قدم اپنے ہاتھ سے مٹائے ہیں کہ کوئی اُسکی لغزشِ رفتار کو نہ پہچان سکے اے نیند آ جا کہ ابھی سورج کی کرنیں تو ارغوانی بھی نہیں ہوئیں۔ سائیک کروٹیں لے رہی ہے، اُسکا بدن شاید دُکھ رہا ہے۔ آ کہ ابھی رات کی شراب اچھی طرح آسودہ ——"

"نسرین، خاموش۔ اس افسونِ خواب کو ختم کر میرا جی گھبراتا ہے" ——— اب سائیک اُٹھ بیٹھی تھی اور پیشانی پر ایک نازک شکن، ایک ہلکی سی موج بلوریں ڈالے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ آخرکار اُس نے نسرین کے ہاتھ سے بربط لے لیا، اور یونہی بغیر کسی نظام و اصول کے تاروں پر اپنی اُنگلیاں آہستہ آہستہ چلانے لگی نسرین خاموش مؤدب کھڑی ہوئی سائیک کی اس خلافِ معمول بدمزگی سے ڈر رہی تھی یہ حالت اتنی دیر تک قائم رہی کہ آفتاب اچھی طرح نکل آیا اور تمام کنیزیں تعمیلِ احکام اور ضروریاتِ صباحی کے متعلق اپنے اپنے فرائض ادا کرنے حاضر ہو گئیں۔ سائیک نے اُن میں سے دو کنیزوں کو غور سے دیکھا اور وہ سرِ گردن جھکا کر اُلٹے پاؤں واپس چلی گئیں۔ اُسکے بعد حکمِ نگاہ سے دُو اور چلی گئیں اور باقی کنیزیں بھی رخصت کر دی گئیں۔

نسرین کو قریب بلا کر سانیک نے اُسکے شانہ پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ:-

"اے نسرین، آج تو ایسی بات اپنے منھ سے نہ نکال، جسپر کل تجھے افسوس کرنا پڑے تیرے نغموں نے ہمیشہ میری روح کو مسرت پہنچائی، لیکن اس وقت سے ڈر جب مجھے اُنسے تکلیف پیدا ہونے لگے۔ اب تو، تو کچھ ایسی باتیں کر ایسے گیت گا کہ میرے بھولے ہوئے دن پھر میرے سامنے آجائیں، مجھے سُلانا چاہتی ہے تو میری اُن راتوں کا ذکر نہ کر جنمیں میں دیوانہ وار پھرتی رہتی ہوں بلکہ تو مجھے وہ لوریاں سُنا کہ میں پھر ایک بار بچہ ہو جاؤں اور اپنی اس زندگی کو بھول جاؤں جس کا بار میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ اگر میری پلکیں نشہ آلود اور میری آنکھیں خمار آگین ہیں تو کیا؟ اگر وادی یونان کی بیٹی کا شباب عروج صہبا ہے تو کیا؟ کیونکہ اُسے خود نہیں معلوم کہ اُسمیں کیا لذت پنہاں ہے میری زندگی تو ایک ایسی صدا ہے جو صحرا کی وسعت میں گم ہو جائے حالانکہ آواز وہی جو وادیوں سے ٹکرائے اور جواب پائے، زندگی وہی جسکی لذت کا علم کسی دوسرے کی لذت سے وابستہ ہو۔ پھول اگر اپنی نکہت سے مست ہو سکتا ہے، اگر کلی اپنی رعنائی پر فریفتہ ہو سکتی ہے تو ہزار دفعہ وہی گا جو ابھی تو نے گایا، ورنہ اپنے بربط کے تار توڑ ڈال، طربیں اُتار دے نغموں کو بھولجا، اور اپنا ساز کسی کونہ میں پھینک کر آ اور میرے ساتھ کراہ..........."

قبل اسکے کہ سانیک اپنی گفتگو ختم کرتی وہی دونوں کنیزیں جنکو سب سے پہلے کوئی حکم سا گیا تھا آئیں اور سانیک نسرین کو مبہوت و متحیر چھوڑ کر اُن کے ساتھ چلدی۔

ٹھیک دو پہر کو ریمادہ غسل سے فارغ ہو کر حمام سے نکلی اور نگاہ کی طرح آئینہ خانہ میں داخل ہو گئی۔ آج اُسکی سترھویں سالگرہ تھی اور اُسے حسب رواج دربار میں شریک ہونا تھا۔ ملک کے تمام شعرا، سلطنتوں کے شہزادے سفیر، منشی، سبھی موجود تھے اور دربار میں سانیک کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ شام کو سانیک کتان کی آسمانی رنگ کی چادر میں اپنا چاند سا بدن چھپائے اُسی رنگ کا ایک [illegible]

ڈالے برآمد ہوئی، اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی ۔

اسکے بعد رسم نذر شروع ہوئی ۔ ہر شخص جو بڑھتا تھا اُسکے ایک ہاتھ میں گندھے اور بلا گندھے ہار ہوتے تھے اور دوسرے ہاتھ میں وہ چیز جو نذر کے لیے تھی پہلے اُسکے قدموں پر پھول ڈالے جاتے تھے اور پھر نذر پیش کیجاتی تھی چنانچہ تھوڑی دیر میں سایک کے قدموں پر پھولوں، معدنوں کی بہترین پیداوار اور صناعت انسانی کے نازک ترین ہدایا کا انبار لگ گیا ۔ شعرا نے اپنے قصاید شروع کیے مغنیوں نے ساز چھیڑے یہانتک کہ اختتام دربار کا وقت قریب آگیا جسکے لیے ہر شخص بیتاب و بیقرار تھا اور جس لمحہ کے لیے یہ سارے تکلفات تمہیدی برداشت کیے گئے تھے ۔

یہ دستور تھا کہ جب دربار سالگرہ ختم ہوجاتا تھا تو اُن ہدایا کی اظہار پسندیدگی میں سایک کو ایک لمحہ کے لیے اپنا چہرہ بے نقاب کرنا پڑتا تھا اور غالباً اسی برق پاشی ادا کا یہ اثر تھا کہ ساری دنیا میں سایک کی غائبانہ پرستش ہونے لگی تھی ۔ سنا ہے کہ جس وقت سایک پوری بارہ برس کی ہوگئی اور اوّل اوّل دربار میں نقاب پوش ہو کر آئی تو اسقدر ہجوم نہ تھا لیکن اسکے بعد ہر سال لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا یہانتک کہ جب پانزدہ سالہ سایک کی سالگرہ ہوئی تو تمام اقطاع عالم میں اُسکے حُسن کی آگ مشتعل ہو چکی تھی چنانچہ اس سال جبکہ اُسکی جوانی پورے سترہ سال کی تھی اتنی تعداد میں زائرین جمع ہوئے کہ شاید سرزمین یونان نے اس سے قبل اتنے پروانوں کا ایسا ہجوم کبھی نہ دیکھا ہوگا ۔

الغرض وہ ساعت آئی اور نقیبوں نے اپنی آوازوں سے گویا لوگوں کو آگاہ کردیا کہ

رضا دہید بتاراج ہوش اے یاراں

کہ بزم یار رہا آید نقاب بکشودہ

سینوں میں جو ہنگامہ بھی ہو لیکن یوں تو سکوت انتظار کا وہ عالم تھا کہ لب باہم متصل ہوکر رہ گئے تھے اور آنکھوں نے جھپکنا ترک کردیا تھا ۔

آخر کار سا ایک اُٹھی اور اپنی بلوریں نازک انگلیوں سے نقاب کے دونوں سرے پکڑ کے ایک جھٹکے سے سر کے اوپر کر لیے اور اپنے سحر حُسن سے سب کو کم از کم ایک گھنٹہ کے لیے پتھر کا بنا کر چلدی۔

(۲)

اگر وینس (زہرہ) کو اپنے حسن و جمال پر ناز تھا تو کچھ بیجا نہ تھا، کیونکہ سارا آسمان اور تمام آسمان والے اس بات کو مان چکے تھے کہ وینس سا حسین ہونا گویا خدا ہوتا ہے اور معلوم نہیں یونان والوں کو یہ آسمانی عقیدہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ اُنھوں نے بھی وینس کو دیوی مان کر اُسکی پرستش شروع کر دی۔ بت تراشوں نے اُسکے مجسمے تیار کیے، مصوروں نے اُسکی تصویریں بنائیں شعرا نے اسکے حُسن کی تعریف میں قصائد کہے اور مغنیوں نے اُسکے ترانہائے جمال سے دنیا کے بسنے والوں کو خوب گرمایا۔ مگر یہ پرستارانِ حُسن (واللہ ان قدیم باشندگانِ یونان پر نزول رحمت کرے) اس سے بھی زیادہ وسیع جذبات رکھتے تھے اور اس لیے آخر کار اُنھیں مُنھ کے بل اُسکے سامنے گر کر کہنا پڑا کہ:۔

"اے ملکۂ حُسن تیرے مجسمے باوصف اسکے کہ صنعت کا نازک ترین لوچ ان میں صرف ہوا ہے بھدّے ہیں تیری تصویریں باوصف اسکے کہ ملک کے بہترین نقاشوں کے دماغوں نے اپنی بہت سی راتیں اُنکی تیاری میں جاگ کر کاٹ دی ہیں نادرست ہیں ہمارے قصائد جنمیں حُسن کی نسبت لطیف ترین تخیلات پیش نظر رکھکر تیری تعریف کی گئی ہے نامکمل ہیں خود ہمارے راگ جنکو ہم بہترین سازوں کے ذریعہ سے اک ترانۂ عبودیت کی صورت میں تیرے آستانۂ جمال تک پہنچانا چاہتے ہیں کمزور و ناقص ہیں پھر اے تو وہ کہ حسن سے بھی بلند کوئی چیز ہے تُو اے تو وہ کہ ہمارے خیال تجھ پر مقابلہ سامنے اک مرغ پر شکستہ سے زیادہ نہیں ہمیں یہ نہ بتا کہ تو کون ہے۔ تو جو بھی ہے ہمیں یہ دکھا کہ تو کہاں ہے اور کیسی ہے"

یہ تھے دنیا کے خیالات وینس کے حُسن کی نسبت اور یہ تھا عالم کی فتادگی کا حال وہ زہرہ جو آج سے ہزاروں سال پیشتر یونانیوں کے سر پہ آسمان میں چمکتی تھی آج بھی شاید اُسی انداز سے درخشاں ہے لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اُسے حُسن کی دیوی سمجھ کر اُسکی پرستش کرتے تھے اور ہم اُسے ایک کرۂ غیر آباد یقین کر کے اُسکی پرواہ بھی نہیں کرتے (علم و دانش بھی کسقدر رہا دم لذات ہے !)

یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی زمانہ میں آباد رہا ہو اور وینس وہاں کی ملکہ ہو اور اگر نہیں ہو سکتا تو بھی ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ اسوقت اُس ملک کی حکمران ایک نہایت ہی حسین و جمیل عورت تھی جو ہر چند طبقۂ انسان سے نہ تھی مگر طبقۂ انسان میں اسکا ذکر ضرور تھا اور اُس نے آسمان میں وہی زمانہ پایا تھا جو ہمنے زمین میں۔

اسی زمانہ میں ایک دن کا واقعہ ہے (ہم دن کہتے ہیں مگر ہمیں نہیں معلوم کہ اس ملک میں دن رات کا کوئی مفہوم تھا بھی یا نہیں۔) بہرحال ایک جزو زمانہ کا واقعہ ہے۔ وینس اپنے کاشانۂ بلوریں میں بیٹھی ہوئی کنیزوں کا تماشۂ غسل دیکھ رہی تھی اور نہایت مسرور تھی۔ ایک بلوریں حوض جسکی زمیں اور کنارے صیقل کیے ہوئے آئینہ کی طرح نہایت شفاف پانی سے لبریز تھا اور ان میں کنیزیں پریاں برہنہ نہا رہی تھیں اور ایک دوسرے کو چھیڑ رہی تھیں۔ چونکہ وینس خود سمندر کے کف سے پیدا ہوئی تھی اسلیے وہ فطرتاً عریانی پسند تھی اور اُسکے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ یہ بھی تھا۔ غرضکہ اسیوقت جبکہ وہ اپنی نوجوان کنیزوں کی اس عبد وجد کا تماشہ دیکھ رہی تھی ایک کنیز نے کسی کے آنے کی اطلاع دی اور وینس اُٹھکر باہر چلی گئی۔

اروٹس شہوت کی دیوی جو اس سے قبل کئی بار کرۂ ارض کا سفر کر چکی تھی اور وینس کی بہت معتقد رہا یوں میں تھی وینس سے ملنے آئی تھی۔ وینس پہنچی اور نہایت تپاک سے اُسکی پذیرائی کر کے اسکی نئی سیاحت دنیا کے متعلق سوال کرنے لگی

لیکن اروتش نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے وینس میرے حالات سفر کے تمام جزئیات سے آگاہ ہونے کی خواہش نہ کر کیونکہ ممکن ہے کوئی بات اس میں تیرے لیے باعث اضمحلال و افسردگی ہو"

وینس نے متحیر ہو کر کہا کہ "اے اروتش آخر وہ کونسی بات ابھی بار تو دیکھ آئی ہے جو وینس کو تکلیف پہنچانے والی ہوگی مجھے یقین ہے کہ تو نے کرۂ ارض کے ان ذلیل باشندوں میں جنکو اگر ہوا نہ سنبھالے تو منہ کے بل زمین پر گر پڑیں، کوئی بات ایسی نہ پائی ہوگی جسکو سنکر وینس جلے۔ کیا تو نے اس سے قبل وہاں کے حالات مجھ سے نہیں کہے اور میں یہ سنکر ہنستے ہنستے بیتاب نہیں ہو گئی کہ انسان اپنے جسم کو ناخنوں سے جانوروں کی طرح کھجاتا ہے اور جب کھجاتا ہے تو اس کے جسم پر مٹی کی لکیریں بن جاتی ہیں۔ اے اروتش کہہ اور نہایت آزادی سے کہہ جو کچھ تو نے دیکھا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ آج تو اپنی ملکہ سے کچھ مذاق کرنا چاہتی ہے"

اروتش جو نہایت ہی متین و سنجیدہ دیوی تھی یہ سنکر کچھ چین بجبیں ہوئی اور بولی کہ "اے وینس مانا کہ کرۂ ارض کثیف ہے اور وہاں کے رہنے والے جنکی تخمیر کا جزو اعظم خاک ہے، ذلیل ہیں لیکن اسکو کیا کیا جائے کہ اسی کرۂ ارض میں ایک ملک یونان بھی ہے جس کا ذکر میں تجھ سے نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن جب تو نہیں مانتی اور سمجھتی ہے کہ میں مذاق کر رہی ہوں تو سن، میں بتاتی ہوں اور مذاق کرتی ہوں کہ والی یونان کی چھوٹی بیٹی جس کا نام سائیک ہے ایسی حسین ہے کہ اگر اسکی خاک پا مل جائے تو وینس کو چاہیے کہ اسکا غازہ بنائے اور فخر کرے کل اسکی سالگرہ کا دن تھا اور میں بھی اس تقریب میں شریک تھی لیکن اے وینس یقین کر جو وقت اتنی دیر سے وینس کو بے نقاب دیکھ رہی ہوں اور حسن نے اس سے قبل ہزاروں رشد کیا ہے اس ایک لمحہ کی تاب نہیں لا سکتی جب سائیک نے

تمام عمر کے لیے اپنے نقاب سے بے نیاز ہو جاتی، لیکن اُسکا حسن تو رفتہ رفتہ حیات کو دنیا سے اُٹھانا چاہتا تھا اور لوگوں کی روح کو بتدریج گھلا گھلا کر فنا کرنے کا خواہشمند تھا وہاں سے اب یہ خیال اُٹھتا جاتا تھا کہ سایک واقعی نوعِ انسان میں سے ہے اور یہ خواہش کہ کم از کم ایک ہی رات ایک ہی ساعت ایک ہی لمحہ اسکے حسن و شباب میں شامل ہونے کے لیے میسر ہو جائے، آہ، یہ خواہش تو اک ایسا خطرۂ قلب تھا جو اب کفر میں داخل تھا کیونکہ اسکے حسن نے اب لوگوں کے دلوں میں ایک عجیب و غریب عظمت کی صورت اختیار کر لی تھی اور اُسکے ساتھ محبت کرنے کا مفہوم سوائے اسکے اور کچھ نہ رہ گیا تھا کہ دنیا اُسکی پرستش کرنے لگے عالم اُسے پوجنے لگے سایک کا نام لیا جائے، تو لوگ مسجدوں میں گر پڑیں تو جب اسکا واسطہ دلایا جائے تو قزاق رحم کرنے لگے قاتل کی تلوار جہاں تک اُٹھ چکی ہے وہیں رہ جائے اور دنیا میں صرف وہی عہد و پیماں قابلِ اعتبار سمجھا جائے جو سایک کی قسم پر قائم ہو۔ غرضکہ رئیسِ یونان کو اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ اب سایک کی شادی ہونی بہت دشوار ہے، کیونکہ اگر کوئی شوہر منتخب بھی کیا جاتا تو اُسکو یہ خبر کیونکر پہنچائی جاتی کہ وہ سایک کا شوہر ہونے والا ہے اور اگر پہنچائی بھی جاتی تو یہ یقین کس طرح ہوتا کہ وہ یہ سننے کے بعد پھر زندہ بھی رہ سکے گا اول تو کوئی شخص ایسا نظر ہی نہ آتا تھا جو حقیقتاً سایک کی خلوتوں میں موزوں ہمدم سمجھا جاتا اور اگر کوئی ہوتا بھی تو یہ امر بالکل یقینی تھا کہ سایک کے حسن کی برداشت اسکے امکان سے باہر ہے۔ بہرحال اس سترھویں سالگرہ کی تقریب میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاید کوئی انتخاب ہو سکے گا، لیکن افسوس ہے کہ اسمیں بھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی سالگرہ کے ٹھیک دوسرے دن شام کو سایک اپنے باغ میں حوض پر بیٹھی ہوئی تھی اور رنگین مچھلیوں کی بیقراری کا تماشہ پانی کے اندر دیکھ رہی تھی ... چند لمحوں سے پہلے یہ بات کو بھول گئی تھی کہ وہ ہی سایک ہے جسکی رسمِ سالگرہ ابھی ... ختم ہوئی ہے اور وہ ... بھی اپنے شباب کو ... تھی

مجبوری میں بسر کرنے پر مجبور ہے۔ ورنہ دربار سے واپس آنے کے بعد ایک دن تک اسکی افسردگی کا یہ عالم تھا کہ دنیا کی تمام تفریحیں اُسے بے معنی نظر آتی تھیں اور مسرت کا وجود بالکل مفقود۔ وہ سمجھتی تھی کہ عورت ہونا اور اک ذرا حسین ہونا ایک ایسا قہر ہے جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں اُس نے کھانا نہیں کھایا کیونکہ غذا تو بقائے حیات کے لیے ہے اور وہ سمجھتی تھی کہ شاید عورت کا شباب عورت کی حیات سے جدا کوئی چیز ہے، بالوں میں شانہ کراتے کراتے جی اُلجھا تو اُٹھ بیٹھی کہ آخر کیوں؟ آئینہ دیکھا تو منہ پھیر لیا کہ سنا ایک جہاں کہیں بھی ہے مغموم و نامراد ہے، پھولوں کے ہار یونہی رکھے رکھے سوکھ گئے اور اُس نے نہیں پہنے کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ شاید گجرے کوئی اپنے لیے نہیں پہنتا، اس لیے گردن میں نہیں ہوتے کہ انکی نکہت کو صرف ہوا اُڑائے لیے پھرے پھر اُن سے یہ مقصد نہیں کہ وہ ایک افسردہ سینہ کے اوپر پڑے پڑے سوکھ جائیں، بلکہ شاید اُن سے مدعا یہ ہے کہ کوئی دوسرا انکی خوشبو سے بیقرار ہونے والا ہو اور انکی جنبش اک دھڑکتے ہوئے دل کی جانب اس بیقراری کا جواب دینے والی ہو ورنہ یونہی تو افسردہ سینہ اک مزار ہے اور مزار پر چڑھائے ہوئے پھول کیا! اُس نے گانے میں دلچسپی نہیں لی کیونکہ لحن میں وہ کچھ نقصان محسوس کرتی تھی، سازوں کی نسبت اُسے یہ گمان ہوتا تھا کہ شاید تاروں میں کسی تار کی کمی ہے اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ اُسکی سمجھ میں یہ بات کسی طرح آتی ہی نہ تھی کہ اگر موسیقی ایک لذت ہے تو خدایا یہ کیسی لذت ہے کہ سینہ پھٹا جاتا ہے اگر گانا سکون ہے تو یارب یہ کیسا سکون ہے جو تڑپائے دیتا ہے۔ غرضکہ اپنے سارے محبوب مشاغل اُسنے ترک کر دیے کیونکہ ان میں سے کوئی اُسکے حسیات شباب کا جواب دینے والا نہ تھا وہ راحتوں اور عشرتوں سے اب بیزار تھی وہ اپنی گوری گوری کلائیاں دیکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی مضبوط ہاتھ انھیں پکڑے اور پھر نہ چھوڑے، وہ نازک کمر وہ ایک مٹھی میں بھر کے آجانے والی کمر، چاہتی تھی۔ ....

وہ چاہتی تھی کہ نزاکت و دوشیزگی کا کوئی ....
اسکا وہ غرورِ حسن باقی نہیں رہا تھا کہ شاہزادوں کی تصویریں دیکھ دیکھ کر منہ پھیر لیتی
تھی اب تو وہ باغ میں طاؤس کو بھی مستی کے عالم میں دُم پھیلائے ہوئے دیکھتی تھی تو بے
.... اور ہنس کو گردن اُٹھائے اور سینہ نکالے ہوئے پانی
میں دیکھتی تھی ....

...... حقیقت یہ ہے کہ اُسکی اول تمکنت نے معاملہ کی صورت کو ایسا اہم بنا دیا
تھا کہ اب چارۂ کار سوائے اسکے اور کچھ نہ تھا کہ وہ صرف ایک دیوی ہی کی زندگی بسر کرے
مگر آہ، کسے خبر تھی کہ وہ دیوی جس کو دنیا اسقدر معصوم جانتی ہے کن کن گناہوں کی
آرزو اپنے دل میں لیے ہوئے ہے۔

بہرحال، وہ اس وقت حوض پر بیٹھی ہوئی تھی اور نسبتاً کچھ مسرور نظر آتی تھی کنیزیں
پھولوں کے پنکھے لیے ہوئے اُسے ہوا پہنچا رہی تھیں اور سامنے دوسرے کنارے پر
نسرین حسب معمول اپنا سرود لیے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی کہ سائیک دفعتہً چونک پڑی اور
نسرین کی طرف خطاب کر کے کہا کہ "یہ تو کیا گنگنائی پھر کہہ اور ذرا آواز سے کہہ، ساز سے
اور گا کہ اسوقت مجھے کچھ لطف آیا"

نسرین جو سائیک کی افسردگی سے بہت فکرمند تھی خوش ہو گئی۔ اور اُسنے نہایت
ہی غیر بس لہجہ میں گانا شروع کیا:۔

"وہ دن جب میں ایک مغموم خلوت خانے میں منہ لپیٹے پڑی رہتی تھی، گئے، وہ راتیں جب
ہَں سنسان کنجوں میں تنہا پڑی کراہا کرتی تھی، گذر گئیں، اب تو جی چاہتا ہے کہ پھر وہی چاندنی
ہو اور وہی بے نقاب چہرہ صبحیں آزردہ تھیں کہ میرا آفتاب سا چہرہ انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوتا تھا
شامیں افسردہ تھیں کہ میری زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو سے وہ محروم تھیں، راتیں کبیدہ
تھیں کہ میرے نغمے نے انھیں عرصے سے روشن نہ کیا تھا لیکن اب میرے صبح اپنا دامن

اور کرنوں کو جمع کرلے کہ میں پھر بے نقاب ہوتی ہوں۔ اے شام اپنے تئیں خوب بسالے کہ میرے بال تیرے اندر کھلے ہوئے ہیں اور اے رات بیدار ہو جا کہ آج پھر میری نازک انگلیوں میں تاروں کی لرزش سے گدگدی سی پیدا ہو رہی ہے میری آنکھیں اگر جادو ہیں تو وہ جادو ہی رہیں گی، انھیں مسحور ہونا نہیں آتا۔ میرا حُسن اگر دیوتا ہے تو ہمیشہ اُسکی پرستش ہی کی جائے گی وہ خود کسی کا پرستار کیوں ہو۔ دنیا اگر میرے لیے تڑپتی ہی ہے تو تڑپے میں کسی کے لیے کیوں تڑپوں۔ میری رعنائی اک مستقل استغنا ہے اور تمام دُنیا کی حیات اُسکے ایک جلوہ گریزپا کا ادنیٰ خراج ہے

سائیک یہ سُنکر جوش میں آگئی اور اک عجیب شاہانہ انداز سے کھڑی ہو کر ٹہلنے لگی۔ سیاہ ریشمی چادر جو اسکی گداز رانوں سے لپٹی ہوئی اور کمر کی نزاکت کو اور نمایاں کرتی سر تک پہنچ گئی تھی ڈھلک گئی، شانے کھل گئے، بیاض گردن سینے کی عریانی سے ملگئی سیاہ ریشمی بال پیٹھ پر گھوم گھوم کر رہ گئے، کھنچی ہوئی ابروئیں اور تن گئیں۔ مست آنکھیں اور متوالی ہوگئیں

ٹھیک یہی وقت تھا اور یہی عالم

کہ کیوپڈ تیر و کمان سنبھالے کنجوں میں سے نکلا اور اس ارادہ سے نکلا کہ آج اپنا ترکش سائیک پر خالی کردے گا۔ لیکن نشانہ کو پیش نظر رکھنے کے لیے کیوپڈ نے نگاہ بھر کے سائیک کو دیکھا ہی تھا کہ چٹکی ڈھیلی پڑگئی، تیر گر پڑا کمان ہاتھ سے چھوٹ پڑی، چلّہ اُتر گیا اور کیوپڈ غش کھا کر زمین پر آ رہا۔

کاش اسوقت کوئی سائیک کو بتا دیتا کہ جس محبت کی اُسکو جستجو تھی وہ اب خود اُسکی متلاشی ہے، جس عشق کی اسے تمنا تھی وہ خود اب اسکا تمنائی ہے، صیاد خود اُس کا شکار ہے، عشق خود اُسکا دیوانہ ہے۔ اور تیر خود اُسکی نگاہ کا زخمی ہے۔ اے کیوپڈ تو نے لاکھوں دلوں پر تیر چلائے ہونگے، خدا معلوم کتنے سینہ تو نے مجروح کیے ہونگے، لیکن وہ تیر جو حُسن کے ترکش میں ہیں وہ ناوک انداز یاں جو صرف ایک حسین کی دوشیزگی کا

حصہ میں تیری ناوک فگنی سے کہیں زیادہ تباہ کن ہیں۔جا، تیز تیر اب صرف اک شہپر ہے بازو سے جدا، تیری کمان صرف اک غمیازہ ہے بے مزہ، جو کچھ ہونا تھا ہو گیا، اب اُس کا کوئی علاج نہیں فرشتوں نے صحائف میں لکھ لیا ہو رو ں بنے اپنے کانوں میں معلوم کر لیا کہ۔

"وینس کا بیٹا سائیک کے باغ میں بیہوش پڑا ہے"

(۴)

وینس کو یقین تھا اور ایک وینس کیا جو بھی کیوپڈ کی بے پناہ ناوک اندازیوں کا حال سُن چکا ہے سوائے اسکے اور کیا سمجھ سکتا ہے کہ ایک سائیک کیا اگر ویسی ہزار ہوں تو وہ اپنی چٹکی کی ادنیٰ جنبش سے اُن کے دلوں کو ہزار ٹکڑے کر سکتا ہے! مگر فطرت کے پاس ایک تیر اور تھا، جو کیوپڈ کے تیروں کی طرح بدنام نہ تھا مگر اُن سے زیادہ کارگر تھا۔ اور جبوقت سائیک اس عالم میں آئی تو وہ ناوک اُسکی نشیلی آنکھوں میں نگاہ بنا کر رکھدیا گیا، کیوپڈ کو تو زخمی کرنے کے لیے قصد و ارادہ کی ضرورت تھی اہتمام و انصرام درکار تھا کہ کمان میں تیر رکھے، کمان کو ایک دفعہ کھینچے اور پھر چٹکی ڈھیلی کرے لیکن سائیک کی مست آنکھوں کو یہ ہوش کہاں نہ وہ کسی قصد کو جانتی تھی نہ اہتمام کو، نہ کسی ارادہ سے واقف تھی اور نہ انصرام سے۔ ایک بار پلک سے پلک جدا ہوئی اور تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ وہ تو اسقدر سادہ اور بھولی تھی کہ اگر کوئی اس سے یہ کہتا تو سہم کر رہ جاتی غرضکہ کیوپڈ وہاں سے زخمی ہو کر پھرا اور ایسا زخمی کہ وہ اپنے سارے تخیلات کو بیقرار جراحت پاتا تھا۔

وہ اسی عالم اضطرار و اضطراب میں تھا کہ وینس آئی اور خلاف معمول اُسے اسقدر مغموم و افسردہ پاکر متحیر ہو گئی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ کیوپڈ کسی مہم سے ناکام و نامراد واپس آ سکتا ہے، چہ جائیکہ اسکا منفعل ہو کر لوٹنا وہ کچھ سمجھی اور سمجھکر ٹھٹکی،

ٹھٹکی اور پھر آگے بڑھی اور ایک خاص تحکمانہ انداز سے بولی "اے کیوپڈ، مجھے اپنا ترکش دکھا کہ میں اُسے خالی پاکر خوش ہوں۔ ہاں، ہاں میں سمجھتی ہوں شاید اب تو افسوس کرتا ہوگا کہ کیوں سایک کو زخمی کیا۔ ہاں وہ ایسی ہی حسین ہے کہ افسوس ہو اور اے کیوپڈ یہی وجہ ہے جس نے اُسکی تباہی و بربادی کو لازم کردیا تھا۔

"اے کیوپڈ بول، جلدی خبر دے کہ وہ دیوانہ وار دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے یا وادیوں میں خراب و خستہ پھر رہی ہے" کیوپڈ سایک کی نسبت تباہی و بربادی کے الفاظ نہ سن سکا اور بولا کہ "ہاں میرا ترکش بھی خالی ہے اور چھاتی بھی دکھتی ہے کیا میرے لیے یہ کافی عذر نہیں؟ میں سایک کے مجروح ہونے پر تاسف نہیں کرتا، کیونکہ وہ مجروح نہیں ہے اور اگر کہیں وہ وادیوں میں پریشان پھر رہی ہے تو تنہا نہیں ہے کیونکہ جب کیوپڈ نے اپنی کمان توڑ ڈالی، تیر پھینکدیے تو اُسکے لیے اُس سے اچھا شغل اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ سایک کے درد و مصیبت میں شریک ہوکر اپنی عمر کاٹ دے اے وینس مجھے ملامت نہ کر کیونکہ سایک فن تیراندازی میں مجھ سے زیادہ مشاق نکلی اور مجھ پر تاسف بھی نہ کر کیونکہ ساری عمر میں آج ہی مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تیر چلانے سے زیادہ تیر کھانے میں لطف ہے اور وہ تیر میرے دلمیں پیوست ہے۔ آہ! اگر مجھے یہ رشک نہ ہوتا کہ زمانہ اس تیر کو دیکھ لیگا تو میں اُسے اس حال میں کہ وہ خون سے رنگین ہوتا اولمپس و اٹیلس پہاڑوں کی چوٹی پر نصب کردیتا اور زمین کی اس بیمثل یادگار کی پرستش سارے آسمان والوں سے کراتا، مگر نہیں وہ میرے پہلو میں ہے اور وہیں رہے گا اگر سایک اندمال جراحت کے لیے کچھ نہیں کرسکتی تو میں اسپر بھی راضی ہوں کیونکہ کیوپڈ کو اس سے زیادہ کسی اور تمنا پیدا کرنے کا حق بھی نہیں ہے۔"

غالباً اسکے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ وینس پر اسکا کیا اثر ہوا وہ ایک انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں وہاں سے چلی گئی اور سب سے پہلا حکم جو اُس نے

واپس آکر دیا یہ تھا کہ فوراً سامان سفر درست کیا جائے۔
پریاں نہایت انہماک کے ساتھ تیاری میں مصروف ہو گئیں اور وہ بلوں کی کنواریاں وینس کے جلو میں چلنے کے لیے آمادہ۔ ہزاروں پردار گھوڑے جن کا ساز و یراق جواہرات کا تھا اور جن کی دم اور ایال میں نہایت آبدار موتی گندھے ہوئے تھے جمع ہو گئے اور وینس اپنے زریں رتھ پر سوار ہو کر جس میں ۱۱ گھوڑے جتے ہوئے تھے مع اپنی کنیزوں، کنواریوں اور پریوں کے ایک دفعہ بادل کی طرح جو سما میں چھا گئی اور تھوڑی دیر بعد آفتاب کی روشنی میں تحلیل ہو کر غائب۔

(۵)

سارا یونان آج چراغاں ہو رہا تھا اور یونان کا ہر گھر بزم رقص و سرود۔ اک سیلاب مسرت تھا کہ ہر پیشانی اس میں غرق نظر آتی تھی اک طوفان نشاط تھا کہ ہر دل اسمیں ڈوبا ہوا تھا ہر گلی کوچہ میں زر و سیم کی بارش ہو رہی تھی شاہی انعامات کا سلسلہ برابر جاری تھا اور نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا کے کسی جشن میں ایک بادشاہ کے دست کرم نے اس سے زیادہ وسیع حصہ لیا ہو۔
آگسٹس والی یونان کا عہد سلطنت نہ صرف اسوجہ سے عہد زریں سمجھا جاتا ہے کہ وہ بے انتہا فیاض و سیر چشم تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس سے زیادہ رعایا کا خیر خواہ شاہان یونان کی فہرست میں کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ کوئی بہانہ ڈھونڈھا کرتا تھا کہ میں کس طرح رعایا کو زیر بار احسان کروں اور اس لیے ایسے دل والے بادشاہ کو آج سے بہتر موقع اپنا حوصلہ نکالنے کا اور کیا مل سکتا تھا کہ وہ اپنی دو حسین بیٹیوں کی شادیاں کر رہا تھا۔
سارا دربار زر ماندوز تھا۔ اور دربار کی ہر ہر چیز جواہر کار۔ یونان کے تمام سردار

جمع تھے اور پایہ تخت کی ہر حسین لڑکی، جو اگلاریس اور کیوپڈس سایک کی بہنیں تھیں سر سے پاؤں تک جواہرات میں غرق دُلہن بنی بیٹھی تھیں اور اُنکے خوش نصیب شوہر اُنکے پہلوؤں میں مست و سرشار۔ ملک کی بہترین موسیقی سازوں سے نکل رہی تھی اور یونان کی لطیف ترین شراب بلوری و الماسی گلاسوں میں جھلک رہی تھی۔

ٹھیک یہی وقت تھا، جشن و طرب کی یہی حالت تھی، مسرتوں کی یہی فراوانی تھی آگسٹس اپنے شاہانہ لباس میں تخت پر جلوہ افروز تھا کہ دربار کا ایک دروازہ زور سے کھلا، کوئی چیز اندر آ کر روشنی میں مل گئی اور بادشاہ ایک سخت پُر اضطراب کراہ کے ساتھ تخت کے نیچے گر پڑا۔

نشے ہرن ہو گئے، مسرتیں منغص ہو گئیں، منہ کھل گئے، آنکھیں پھٹ گئیں سکون کی جگہ اضطراب نے لے لی، طمانیت پر سراسیمگی نے قبضہ کر لیا اور ہر شخص بادشاہ کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ بُری طرح کراہ رہا تھا، ہاتھ سینے پر تھا، آنکھیں شدت درد سے اُبل پڑی تھیں اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کیا ہے۔ ملکہ چیخ مار کر بادشاہ سے لپٹ گئی کہ خدایا یہ کیا ہوا، اسکا جواب دینے والا کوئی نہ تھا، مگر ایک دیوی جو لوگوں کی نگاہوں سے غائب تھی یہ کہتی ہوئی چلدی کہ "یہ ابتدا ہے انتقام کی۔ سایک ونیس کے بیٹے کو بیقرار کر کے زندہ رہے ناممکن ہے۔"

آن واحد میں سارے یونان کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کسی سخت مرض میں مبتلا ہو گیا ہے لوگ دوڑ پڑے، ماہرین طب نے اپنی ساری تدابیر ختم کر دیں، شیوخ معابد دعا مانگتے مانگتے تھک گئے، لیکن درد میں ذرا تخفیف نہ ہوئی اور اسلئے بالآخر کار تمام اراکین و عقلائے سلطنت کی یہ رائے ہوئی کہ سنگ مقدس سے چارہ جوئی کرنی چاہیے۔

جس عہد کا یہ واقعہ ہے اُسوقت یہ دستور تھا کہ جب کوئی سخت مصیبت

پیش آتی تھی اور جملہ انسانی تدابیر بے سود ثابت ہوتی تھیں تو دیوتاؤں کی روح سے استمداد کی جاتی تھی اس عرض والتجا کے لیے ایک خاص مقام مقرر تھا جہاں ایک پتھر نصب تھا اس عرض کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پتھر پر ایک تحریر نمودار ہوتی تھی جو نہ صرف واقعات آئندہ کو ظاہر کرتی تھی بلکہ دفع بلا کی تدابیر بھی بتاتی تھی چنانچہ اپنے وقت میں جبکہ بادشاہ کی تکلیف ہر لمحہ بڑھ رہی تھی اور کسی طرح اُسے آرام ہوتا نظر نہ آتا تھا، سوائے اسکے اور کیا چارہ تھا کہ سنگ مقدس سے مدد لی جائے۔ چنانچہ ملکہ مع امراء دربار، ارکینِ سلطنت اور اپنی دونوں دولہن بیٹیوں کے روانہ ہوگئی اور سایک کو بادشاہ کے پاس تیمارداری کے لیے چھوڑ دیا۔

لوگ وہاں پہنچے، جملہ مراسم عبودیت جو ادا کرنا چاہیے ادا کیے گئے، مگر آہ، کسے خبر تھی کہ وینس کے ہاتھ نے اِس سنگ مقدس پر ایسا سخت فیصلہ لکھ دیا ہے جسکے دیکھنے اور سُننے کے لیے ویسے ہی سینہ کی ضرورت تھی۔

جب دعائیں اور التجائیں ختم ہوگئیں، تو ملکہ نے دھڑکتے ہوئے دل سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کانپتی ہوئی اُنگلیوں سے وہ پردہ ہٹایا، جو سنگ مقدس پر پڑا ہوا تھا فیصلہ کا مفہوم یہ تھا:-

رئیس یونان بیمار ہے، لیکن اُسکی بیماری کا علاج انسانی قوت سے باہر ہے سارے عالم کے طبیبوں کو بلاؤ لیکن وہ نہ بتا سکیں گے کہ یہ بیماری کیا ہے۔ ساری دنیا کے اختر شناس جمع کرو، مگر وہ نہ کہہ سکیں گے کہ یہ مرض کہاں سے آیا کیونکہ وہ کوئی بیماری نہیں جو طبیب بتا سکے، وہ کسی ستارہ کی نظر بد نہیں، جو نجومی معلوم کر سکے۔ وہ اک قہر ہے جو بہشت کے مالک دیوتاؤں کے سردار جوپیٹر نے اسپر نازل کیا ہے وہ اک آفت ہے کہ اگر جلد اس سے پناہ نہ مانگی گئی تو سارا یونان اس میں مبتلا ہو جائے گا۔ اگر یونان کی ملکہ یونان کے امراء یونان کی رعایا اپنے بادشاہ کی

صحت اور آئندہ امن و سکون کے آرزومند ہیں تو انکو چاہیے کہ شاہزادی سائیک کو اولمپس کی سب سے اونچی چوٹی پر لیجائیں اور بلوط کے درخت میں باندھکر چلے آئیں جیوپٹر اس قربانی کو اپنے کسی عفریت کے ذریعہ سے قبول کریگا اور بادشاہ صحت پا جائے گا، اور اگر یہ قربانی دو دن کے اندر نہ کی گئی، تو پھر ہزار سائیک کی قربانیاں بھی اس مصیبت کو دور کر سکیں گی"

ملکہ غش کھا کر گر پڑی، امراء متحیر رہ گئے، اور ساری کنیزیں اپنا سر پیٹنے لگیں مگر اس غمگین جماعت، اس حلقۂ ماتم میں دو ہستیاں ایسی بھی تھیں جنکی حقیقی مسرت کا یہ آج پہلا دن تھا اور جنکے لیے سنگ مقدس کی یہ ظالم تحریر ایک شعر سے زیادہ پر لطف، اک نغمۂ صباحی سے زیادہ مسرت بخش تھی۔

اگلاریس اور کیوپڈس نے اپنی ماں کو اٹھایا اور جلدی جلدی ہوش میں لا کر واپس چلنے پر مجبور کیا اور کہا کہ "اے ملکہ اٹھو خدا جانے بادشاہ کا کیا حال ہوگا ہر چند ۔۔۔ ۔۔ جیوپٹر کا فیصلہ بہت سخت ہے، لیکن اسکا غصہ اس سے زیادہ بے پناہ و بے رحم ثابت ہوگا، اگر سنگ مقدس کی تحریر پر عمل نہیں کیا گیا"

بہر حال ملکہ کسی نہ کسی طرح واپس آئی، لیکن ایسے روح فرسا غم کا بوجھ لیے ہوئے کہ خود اسکو اپنی جان کی قربانی کرنی پڑتی تو وہ اسکے مقابلہ میں نہایت خوشی سے برداشت کر لیتی، مگر نہیں فطرت اسوقت اسکے نسوانی فرائض کا امتحان لے رہی تھی اور وہ غریب سخت کشاکش میں مبتلا تھی، شوہر اسکا دل تھا اور بیٹی اسکی جان اور اسلیے کوئی قوت اسے اس امر کے فیصلہ میں مدد نہیں دے سکتی تھی کہ وہ دل کو جان پر قربان کرے یا جان کو دل پر، کیونکہ وہ یہ خوب سمجھتی تھی کہ ان دونوں میں سے ایک کو ہاتھ سے دینا ناگزیر ہے۔ مگر کس کو دے اور کسکو نہ دے؟ یہ وہ معما تھا جسکو حل کرنے کے حواس وہ اپنے میں نہ پاتی تھی، جب وہ آئی تو بادشاہ کے

کرب میں اُس نے اور اضافہ پایا، لیکن جب اُس نے سائیک کو باپ کے پاس سخت
حالت افسردگی میں بیٹھے ہوئے پایا تو وہ "ہائے سائیک" کہکر زمین پر گر پڑی اور
بیہوش ہو گئی یہیں خبر نہیں کہ وہ کبتک اس عالم میں رہی اور کن شدائد میں مبتلا
رہی، مگر ہاں جسوقت صبح کو اُسکی آنکھ کھلی تو چہرہ کا رنگ بالکل اُڑا ہوا تھا، آنکھوں میں
حلقے پڑے تھے اور اتنی سکت بھی اسمیں نہ تھی کہ کسی کے سہارے ہی سے اُٹھ سکتی اُس نے
آنکھ کھولتے ہی چاروں طرف دیکھا اور یہ یقین کرنا چاہا کہ جو کچھ گذر چکا سب خواب تھا،
مگر جب اُس نے کئی بار اپنی آنکھوں کو کھولا . . اور بند کیا تو اُسے سمجھنا پڑا کہ یہ سب حقیقت
تھی اور ویسی ہی جگر خراش جیسی اس نے اپنے نیدار میں بحالت بیہوشی پائی تھی۔ نہ صرف
اُمراء دربار وارکین سلطنت پریشان تھے بلکہ سارا یونان سراسیمہ تھا کہ دیکھیے ملکہ کس نتیجہ پر
پہنچتی ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ ایسا عادل بادشاہ ایسا کریم النفس حکمراں یونان کو کبھی
نصیب نہیں ہو سکتا، اسلیے جسقدر مہنگی اُسکی زندگی خریدی جا سکے ارزاں ہے۔ اور بعض
کو یہ تمنا تھی کہ جو کچھ بھی ہو سائیک کو زندہ و سلامت رہنا چاہیے کیونکہ بادشاہ تو ضعیف
ہے اور ایک نہ ایک دن بہرحال اُسے جانا ہے اور یونان کو اس مفارقت کا صدمہ اُٹھانا
ہے لیکن سائیک جس نے ابھی زندگی کی صرف سترہ بہاریں دیکھی ہیں اور جسکی ذات پر
ساری زمین فخر کر سکتی ہے۔ روز روز پیدا ہونے کی چیز نہیں۔ لیکن اسی حالت منتظرہ میں
دفعتہً بادشاہ کی خوابگاہ سے سخت چیخ کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ بادشاہ دم توڑ رہا ہے
ملکہ نے ایکدفعہ آنکھیں کھولدیں اور نہایت ہوش کے ساتھ اُٹھ بیٹھی لیکن اس سکوت کو
توڑنے کے لیے جو اسوقت سارے دربار میں چھایا ہوا تھا، اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے
جسکے متعلق یونان کا ہر متنفس بیتاب تھا وہ اُٹھی اور اک عزم کے ساتھ اُٹھی ایک استقلال
لیے ہوئے اُٹھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تاثرات سے جنگ کرکے فتح حاصل
کر چکی ہے اور اب جو کچھ وہ کرنا چاہتی ہے .... "اسیر تاسف کرنے کیلئے

تیار نہیں ہے اسنے سمجھ لیا کہ ساتیک بھی مثل میرے بادشاہ کی مملوکہ ہے اور اسلیے مجھ کوئی حق حاصل نہیں کہ مالک کو اک مملوکہ شے سے نفع نہ اُٹھانے دوں اگر ساتیک کو ہاتھ سے دینے کے بعد بادشاہ اپنی زندگی واپس لے سکے گا تو اُسکی مثال بالکل ایسی ہی ہوگی جس طرح کوئی شخص اپنی محبوب تریں چیز دے کر کسی مصیبت سے نجات حاصل کرے، پھر میں نہیں سمجھ سکتی کہ ایسا کرنے والے کو کون شخص مجرم قرار دے گا اور کون ہے جو ایسا نہ کرکے جان دینے والے کو بیوقوف نہ سمجھے گا" وہ یہ سوچکر اپنے مریض وجاں بلب شوہر کے بستر علالت و درد پر گئی اور سب کے سامنے ساتیک کو مخاطب بنا کر کہا :-

"اے بیٹی تیار ہوجا، میں تجھے اجازت دیکر اپنے فرض سے سبکدوش ہوتی ہوں اور تو اسکی تعمیل کرکے اپنے فرض کو ادا کر۔ اے ساتیک، ہر چند مجھے یقین ہے کہ تیرے بعد میں زیادہ نہ جی سکوں گی، لیکن جب میں یہ دیکھتی ہوں کہ اگر مجھے اپنی ہی جان نذر کرنی پڑتی تو کیا مجھے پس وپیش کرنا چاہیے تھا، تو پھر تیرے نہ رہنے سے اور کوئی بات زیادہ نہ ہوگی اے میرے جگر کے ٹکڑے، دیکھ اپنی کمزوری سے اسوقت میرے ارادوں میں ضمحلال پیدا نہ کردینا، تو گھبرا نہ، کیونکہ تیری ماں بھی بہت جلد تجھ سے آملے گی۔ اور پھر کبھی جدا ہونے کے لیے تجھے اپنی آغوش میں لے لیگی" اب ملکہ کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ امنڈ کر آنے لگے اور اُسکی آواز کانپنے لگی، یہانتک کہ اُسکی ہچکی بندھ گئی اور مجبوراً اُسے ہاتھ کے اشارہ سے آنکھ پر رومال رکھکر کہنا پڑا کہ "بس اب لیجاؤ دیر نہ کرو" ہم نہیں کہہ سکتے کہ ساتیک نے اول اول اس خبر کو کہ وہ قربانگاہ پر چڑھائی جائے گی کسطرح سُنا، اور پھر اس حالت انتظار کو جب تک ملکہ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، کیونکر کاٹا، مگر ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جسوقت اسکی نسبت قطعی رائے قائم کرلی گئی اور اُسکو پہاڑ پر لیجانے کی تیاریاں ہونے لگیں تو وہ بالکل مردہ سی تھی اور اُسکے قواء نے بالکل جواب دیدیا تھا، جاں دینے سے گریز و احتراز بالکل فطری امر ہے اور اس لیے کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ ساتیک جان دینے

نہ ڈرتی تھی، لیکن اسمیں کلام نہیں کہ جس غم نے اُسے گونگا بنا دیا جس صدمہ نے اُسکی آنکھوں سے آنسو تک جذب کر لیے وہ صرف اس خیال پر مبنی تھا کہ "میری جدائی کو ماں کیونکر برداشت کرسکے گی" اُسنے اپنے ہاتھ پاؤں ڈالدے، بدن ڈھیلا کردیا اور اس طرح گویا اجازت دیدی کہ اس جسم کو جہاں جی چاہے لیجاؤ۔

اگلا سن دیکھو پڈس نے جلدی سارا انتظام روانگی کر لیا اور غریب سایک کا زندہ جنازہ ایک گاڑی میں ڈال کر کوہ الونڈ کی طرف روانہ ہوگئیں۔

رگوار ماں جسکی حالت دیکھ دیکھکر لوگوں کے کلیجے پھٹے جاتے تھے، ساتھ ساتھ تھی اور لوگوں کا اک ہجوم تھا جو پروانہ وار اس شمع مردہ (سایک) کو گھیرے ہوئے تھا ایک کہرام تھا کہ سارے شہر میں برپا تھا، اک قیامت تھی کہ ہر گھر میں قائم تھی۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو خونبار نہو اور کوئی دل نہ تھا جو تڑپ نہ رہا ہو، یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری کائنات اسوقت پلٹ دی جانے کو ہے اور سارا آسمان ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے۔ ایک گھنٹہ سے کم میں یہ جماعت اس چوٹی پر پہنچگئی جہاں سایک کی قربانی چڑھانی تھی اور جلدی جلدی شاہِ بلوط کے اُس درخت سے باندھ دیا جو سب سے نمایاں چوٹی پر تھا۔

اُسکی نازک کلائیاں جو ایک چوڑی کا بار بھی برداشت نہ کرسکتی تھیں پس پشت رسی سے بندھی ہوی تھیں اور وہ کمر جس کی نزاکت کی پیمائش کے لیے ڈیڑھ بالشت فیتہ بھی زائد تھا درخت کے تنے سے کس دی گئی تھی اسکی وہی ریشمی چادر جسکو وہ نصف باندھتی تھی اُسکے جسم پر تھی، لیکن وہ نقاب جو پانچ سال سے اُسکے چاند سے مکھڑے کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھا اسوقت جدا تھا کیونکہ یہی رسم تھی کہ جسکی قربانی لیجائے اُسکا سر و چہرہ برہنہ کردیا جائے۔

سایک کا یہاں تک لایا جانا، اُسکی کلائی اور کمر کا باندھا جانا یہ سب عالم بیہوشی میں ہوا، لیکن جسوقت اُسکی ماں نے بیتابانہ اک آخری بوسہ اُسکی پیشانی پر دیا تو سایک کی

آنکھیں مکمل گئیں چونکہ اب وہ ہاتھ نہ جوڑ سکتی تھی (کیونکہ وہ بندھے ہوئے تھے) قدموں پہ نہ گر سکتی تھی (کیونکہ وہ کس دی گئی تھی) کچھ کہہ نہ سکتی تھی (کیونکہ اسکے حلق و زبان خشک تھے اسیلیے اسکی ساری التجائیں، وہ ساری لجاجتیں جو دیگر اعضاء سے کیجا سکتی تھیں اب صرف اسکی آنکھوں میں کھچکر آ گئی تھیں اور اسیلیے اس عالم یاس میں اسکی آنکھوں کا طلب رحم کرنا حقیقتاً اک ایسا دل ہلا دینے والا منظر تھا جسکی تاب غریب ماں کہاں لا سکتی تھی، لوگوں نے اسکو اٹھایا اور سایک کو یونہی تنہا پہاڑ کی چوٹی پر ایک درخت سے بندھا ہوا چھوڑ کر چلدیے۔ مگر آہ، وہ سایک کا کس سا کر اک آخری نگاہِ مایوس کے ساتھ دیکھنا اور اسوقت اپنی نڈھال گردن موڑ موڑ کر دیکھتے رہنا جب تک سب لوگ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے کہ شاید اب بھی کوئی رحم کرے ایسا دردانگیز نظارہ تھا کہ اگر وینس بھی وہاں ہوتی تو اسکا کلیجہ پھٹ جاتا۔ مگر آہ، نہ وینس وہاں تھی کہ شاید اسی کو کچھ رحم آ جاتا اور نہ ماں وہاں تھی کہ پھر ایکبار چمٹکر اپنی بیٹی کو کلیجے سے لگا لیتی۔ صرف ایک سنسان پہاڑ کی چوٹی تھی اور وحشتناک جنگل کی خاموشی جسکی ساکن و وسیع فضا میں سایک کی نگاہ واپسیں گم ہو گئی یعنی اسکی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ خود ایک طرف کو گردن ڈال کر بیہوش۔

(۶)

اے خواب کی ملکہ اے تینا کی دیوی (مارفیس) جا، اپنے نرم ہاتھوں سے اسے جا کے تھپک اور اسکے منتشر حواس کو اک شیریں سکون کے ساتھ جمع کردے، اور تو بھی اے نسیم کی دیوی (زیفر) اٹھ اور اسکی کمر اور کلائی کے بند جدا کردے، کیونکہ فانی نوع انسان میں ایسا دلدوز و ساحر حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا، جلدی کر و جلدی، کیونکہ میرا دل اسکی محبت میں پھنک رہا ہے۔

کیوپڈ کی اس التجا کو ان دیویوں نے سنا اور اسکے ساتھ کو وہ الوند کی اس خوفناک

چوٹی پر پہنچ گئیں جہاں ایک شاہ بلوط کے تنے سے ماہ نخشب طلوع ہو رہا تھا۔ شاخوں میں جنبش شروع ہوئی، پتیاں ہلنے لگیں اور رفتہ رفتہ ایک لطیف و نگہت بیز ہوا نے سارے کوہِ الوند کو معطر کر دیا۔ سایک کا دماغ بھی اس سے متاثر ہوا اور اُسکی آنکھیں جھپک گئیں اُسکا محو خواب ہونا تھا کہ بادِ نسیم نے اُسکے بند جدا کر کے اپنے ہاتھوں پے سنبھال کر وہیں فرش پر لٹا دیا۔

سایک غافل پڑی سو رہی تھی، چادر اُسکے سرو سینہ سے جدا تھی اور اُسے یہ ہوش نہ تھا کہ اک حریص آنکھ اُسے دیکھ رہی ہے اسلیے اپنا عریاں حصۂ جسم چھپا کر اُسے سمٹ جانا چاہیے۔ اُسکے بال ہوا سے اُڑ اُڑ کر پیشانی اور چہرہ پر آرہے تھے اور اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ اک اجنبی نگاہ اس دلفریب منظر سے لطف اُٹھا رہی ہے اور اسلیے اُسے چہرہ پر نقاب ڈال لینا چاہیے۔

کیوپڈ نے اس سے قبل جب سائک کو باغ میں دیکھا، تو وہ بے نقاب ضرور تھی مگر محو خواب نہ تھی، لیکن وہ غریب کیا جانتا تھا کہ جب حُسن سو جاتا ہے تو کیا ہو جاتا ہے جب لباس بے ترتیب اور بال برہم ہو جاتے ہیں تو ایک عورت کیا قیامت ہو جاتی ہے۔ وہ خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا اور تباہ ہوا جا رہا تھا یعنی اگر حُسن بیہوش تھا تو عشق بھی اپنے حواس کھو رہا تھا۔ اُسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ سایک کی صرف کھلی ہوئی بلوریں گردن کو دیکھا کرے، یا صرف اُسکے عریاں یاسمنی سینہ کو، اسکے یاقوتی پتلے پتلے ہونٹوں پے جان نثار کرے ....

.... یا اُسکی کشادہ کافوری پیشانی پر۔ اُسکی حالت اس امر کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ وہ سایک کے سیاہ خمدار ابروؤں سے محبت کرے یا اُسکی متوالی آنکھوں سے، وہ متحیر تھا کہ اُسکی نازک کمر پر جان دے یا اُسکی کشیدہ قامتی کے انتہائے تناسب پر وہ دیر تک اسی عالم حیرت و استعجاب میں کھڑا رہا اور آخر کار یہ فیصلہ کر کے کہ سایک کا

رتبہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ کوئی شخص اپنے تئیں اس سے محبت کرنے کا اہل سمجھے، وہ اُسکے قدموں پر گر پڑا، اُسکے رنگیں تلوؤں سے اپنی آنکھیں ملیں اور ایک طویل بوسہ دے کر یہ کہتا ہوا اُٹھ بیٹھا کہ :-

اُے سایک، میں تجھ سے محبت نہیں کرونگا، تجھے پیار نہیں کرونگا ——— تجھ سے عشق نہیں کرونگا، کیونکہ یہ بھی اک ناقص طریقہ تیرے اعتراف حُسن اور اپنے اظہار جذبات کا ہے، میں تیری عظمت کرونگا، تجھے پوجوں گا، تجھ سے ڈرونگا ——— اک ایسا ڈر اپنے دل میں لیے ہوئے جو کبھی جیوپیٹر کی طرف سے بھی مجھ میں پیدا نہیں ہوا تجھے دیکھوں گا اور کانپا کروں گا بدن کی اُس کپکپی کے ساتھ جو کبھی میرے جسم پر طاری نہیں ہوئی - میں تجھے اک ملکہ، نہیں اک دیوی، آہ یہ بھی نہیں - خدا جانے کیا سمجھونگا اور اگر تو نے اجازت دی تو اپنے تئیں تیرا خادم، نہیں اک ادنیٰ پرستار، آہ یہ بھی نہیں بلکہ اک خوار گدا، اک ذلیل بھکاری اور اس سے بھی زیادہ حقیر وہ کچھ سمجھوں گا" جسکے ظاہر کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں" مارفیس وزفر نے سایک کو اُٹھایا اور اپنے پروں پر رکھکر شاداب کوہ اولمپس کے اُس کنج میں لے گئیں جہاں کیوپڈ نے خاص طور سے ایک قصر سایک کے قیام کے لیے تیار کرایا تھا - وہ ایک برج میں جو اس قصر کا بہترین حصہ تھا لٹا دی گئی اور مارفیس اپنی نیند اُسکی آنکھوں سے لیکر زفر کے ساتھ غائب ہوگئی -

سایک اپنی آنکھیں ملتی ہوی اُٹھ بیٹھی اور اپنے تئیں اک طلائی برج کے اندر جواہر کا فرش پر پاکر مبہوت و متحیر ہوگئی - اُس نے پھر آنکھیں بند کریں کہ شاید یہ کوئی دلکش خواب ہو اور پھر کھولدیں کہ کاش خواب نہو - مگر بے صبر کیوپڈ سے زیادہ ضبط نہو سکا اور نہ اپنی شیریں آواز اُسنے سایک کے کانوں میں پہنچائی کہ :-

"اے سایک یہ خواب نہیں حقیقت ہے"

ءسی کے ساتھ چہرہ پر نقاب ڈالے ہوئے سونے کی بوچھاروں میں چھپا ہوا حسین
پچہ کہتا ہوا نکل آیا کہ "اے سایک، تعجب نہ کر، متحیر نہ ہو، تیرا غلام تیرے سامنے کھڑا ہے، اُسے
ئی حکم دے" اک شاہانہ لہجہ میں اُس سے کچھ کرنے کو کہہ کیونکہ اب اُسکی زندگی صرف تیری
بت ہے اگر تو نفرت نہ کرے تو میں کہوں کہ وہ عفریت میں ہی ہوں جسکے لیے تیری قربانی
ھائی گئی تھی۔ اور اگر تو برہم نہ ہو تو تیرے تمام خواہشات قلب کو مہیا کرے۔"
سایک کو یہ سمجھایا گیا تھا کہ جب اُسکی قربانی پیش کیجائیگی تو ایک بدصورت، مردم خوار
ریت اُسکا شوہر بنے گا، لیکن وہ اپنے سامنے ایک ایسے حسین نوجوان کو دیکھ رہی تھی ج
ی اسکی فکر سے پہلے نہیں گذرا تھا اور ہر چند وہ نقاب پوش تھا لیکن اعضا کا تناسب
م کا کندنی رنگ کہے دیتا تھا کہ اس نقاب کے نیچے اک نہایت ہی خوبصورت اور شباب
رہ چھپا ہوا ہے۔ اُسکے مُنھ سے خواہشات قلب کے الفاظ سُنکر وہ چونک پڑی اور اُسکے تمام
یات جو یونان میں مردہ ہو چکے تھے دفعتہً زندہ ہو کر پھر اسکی حیات میں دوڑنے لگے اسکا چہرہ
شی سے تمتما اُٹھا، انفعال سے بھیگ گیا یعنی اُس گلاب پر پھر وہی شبنم آگئی جس سے
سکا کندنی رنگ اور بھی دمکنے لگتا تھا وہ آخر کار اپنی مسرت سے مغلوب ہو کر اُٹھ بیٹھی اور
ئیڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی کہ "اگر تو ہی میرا شوہر ہے تو پھر یہ حجاب کیوں؟ یہ نقاب کیسا؟
ے کیا یہی حاصل ہے کہ اُن آنکھوں کو مجھ سے چھپائے رکھے جن میں مجھے اپنے جذبات کی
ت کو پڑھنا ہے، وہ جیسی بھی ہیں میری ہیں، میں اُن سے محبت کرنا سیکھوں گی گو انہیں
ے محبت نہو، اپنی بہترین ہدایائے عشق اُنکے سامنے پیش کروں گی خواہ وہ کتنی ہی
ے بچائیں جائیں۔" یہ کہتے ہوئے سایک نے اُسکا نقاب نوچنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا
تھا کہ کیوپڈ نے اُسکی کلائیاں پکڑ لیں اور نہایت نرم لہجہ میں بولا کہ "اے سایک
تو تیرا ادنیٰ غلام ہوں، تو مجھے جو چاہے سمجھ تیرا لطف ہے، مگر اے سایک مجھے اُس بات کے
نے پر مجبور نہ کر جسکو میں نہیں کرسکتا، اگر تو ایک نقاب پوش ہستی پر صرف اسیلیے

تعلم کر سکتی ہے کہ صرف نقاب کا جدا کرنا ہی اک ایسا کام ہے جسکی نسبت وہ تیز زبان لینے کے لیے تیار نہیں تو تو رحم کر ورنہ اے سایک پھر میں تجھ سے چھٹ جاؤنگا اور مر جاؤنگا۔ سایک کچھ تو اُسکی تقریر کی نرمی سے متاثر ہو کر اور کچھ اس کے مردانہ گرم ہاتھوں میں اپنی نازک کلائیاں پا کر رُک گئی، ٹھہر گئی اور وہ ایسا محسوس کرنے لگی گویا اُسکے ہاتھ ڈھیلے ہیں، اُسکے پاؤں میں سکت نہیں ہے اور وہ بے اختیار اُسکی طرف کھنچی چلی جا رہی ہے آخر کار اُس نے اپنے جسم کا سارا بوجھ کیوپڈ پر ڈالدیا، اپنے تئیں اُسکی آغوش میں سونپ دیا اور اُس لذت سے مست و سرشار ہو کر جو اس سے قبل اُسکو کبھی نصیب نہوئی تھی اور جسکے لیے وہ سراپا جستجو بنی ہوئی تھی آنکھیں پلٹ کر کیوپڈ کی گود میں بے اختیار گر پڑی۔

ہر چند ملک، وطن، ماں باپ کو اسطرح یکایک چھوڑ دینے کا رنج ایسا معمولی رنج نہیں کہ کوئی انسان خاص کر ایک عورت اور عورت بھی ایسی حساس، ایسی لطیف الخیال اور ایسی نازک طبع اسقدر جلد فراموش کر سکے لیکن بات یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شباب کے عالم میں اگر کوئی حقیقی اور سچی حس رکھتی ہے تو وہ وہی ہے جسکا تعلق صرف اسکے شباب سے ہے ممکن ہے کہ وہ ایک مدت دیگر مشاغلِ حیات میں منہمک ہو، مختلف اسباب تفریح میں دلچسپی کا اظہار کرے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے ذات سے وابستہ ہونیوالے تعلقات میں یکسر محویت یا استغراق ہو جائے، لیکن یہ ممکن نہیں کہ اسکے حسیات شباب کے متعلق کوئی بات اسکے کان میں پڑے اور وہ دنیا بھر کی تمام مصروفیت کو چھوڑ کر اسطرف متوجہ نہو جائے کیونکہ عورت کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے حسن و شباب کے متعلق دوسروں کی رائے زنی سے خوش ہوتی ہے، اتنی وہ خود آئینہ دیکھکر بھی خوش نہیں ہوتی حالانکہ وہ گھنٹوں اسکے سامنے گیسو سنوار سنوار کر عزت لیا کرتی ہے، وہ چاہتی ہے کہ اسکی جوانی جس جوانی ہی کا ذکر ہو اور وہ اخلاق و عادات سے ذرا بھی غرض۔ وہ اپنے تئیں نہیں اور اطلاق سنکر خوش ہو سکتی ہے مگر اپنے شباب کے متعلق صلاح و تقویٰ کی نسبت سُننا پسند نہیں کر سکتی، کیونکہ شوخی اور چلبلے پن میں تو اُسکے شباب کے اقتضا کا ذکر ہے اور

و عبادت ایک طور سے اُسکے شباب کی توہین ہے۔

ہم نے مانا کہ سایک کو اپنی ماں سے بہت زیادہ الفت تھی، اپنے باپ پر جان دیتی تھی (اور اُس نے دے ہی دی) اپنے وطن کی شیدا تھی، لیکن یہ الفت یہ جاں نثاری، یہ شیدائیت اُسیوقت تک تھی جب تک کوئی اسے چاہنے والا کوئی اسکا دیکھنے والا کوئی اُسکے حسن و شباب کی تعریف کرنے والا نہ تھا، لیکن اب جو اُس نے اپنے سامنے کیوپڈ ایسا حسین نوجوان دیکھا اور اُسکی وارفتگی، فتادگی اور پرستاری خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لی کانوں سے سُن لی اور ہاتھوں سے چھو لی، تو وہ اپنے سارے افکار بھول گئی، سارے غم طے کر گئی، کیونکہ اب کو ماڈیپس کی وسیع خلوت میں سوائے حیاتِ معاشقہ کے اور کوئی چیز اُسے نظر نہ آتی تھی اور اُسکی سمجھ میں سوائے اسکے اور کوئی بات نہ آتی تھی کہ وہ اپنی جوانی کے بوجھ سے خستہ ہو کر جس خستگی کو وہ برسوں سے برداشت کرتی چلی آتی تھی کیوں نہ آنکھیں بند کر کے کیوپڈ کی محبت بھری آغوش میں گر پڑے اس نے سمجھ لیا کہ کیوپڈ نوجوان ہے حسین ہے اور مرد ہے اس لیے اُسنے مطلق پرواہ نہ کی اگر اُسکا چہرہ بے نقاب نہ تھا اُس نے جان لیا کہ وہ اس سے محبت کے لیے آمادہ ہے اور اسیلیے ذرا خیال نہیں کیا کہ وہ کون ہے اور کیا ہے؟

خود کیوپڈ کی کیا حالت تھی؟ وہ سایک کے نرم و نازک جسم کو اپنے جسم سے متصل پا کر کیا سوچ رہا تھا؟ یہ ایسا سوال ہے جس سے خود اُسکا جواب پیدا ہو رہا ہے، کبھی وہ سایک کی آنکھیں چومتا تھا، کبھی اُسکے بال سونگھتا تھا اور کبھی اُسکے ہاتھ، غرضکہ وہ بالکل دیوانہ تھا پاگل تھا اور وہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کیا سایک بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے کوئی سیر ہو سکے۔ اُس نے سایک کے شاداب لبوں پر اپنے لب رکھدیے اور مست ہو کر اپنے تئیں بھول گیا اور بیہوش ہو گیا۔

عجیب و غریب منظر تھا کہ حسن عشق کی آغوش میں بیخبر پڑا تھا اور عشق حسن کی آغوش میں

باقی آئندہ

نیاز فتحپوری

غزلیات

جناب مولانا حسرت موہانی مدظلہ العالی

تھا مژدۂ بخشش الٰہی — پیغام نسیم صبحگاہی
در پے ہے مرے وہ حق فراموش — ثابت ہوئی میری بیگناہی
ہے دل کی صلاح جانفشانی — از راہِ کمالِ خیر خواہی
کچھ ربطِ جمال و شوق کا حال — معلوم نہ ہو سکا کماہی
روز و شب ہجر میں نہیں اب — کچھ فرقِ سپیدی و سیاہی
جاری ہے دیارِ عاشقی میں — فرمان ہلاکی و تباہی
زیبا کشِ حسن دلبراں ہے — یہ کم نگہی یہ کج کلاہی
از روے خلوص ہو تو لاریب — دنیا طلبی ہے دیں پناہی

دیتی ہے نگاہِ یار حسرت
آگاہی راز کی گواہی

جناب مولانا عزیز لکھنوی مدظلہ العالی

جلوہ دکھلائے جو وہ اپنی خود آرائی کا — نور جل جائے ابھی چشم تماشائی کا
اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
تو اسی بات پہ مرتے ہیں کرو تو زندہ — تم کو دعوئی تو بہت کچھ ہے مسیحائی کا
دل کے زخموں میں جو ناسور کے فوارے ہیں — عشق کو شوق ہوا ہے چمن آرائی کا
اُف ترے جلوۂ مستانہ کی پُر زور کشش — نور سب کھینچ لیا چشم تماشائی کا
گل جو گلزار میں ہیں گوش بر آواز عزیز

مجھ سے بلبل نے لیا طرز یہ شیوائی کا

حضرت مولانا کلیم لکھنوی مدظلہ العالی

تلاش یار میں ہر دم نہ کیوں راحت ملے دل کو ۔ مسافر کی تھکن سب دور ہو جاتی ہے منزل سے
سزا لے جرم الفت کی یہی ہے پاس قاتل سے ۔ دل آنکھوں سے ہے شرمندہ حجاب آنکھوں کو ہے دل سے
میں اس مجمع میں کیوں آیا نہ سمجھے مرد دل سے ۔ قیامت کیوں نہیں اٹھتی ہے ظالم تری محفل سے
نہ ہو گی پردہ پوشی زخم دامن دار کی دل سے ۔ اڑھے گی خون کی چادر ہوا لے تیغ قاتل سے
سمجھ لے فاصلہ ملک جنوں کا اپنی منزل سے ۔ رہ الفت کی پیمائش کرے مجنوں سلاسل سے
نہ کیوں جامہ دری پر اپنی دیوانہ رہے ہر دم ۔ ہوئی ہے پردہ پوشی قیس کی لیلی کی محمل سے
الم ہے صدمہ ہے ایذا ہے غم ہے درد ہے دکھ ہے ۔ نظر سے آنکھ سے جاں سے جگر سے روح سے دل سے
شریک غم نہیں عالم میں کوئی سوگوار اصلا ۔ بجھی ہے شمع محفل جب دھواں اٹھا ہے محفل سے
نہیں دست جنوں پر دسترس زور نقاہت کا ۔ رہا آزاد دیوانہ ترا قید سلاسل سے
خضر کیطرح کس کا زندگی پر دم نکلتا ہے ۔ چلے کیا رہنمائی رہروان کوئے قاتل سے
غشی نے کر دیا تھا مضطرب تیمارداروں کو ۔ تسلی ہو گئی سب کو مری بیتابی دل سے
کسی دن تیغ کے گھاٹ اتریگی کشتی عمر دنی ۔ کنارہ کش سفینہ رہ نہیں سکتا ہے ساحل سے
اگر میری طرح دیوانگی مجنوں میں آ جاتی ۔ نکل آتی گریباں پھاڑ کر لیلی بھی محمل سے
خیال زلف پر خم ضبط گریہ کا سبب ٹھہرا ۔ ترے دیوانہ نے دریا کو باندھا ہے سلاسل سے
ہوئی میری شہادت زندگی خلق کا باعث ۔ بریدہ ہو گئے دست اجل بھی تیغ قاتل سے
مری آنکھوں کو دیکھیں اور ترے دلبر نظر ڈالیں ۔ جناب خضر کیوں پھرتے ہیں بھٹکے بھٹکے منزل سے
ہمیشہ سے ہے میخواروں کا بیڑا پار اے واعظ ۔ نہ دریا سے غرض ہے کشتی سے کچھ نہ ساحل سے
نہ کچھ ہستی رہی ہستی میں ہستی مسیحا کی ۔ یہ اٹھا لطف مجکو زندگی کا تیغ قاتل سے
ہو تیری دید بھی [illegible] پہلو میں ترے بیٹھیں ۔ مزا آنکھوں کا آنکھوں سے ہے لذت دل کی ہے دل سے

ستارہ پست ہے میری لحد کے ذرہ ذرہ کا
کدورت آسماں کو ہے زمین کوے قاتل سے

جنوں میں بھی وفا سے باوفا غافل نہیں ہوتے
نہ اُلجھا دستِ وحشت پائے مجنوں کی سلاسل سے

اگر اغیار پر تلوار اپنی آزمائے گا
امیدِ قتل بھی پھر قطع ہو جائے گی قاتل سے

ہزار آنکھوں میں چھپ سکتی نہیں ہے آنکھ چاہت کی
نگاہیں ڈالتے ہی راہ دلکو ہوتی ہے دل سے

قیامت ہے ہر اک اس بانکپن پر جان دیدیگا
زمانہ بھر میں تلواریں چلینگی تیغ قاتل سے

جہاں چاہے پھرے وہ جلوہ افگن آنکھ ہی پر ہے
ہوا کب آب دریا کو فراق آغوش ساحل سے

جنوں میں بھی یقینی ہوش رہتا بدگمانی کا
چھپاتا منہ کو مجنوں جھانکتی لیلےٰ جو محمل سے

نصیبوں کی وہ خوبی وہ عنایت مہربانوں کی
تمہارے دل سے پوچھے یا کوئی پوچھے مرے دل سے

کلیم اُس کا نظارہ بھی ہے دشمن ہمنشینی کا
جب آیا غش تو اُٹھوایا گیا میں اُسکی محفل سے

حضرت مولانا صفی صاحب لکھنوی مدظلہ العالی

تار ہیں سازِ شکستہ کے وہ دمساز نہیں
ہمنشیں ہوکے جو احباب ہم آواز نہیں

جان اے مرگِ مفاجات کا پیغام اے دل
کسی کافر کی نگاہ غلط انداز نہیں

صبح جبتک نہوئی میں یہی سمجھا شبِ وصل
آج دورِ فلکِ تفرقہ انداز نہیں

نام روشن کیا پروانۂ دل سوختہ نے
ابتو اتنا بھی کوئی عاشقِ جانباز نہیں

درِ توبہ بھی ہوا بند الٰہی توبہ
میں ابھی شغلِ مناہی سے مگر باز نہیں

حُسن کے واسطے ہیں شوخ ادائیں لازم
ورنہ بیرنگ ہے جس نقش میں پرداز نہیں

کافرِ عشق سب اس کا کلمہ پڑھتے ہیں
حُسن میں کیا ہے اگر قوتِ اعجاز نہیں

پابندِ صیادِ جفا کار نہ تھے انھیں
جن تھکے بازوؤں میں طاقتِ پرواز نہیں

طپشِ دل جو یہی ہے تو رہائی معلوم
طائرِ قبلہ نما قابلِ پرواز نہیں

اب رہائی کی خوشی ہے نہ اسیری کا ملال
جانتا ہوں کہ مجھے طاقتِ پرواز نہیں

جنبشِ ابروِ صیاد پہ رہتی ہے نظر — شغل جز حسرتِ بال و پرِ پرواز نہیں
ٹوٹنے پر بھی دلِ تنگ کے پھوٹے گی نہ بو — نکہتِ غنچۂ سربستہ مرا راز نہیں
دلخراش اسقدر انداز نوازش کب تھا — کیوں مجھے چھیڑتے ہو غیر سے گر ساز نہیں
جامۂ حسن یہ جس رنگ کا چاہے پہنے — گل میں وہ طرزِ ادا وہ روشِ ناز نہیں

ترکِ دنیا پئے عقبیٰ جو ہے اک حسنِ طلب
بے نیازی پہ صفیؔ اپنی ہمیں ناز نہیں

حضرت مولانا ثاقب قزلباش لکھنوی مدظلہ العالی

غزل مشاعرہ میور سنٹرل کالج الہ آباد منعقدہ ۱۴ رنومبر ۱۹۱۵ء لکھنؤ کے مشاعرہ کی غزل آئندہ پرچہ میں چھپ گئی

خموشی پر مری کیوں یہ گمانی ہے مرے دل سے — وہ کیا نالے کرے جو سانس بھی لیتا ہو مشکل سے
کسی بسمل کو جو حاصل ہوا شمشیرِ قاتل سے — وہی مجکو مزا ملتا ہے اس دکھتے ہوئے دل سے
محبت ہو گئی تھی عشق کو اتنی مرے دل سے — کہ نکلا قاتل و مقتول میں کچھ فرق مشکل سے
فروغِ حسن انکا میں تو میں پتھر بھی کہدیگا — وہ عالم ہے کہ آئینہ نہیں ہٹتا مقابل سے
نمایاں ہو سبب کچھ عشق کی منزل میں آسانی — مرے دل کی تمنا جب نکل سکتی ہو مشکل سے
نصیبوں میں اسیری ہے تو کوئی اور کیوں چھیڑے — قفس ہو اور میں بیٹھا ہوا باتیں کروں دل سے
مرے دل کا سفینہ ہے اُس آفت خیز دریا میں — جہاں چلتی ہیں طوفانی ہوائیں ذکرِ ساحل سے
دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو — بہت کانٹے نکل آئے مری ہمراہ منزل سے
سوادِ ظلم مظلوموں کا ماتم آپ کرے گا — بجھی ہیں جب کبھی شمعیں دھواں اُٹھا ہے محفل سے
نہیں معلوم نقشِ بوریا بگڑا کہ باقی ہے — اسی کو چھوڑ کر بستر اُٹھا تا کوئے قاتل سے
یہ بیتابی کا عالم ہے کہ کوئی تھم نہیں سکتا — لہو فریاد بنکے اوڑ رہا ہے دامنِ دل سے
حدِ ہستی بہت کچھ نیستی تک کھینچ لایا ہوں — ملا دوں گا کسی دن دیکھنا منزل کو منزل سے
کنارہ ہے بحرِ ہستی کے پہنچ کر غرق ہوتا ہوں — مجھے کشتی ڈبونے کی نہ تھی امید ساحل سے

ستمگاران عالم رحم کے ہاتھوں نے مٹی دو ۔۔۔ وہ ارماں ساتھ ہیں میرے جنہیں پالا تھا مشکل
دیا کرتے ہیں لو ہر وقت جنکی قبر کے پتھر ۔۔۔ یہ شمعیں گل ہوئیں کیونکر ہوائے تیغ قاتل سے
فقط اک اہل زنداں کیا انھوں نے بھی سُنے ہونگے ۔۔۔ مرے نالے بہت اونچے گئے شور سلاسل سے
مرے چھوڑے ہوئے صحرا کی گرد ابتک نہیں بیٹھی ۔۔۔ ندا دیتا ہے ہر ذرہ کہ میں گذرا ہوں منزل سے

وہی مطلب سمجھتے ہیں مری فریاد کا تاقب
جو آسانی سے مرتے ہیں مگر جیتے ہیں مشکل سے

حضرت محشر لکھنوی مدظلہ العالی

مدتیں ہوگئی ہیں چپ رہتے ۔۔۔ کوئی سُنتا تو ہم بھی کچھ کہتے
جل گیا خشک ہو کے دامن دل ۔۔۔ اشک آنکھوں سے اور کیا بہتے
بات کی اور منھ کو آیا جگر ۔۔۔ اس سے بہتر یہی تھا چپ رہتے
ہم کو جلدی نے موت کی مارا ۔۔۔ اور جیتے تو اور غم سہتے
دل کے ناسور کی یہ حد دیکھی ۔۔۔ ہوگیا بند بہتے ہی بہتے
منتظر ہے عالم امکاں ۔۔۔ باقی ایام ہجر کیا رہتے

سبھی سُنتے تمھاری لے محشر
کوئی کہنے کی بات اگر کہتے

حضرت قاضی عبدالعزیز صاحب عزیز منصورپوری مدظلہ العالی

آئینہ لیکے کبھی آپ وہ حیراں نہوا ۔۔۔ صاف اس سے بھی غبار دل جاناں نہوا
تو اگر جنس کے گلے کا کٹنا اچھا ہوتا ۔۔۔ اب ہے اتنا کہ ترے پاس نگہداں نہوا
موت کے بعد بھی احساس رہا لذت کا ۔۔۔ ترے خنجر سے ترا کشتہ بھی بے جاں نہوا
اصل دونوں کی وہی سوز محبت ہے مگر ۔۔۔ نالہ محفل میں تری دود پریشاں نہوا
ایک جگنو ہوں کہ جلتا ہوں ضیا سے اپنی ۔۔۔ جوں چراغ شب عشرت تہ داماں نہوا

روئے بھی جب بھی ہے عشق کی تسکین نہوئی ۔۔۔ یعنی خود وہ ستم ایجاد پشیماں نہوا
آسماں کو ہے مری تنگی وحشت سے گلہ ۔۔۔ وسعت دہر کو کافی جو بیاباں نہ ہوا
ماہ و خورشید چمکتے ہیں چمکنے دیجیے ۔۔۔ تو کبھی گھر میں مرے شمع شبستاں نہوا
نام تیرا کہ حلاوت سے جدا لب نہ ہوے ۔۔۔ کام میرا؟ کہ مذاق لب و دنداں نہوا
تھا تغافل وہ محبت سے کہ بے مہری سے ۔۔۔ یہ وہ پردہ ہے کہ حیرت سے بھی عریاں نہوا
زلف تو؟ کہ سر مصحف ہے دلیل اسلام ۔۔۔ جس نے کافر تجھے جانا وہ مسلماں نہوا
وہ بھی تو مرد خدا ہوں گے خدا کے بندے ۔۔۔ جو سمجھتے ہیں کہ اُن سے کبھی عصیاں نہوا
رو دیا میں تو ہنسے تم، یہ ملاقات ہوئی! ۔۔۔ پرسش حال ہوئی! ابر بہاراں نہوا
ابر رونے کو ہمیں ہنسنے کو، میں کیا شے ہوں ۔۔۔ کبھی خنداں نہوا میں کبھی گریاں نہوا
عشق کیا عشق جو آوارۂ دیدار نہیں ۔۔۔ حسن کیا حسن جو نشتر ہوا پیکاں نہوا
پاے قاتل میں ہے سر اور کفن چاک تمام ۔۔۔ حشر میں مجھسا کوئی بے سر و ساماں نہوا

ذوق و غالب نے کہا میں بھی یہ کہتا ہوں عزیز
جو رہا تیرے بے فیض سخنداں نہ ہوا

التماس

نومبر کا نمبر آخری نمبر ہے جو دیر میں شایع ہوتا ہے اب اسکے بعد آیندہ ہر پرچہ انگریزی ماہ کی ۲۰ تاریخ تک شایع ہوجایا کرے گا ہم امید کرتے ہیں کہ "تمدن" کے بہی خواہ "تمدن" کی توسیع اشاعت میں کوشش فرمائینگے۔ اہل قلم سے استدعا ہے کہ وہ اپنے مضامین پرچہ شائع ہونے کے ۱۰ یوم بعد تک عنایت فرمادیں جب وہ اشاعت قریبہ میں شائع ہو سکیں گے۔ ہم نے اسوقت تک صرف قسم اول کا رسالہ شایع کیا تھا اور اسکی قیمت (۴) کے بجاے (۳) کردی تھی مگر اکثر صاحبان کی درخواستیں قسم دوم قیمتی (۴) کے لیے آئیں اسلیے ہمنے اس ماہ سے قسم دوم بھی جاری کردیا ہے۔ آیندہ جو صاحب خریداری منظور فرمائیں وہ قسم اول و دوم کا حوالہ ضرور دیں۔ منیجر

اصلی حُسن افزا صابون

[معزز اصحاب و حکمار یونان کے ہزاروں سارٹیفکٹ موجود ہیں
خبردار ہوشیار رہنا ایسا کہ دھوکہ کھا جاؤ کیونکہ بہت سے
جعلی اشتہار حُسن افزا صابن کے نام سے شائع ہو رہے ہیں]

جو گورے و خوبصورت ہونے کی بے نظیر ایجاد ہے۔ تازہ تازہ پھولوں اور طبی ادویات سے تیار کیا جاتا ہے جو حُسن کو دو بالا کرتا منھ اور ہاتھوں کو آئینہ وار شفاف بنا دیتا ہے اور جلد کی تمام جھائیاں۔ مہاسے۔ داغ۔ دھبے۔ پھوڑے۔ پھنسیاں زائل کر دیتا ہے اور جلد کو مخمل کے مانند ملائم اور گلاب کی پتی کیطرح خوبصورت بنا دیتا ہے صرف سات روز مل کر نہانے سے کالا رنگ کملایا ہوا چہرہ صاف ہو کر بدن گورا خوبصورت نکل آتا ہے۔ بدن پر شنجرف کی سی سرخی آنے لگتی ہے معزز رئیسوں اور خاص بیگمات نے پسند فرمایا ہے قیمت بھی معمولی ہے یعنی فی بکس تین ٹکیہ مع ایک نفیس صابون دانی کے صرف ایک روپیہ (عہ)

روغن گل بہار گیسو دراز یہ نفیس تیل جا بجا خوشبو میں لاجواب ہے۔ اسکو خواتین نے خاص طور پر پسند فرمایا ہے۔ اسکے استعمال سے روح کو تازگی اور دل کو فرحت ہوتی ہے خشکی دماغ کو رفع کرتا ہے اسکے استعمال سے بال لمبے و سیاہ اور باریک ہو کر ریشم کی طرح ملائم ہو جاتے ہیں۔ اسکی بھینی بھینی خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا ہے طبیعت ہر وقت مسرور اور ہشاش بشاش رہتی ہے قیمت فی شیشی دس تولہ ایک روپیہ (عہ)۔ دواخانہ کی بڑی فہرست مفت طلب کریں۔

پتہ: حکیم محمد یعقوب خان مالک دواخانہ
نزد تھانہ دہلی بازار فراش خانہ

ڈاکٹر برمن کی بنائی ہوئی مشہور دوائیں

خاص ہیں جن میں سے سات ہندوستان بھر میں استعمال کی جاتی ہیں

(۱) ریاح چھٹنے سے اچھا ہو [illegible] کے ساتھ [illegible] سے جیسا ہو

(۲) [illegible] اس دوا کا استعمال کیا جاتا ہے کہ [illegible] سے جاتا ہے۔

(۳) [illegible] کا نام [illegible] ہو گیا ہے [illegible] سے ہاتھ آیا

مصفی خون | [illegible] ایک [illegible] قیمت ایک شیشی [illegible]

مقوی گولیاں | [illegible] ہی طاقت دینے والی [illegible] مشہور دوا [illegible] [illegible] گولیاں [illegible] ہیں [illegible] سارے [illegible]

[illegible] نہیں ہے اس لیے اس کی [illegible] سے پیدا ہونے [illegible] کمزوری [illegible]

[illegible] ۔ [illegible] سے آرام ہوتے ہیں [illegible]

[illegible] شیشی قیمت [illegible] ایک [illegible] شیشی [illegible]

امراض مستورات کی دوا | [illegible] کے امراض مستورات کی [illegible] [illegible] بیماری [illegible] کی [illegible]

کرتا [illegible] کے استعمال سے [illegible] کی [illegible] ہو جاتا ہے [illegible]

[illegible] قیمت [illegible]

[illegible]

ڈاکٹر ایس کے برمن

[illegible]

جزو نمبر — قسم دوم — [illegible]

جلد [illegible] — نمبر [illegible]

دسمبر سنہ ۱۹۱۵ء

تمدن

معاشرتی تمدنی ادبی فلسفی اخلاقی تاریخی اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر ایم اے قادری (علیگ) دہلوی خلف اکبر جناب قادری
محمد سرفراز حسین صاحب (علیگ) عزمی دہلوی سیاح جاپان و انگلستان

فہرست مضامین

[illegible]

شُعلہ

وہ جو کوہ طور پر برق کا تھا - وہ جو فاران کی چوٹیوں پر جلوہ گر ہوا تھا اب کاغذی لباس پہن کر ایک رسالہ کی شکل میں نمودار ہے - ادبی روح پھونکے گا - اخلاقی وعظ سنائیگا - نورانی شعلوں کی تابش سے نفسانی ظلمتوں کو نیست و نابود بنائے گا وہ سینے جو آتش محبت سے سوختہ نہیں وہ قلوب جو سوز دروں سے خالی ہیں اسطرف متوجہ ہوں - عشقِ الٰہی کی لپٹیں گداز طبیعتوں سے لپٹنا چاہتی ہیں شاہدِ حُسن بے نقاب ہو کر مشتاق آنکھوں کو فرحت پہنچانے کے لیے حاضر ہے - بس "شعلہ" کی خریداری کے لیے جو ہر مہینہ آپ کی دلبستگی کا بہترین مجموعہ ہے - درخواستیں روانہ کیجیے لکھائی چھپائی بہت عمدہ

قیمت سالانہ درجہ عام دو روپے آٹھ آنے [illegible]

محصول نمونہ چار آنے کے ٹکٹ آنے پر بھیجا جاتا ہے -

المشتہر

مہتمم رسالہ دفتر شعلہ محلہ چوڑی والان دہلی

تمدن

اگر میں مرد ہوتی

انسان ہونے کی حیثیت سے مرد اور عورت دونوں یکساں ہیں۔ وہ بھی انسان۔ یہ بھی انسان۔ خدا کی طرف سے ان دونوں کے کام کسیقدر مختلف ہیں مرد کے ہاتھ پاؤں زیادہ مضبوط اس لیے بنائے ہیں کہ وہ محنت و مشقت زیادہ کرے عورت کو کمزور اس لیے بنایا ہے کہ وہ صبر اور ہیتہ مارنے کی زیادہ عادی ہو یہ تو ظاہر کا فرق ہے۔ ان دونوں میں باریک فرق یہ ہے کہ مرد دماغ سے زیادہ کام لینے کے لیے بنایا گیا ہے اور عورت دل سے۔ اسلیے اگر مجموعی حیثیت سے انسان پر نظر ڈالی جائے تو یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ مرد انسانیت کا دماغ ہے اور عورت دل۔

دنیا میں مردوں نے جو دماغ سے کام لیا ہے وہ ہر طرح تحسین و آفرین کا مستوجب ہے۔ دنیا کا انتظام۔ پیشوں اور ہنروں کی ترقی۔ علم۔ نئی نئی ایجادیں

غرض جو کچھ ترقی کے نام سے منسوب ہو سکتا ہے وہ مردوں نے دماغ ہی کی بدولت کیا ہے۔ مگر اسکے ساتھ کچھ ان میں مادہ ہی ایسی تھی کہ کسی نہ کسی بہانے وہ ہمیشہ لڑتے رہے۔ شروع میں جانوروں کی طرح کھانے پینے کی چیزوں پھر رہنے سہنے کے سامانوں۔ حتیٰ کہ عورتوں پر لڑتے رہے آگے بڑھے تو ملکوں فتح کرنے اور سچ یا جھوٹ مذہب کی طرفداری میں لڑتے رہے۔ شدہ شدہ موجودہ تہذیب کا آفتاب طلوع ہوا۔ اسمیں پہلی قسم کی لڑائیاں مذموم سمجھی گئیں مگر قومیت اور ملکیت کے خیال نے دماغوں پر تسلط کر لیا اور اب عرصہ دراز سے بڑے بڑے ملکوں اور بڑی بڑی قوموں کے درمیان جو لڑائیاں ہوتی ہیں وہ انھیں وجوہ پر مبنی ہوتی ہیں۔ فلسفہ سائنس اور معمولی علوم نے جسقدر دماغ کو روشن کیا اسیقدر باریک بینی مصلحت اندیشی اور انسانیت سے لڑائیاں ہونے لگیں۔ غالباً سلسلہ اسی طرح چلا جائے گا اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ جبتک مرد کا دماغ بالکل آزاد ہے تب تک لڑائیاں بند نہوں گی۔ قدرت مرد کی اس خصوصیت سے واقف تھی اور اسی لئے اس نے عورت کا جوہر لطیف مرد کی زندگی میں ملا دیا تھا۔ اگر ہر کام میں مرد کا دماغ اور عورت کا قلب شامل کر لیا جائے تو امید کی جا سکتی ہے کہ انسان کی زندگی امن اور آسایش سے گذرنے لگے۔

نہ میں یہ کہتی ہوں کہ مرد اور عورتیں ہر بات میں بالکل برابر ہیں نہ میں یہ طلب کرتی ہوں کہ عورتوں کو بالکل وہی حقوق ملیں جو مردوں کو حاصل ہیں میں تو صرف یہ کہتی ہوں کہ مرد تسلیم کریں کہ صرف دماغ بغیر قلب کی رہنمائی کے ہٹا ہی اور اسکے برے نتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اُدھر عورتیں خواہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہم کاموں کے محرک۔ اصلی چلانے والے

(یعنی جینڈ یا بیل) اور خود مختار منتظم نہیں ہیں۔ بلکہ جسطرح دل کا کام دماغ کو نازک اور نفیس پیرایہ میں مدد پہنچانا اور اُسکی تیزی اور خشک روی کو سموتا ہے اُسی طرح عورت کا کام مرد کو عمدہ طور پر نرم باتوں اور نفاست مزاج سے رحم اور عدل اور گذر اور جود و سخا کی طرف مائل کرتا ہے۔ اگر ماں اپنے بچے میں یہ نفیس اثر نہ پیدا کر سکی تو اُس نے اپنے فرائض کو پورے طور پر انجام نہ دیا۔ اگر بیوی اپنے شوہر میں یہ چلبلا پن نہ چھوڑ سکی تو اُس نے زندگی کے ایک بڑے مقصد کو پس پشت ڈالا۔ مردوں نے اگر عورتوں کے دل کے خداداد نفیس تبرکات کی قدر کی اور اُن کو سر آنکھوں پر نہ رکھا تو وہ ضرور خدا کے یہاں جوابدہ ہوں گے۔ اور دنیا میں بھی اُن کی زندگی تلخ رہے گی۔ مردوں کو چاہیے کہ عورتوں کو اپنا خاص اور خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا مددگار سمجھیں اور اُن سے مدد لیں۔ عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس مدد پہنچانے کا اہل ثابت کریں۔

یہانتک تو خشک بحث تھی اب میں یہ بتاؤں کہ اگر میں مرد ہوتی تو کیا کرتی۔

سب سے پہلے میں ایک عجائب خانہ بنواتی اور اُس میں مختلف مزاجوں اور مختلف شانوں کے مردوں کو علیحدہ علیحدہ پُر تکلف کمروں میں رکھتی مثلاً۔ کمرہ اسمیں چھانٹ کر نمونے کے دو چار مرد ایسے رکھتی جو در اصل بدصورت ہیں مگر اپنے تئیں خوبصورت سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ عورتیں بھی انھیں خوبصورت سمجھیں۔ کوئی آئینہ میں اپنی صورت دیکھکر خوش ہو رہا ہے۔ کوئی خواہ مخواہ مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہے۔ ایک صاحب اپنے ڈنڈوں کو مل رہے ہیں۔ تو دوسرے صاحب اس زعم میں کہ میں خوش گلو ہوں گنگنا رہے ہیں۔ تیسرے صاحب جب اپنی محبوبہ کو خوشنوسی خط لکھ رہے ہیں یا اس خوشی میں پھولے نہیں سماتے کہ اسکا ایک ایک فقرہ

پڑھنے والے کے دل کے پار ہو جائے گا اور وہ ع سارہاں جاک ہو دل پہ نامحمل کیسا کے مضمون کے موافق میرا کلمہ بھرتی ہوئی گھر سے نکل آئے گی۔

کمرہ ۲ - اس کانچی حوض میں ایک درجن راس وہ معزز حضرات ہوتے جو عورتوں کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اور اُن کو سوائے چکی چولھے ابیچوں کے گوموت کے اور کسی مصرف کا نہیں سمجھتے۔ جنھوں نے گھر کو صرف ایک سرائے مقرر کر رکھا ہے اور جو سوائے آرام پانے کے اور ہر وقت اپنے ہی کام کاج کی مصیبت ڈالنے کے گھر سے اور کوئی دلچسپی نہیں رکھتے جنھیں بیوی بچے زہر اور اُن کے اخراجات وبال معلوم ہوتے ہیں - یہ لوگ بیشتر وہ ہیں جنکی تفریحات گھر سے باہر وابستہ ہیں۔ کچھ خدا رسول کا خوف کچھ دنیا کی شرم - زیادہ تر اپنا آرام صرف یہی باتیں انھیں بادل ناخواستہ گھر کے کھونٹے سے باندھتی ہیں ورنہ اُنکا دل ہر وقت باہر ہی پڑا رہتا ہے اور ؎

حسن ایسی کیا چاٹ ہے اُس گلی کی
چھٹے اور غائب کھلے اور ندارد

تیسرا کمرہ حمام نما سنگ مرمر کے فرش کا ہوتا اس میں جے صاحب ہوتے اُن سب کے سر منڈے ہوئے ہوتے اور اُنپر پانی کی مشکیں چھٹتی ہوتیں۔ یہ وہ بزرگ ہوتے جو سرے سے شادی کرنا ہی بُرا سمجھتے ہیں۔ ان کی آزادی میں فرق آتا ہے ان کو ایک خاص حد تک لباس سے بھی معترا کر دیا جاتا - کیونکہ لباس کی جکڑ بندش اور اسکے طول طویل اہتمام سے بھی آزادی میں فرق آتا ہے - ہر قسم کے جانوروں کی خوراکیں اُن کے لیے ہم پہنچا لی جاتیں تاکہ صرف انسانی غذا کھانے سے آزادی میں فرق نہ آئے - اوڑھنا بچھونا کچھ نہ دیا جاتا پیشاب پاخانہ کے معاملہ میں قانون تہذیب سے مستثنیٰ ہوتے کیونکہ سب سے مقدم امر کہ آزادی میں فرق نہ آئے

چوتھا کمرہ کسی قدر تقدس کا رنگ لیے ہوئے ہوتا۔ اسمیں وہ بے دست و پا صابر شاکر زندہ در گور روحیں ہوتیں جو بیوی کا دانہ کھاتی ہیں۔ بیوی کی اپنی آمنی ہے تو میاں اب ہاتھ نہیں ہلاتے۔ طرہ یہ ہے کہ بیوی کو اور جھکنا پڑتا ہے کہ میاں کو ناگوار نہ گذرنے کہ میں جو نہیں کماتا تو میری حقارت کی جاتی ہے۔ غرض عورت ہر طرح مری۔

آخری کمرہ۔ اور یہی کمرہ اُس مکان کیا بلکہ سارے جہان کی جان ہوتی ہے جسمیں چند وہ لوگ مع اپنے بیوی بچوں کے راحت گزین ہوتے جنکے دل گواہی دیتے کہ ہم دنیا میں بھی سرخرو ہیں اور آخرت میں بھی سرخرو ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جو فطرت کے جید اور پاک قانون سے واقف ہیں۔ جو عورتوں اور بچوں کی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ جو محبت اور روا داری کے فرشتے بن کر ہما ہمی اور نفسانیت کے شیطان کو پا بہ زنجیر کرکے اپنے مقدس گھروں سے نکال دیتے ہیں اور جو محنت مشقت۔ محبت کفایت شعاری۔ اور میانہ روی سے گھر کو نہ صرف اپنے لیے بلکہ بیوی بچوں کے لیے بھی نمونۂ جنت بنا دیتے ہیں۔ اولٰئک ھم الفائزون (یہی کامیاب ہونے والے ہیں)

بیگم نسائی

برقع اور مستورات

دنیا کا بھی عجب حال ہے۔ ایک طرف تو نو ایجاد برقعوں کی بھرمار ہو رہی ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ عورتوں کو وقت بے وقت باہر چہل قدمی کرائی جائے تاکہ اُن کی صحت عمدہ ہو اور وہ چار دیواری میں گھٹنے رہنے کے سبب سے پژمردہ اور مریض نہ رہیں۔ مگر دوسری طرف برقعوں اور عورتوں کی جائز مشی پر نکتہ چینی کرنے کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا جاتا۔ مندرجۂ ذیل مضمون جو ایک صاحب نے بڑی عرق ریزی سے لکھا ہے اسی قبیل کا معلوم ہوتا ہے۔ اگر نسائی صاحب کی یا اُنکی طرح کسی اور خاص طرف دار صنف لطیف کی نظر پڑ گیا تو کیا تعجب ہے کہ وہ آئندہ بے ڈھنگی ڈاڑھیوں۔ انوکھی موچھوں۔ بھیانک عینکوں گنبد نما توندوں وغیرہ کے خاکے کھینچیں۔ (سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ ۷)

ایڈیٹر

رباعیات

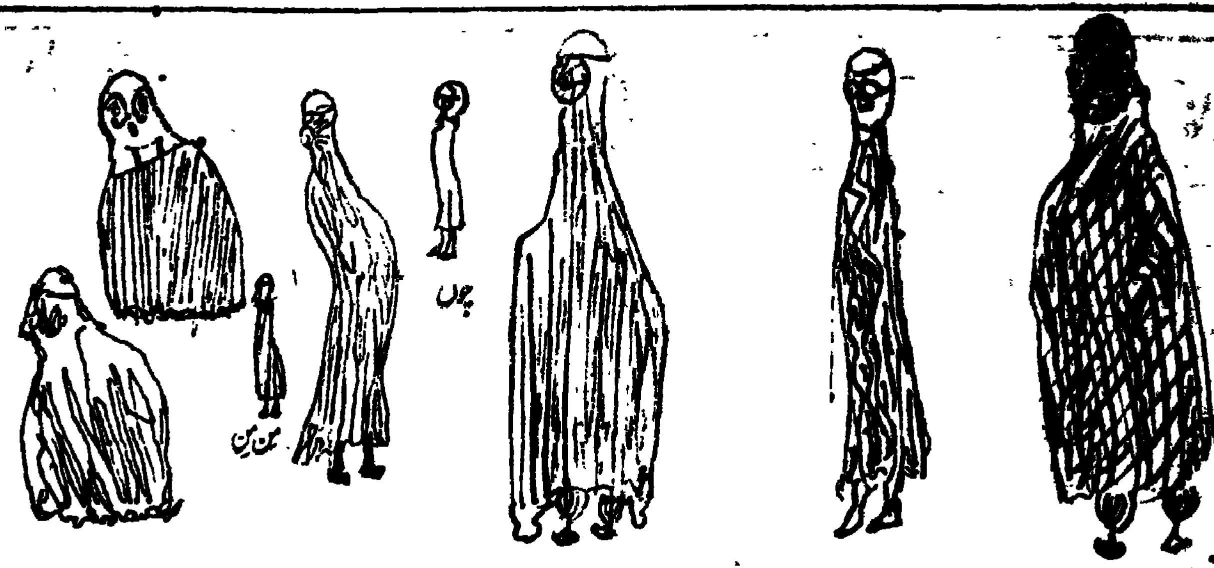
کیف مے پندار سے مدہوش نہ ہو — خاطر سے بشر کسی کی حق پوش نہ ہو
کیا عرض کروں کیا ہو نہ کیا ہو انساں — جو کچھ بھی ہو احسان فراموش نہ ہو

تقریر میں وصف خوش بیانی نہ رہا — تحریر میں رنگ نوجوانی نہ رہا
تصویر ہوں یک پیری و صد عیب کی میں — افسوس کہ لطف زندگانی نہ رہا

کیا کیا نہ پڑے رنج سے پالے مجھکو — دن رات رہے جان کے لالے مجھکو
مرکر چھوٹا ہوں قید غم سے صد شکر — اے خاک لحد! اب تو چھپا لے مجھکو

[illegible]

تمہید - شریاں صدر تنگ اسفلی



خانۂ اسد — قبیلہ عطارد — قبیلہ چرخ — قبیلہ سن سن — قبیلہ بوم

یہ ذمہ دار سیارے کثرت سے مجاز کی طرف گرا کرتے ہیں جہاں ان کی نموداری کا وقت آج ہی کل ہے۔ مگر ہماری دنیا میں بھی مناسب وقت پر فرداً فرداً یا مجموعی طور پر دیکھنے کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ رنگ گیروا یا بھنگ میلا جو کہ چند روز میں اندرونی انجرات کی وجہ سے اُداس ہو جاتا ہے مگر اس سے جذبات اور کششات پر اثر

نہیں پڑتا - ایسی صورت میں اُسکی طرف نگاہ اُٹھانے سے طبیعت کو مالش پیدا ہوتی ہے - چنانچہ حکما مریض کو اس سیارے کو دکھا کر استفراغ کراتے ہیں - یہ عجیب بات ہے کہ مکھیاں اس موجودہ حالت میں اسکی طرف بہت رغبت سے رجوع ہوتی ہیں جہلا اسکو سرپا سرنگی کہتے ہیں چونکہ ہر سہ اقسام آخری اُنکے زیر نظر گذرتے ہیں

قبیلہ سَن سَن دین ہن - ہندوستان کے بڑے شہروں کی تاریک گلیوں اور کوچوں میں رات کو آٹھ بجے پھرنے سے کبھی کبھی اسکی جھلک دکھائی دیتی ہے - اسمیں پھرتی زیادہ ہوتی ہے - خیال ہوتا ہے کہ کسی ستارے کی کشش اسکو سرعت کے ساتھ اپنی طرف کھینچ رہی ہے - مگر ٹکرا کر ٹوٹتا اور گرتا نہیں دیکھا

قبیلہ چرخ اور چوں - یہ شاید ایک ہی قبیلہ ہے - دن کو شارع عام پر حرکت کرتا ہے اور نیز میلے اور مجمع میں جیسا کہ عید گاہ یا کربلا کے نزدیک -

قبیلہ عطارد و اسد - یہ پریزاد و دیوزاد سیارے ریل کے سفر میں محسوس ہوتے ہیں - ان کی چمک مریخ اور زہرہ کو خیرہ کرتی ہے - چونکہ صرف دوربین سے دیکھے گئے ہیں اس لیے ابھی پوری واقفیت انکی ماہیت وغیرہ کی نہیں ہوی - مگر بعض کا قول ہے کہ ان کی نیش زنی اور گڑگڑاہٹ قیامت کی ہے - اگر کسی وقت ہماری زمین سے ٹکرا گئے تو آفت کا سامنا ہوگا - (سلسلہ کے ملاحظہ ہو صفحہ ؟

---

(۱) "درحقیقت دنیا میں کفایت ہے مگر سب سے اچھی کفایت وہ ہے جو قابل فہم ہو"

(۲) "ہر کام کی خوبی کام کرنے والے کی غرض پر منحصر ہوتی ہے"

(۳) "زہد سب سے زیادہ مستقل نیکی ہے اور بدترین بدی بدخوئی ہے"

(۴) "عہد کی وفا میں مستقل رہو قبل اسکے کہ میعاد ختم ہو جائے مبادا عہد شکنی سے تمھیں نقصان پہنچے"

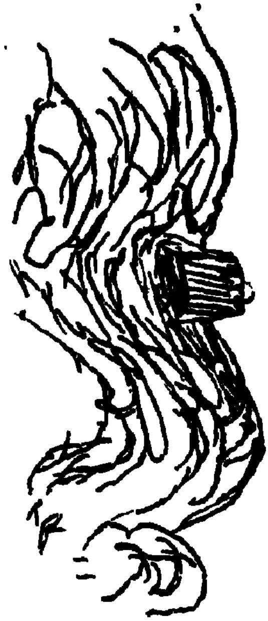
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ

تہذیب یورپشیائی کی جھلک ۔ قدرت کے عجیب نمونے کوہستان میں



یہ تابوت جھنڈا باجے کے روز یعنی ہفتہ میں تین روز نکالا جاتا ہے
مقصود عبرت نہیں حسرت ہے





ٹاپا غوطیلہ

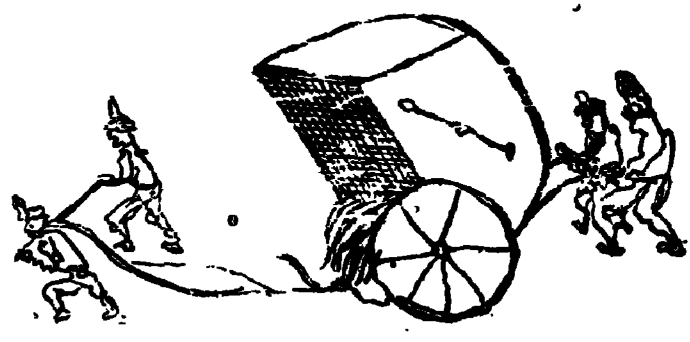
یہ نادر ٹاپا بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے۔ اول تو بوچھار سے محفوظ رکھتا ہے۔ مثلاً باران متقطر یا شعاع مجذب یا نگاہ مبصر یا الفاظ مرصع۔ البتہ کانوں میں روئی اور آنکھوں پر کلوروفیل چشمہ کی ضرورت ہے۔ خونخوار جانوروں کو اسکے قریب آنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

غوطیلہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ سمندر کی موج اسپر کچھ اثر نہیں کرتی۔ غوطہ کھایا اور پھر اوپر کو اچھل پڑا۔ اسمیں ایک گاس بھردی گئی ہے وہ نہ صرف اسکو اچھالے رکھتی ہے بلکہ روشن رہ کر گم گشتہ جہازوں کو خطرہ سے آگاہ کرتی ہے اور اپنے قریب آنے نہیں دیتی۔



بی بی شکیلہ

یہ عجائب المخلوقات قدرت کا نمونہ ہے۔ مسٹر ایچ جی ویلس کی کتاب "فوڈ فار دی گاڈس" میں جس غذا کا حوالہ دیا ہے اُسپر اس بی بی کی پرورش ہوئی ہے۔ عمر کا اندازہ صرف ٹوپی اور فراک سے ہوتا ہے۔ باقی اثر غذائیت کا ہے کہ جس سے مشرق اور مغرب میں تفاوت کا امتیاز ذرا مشکل ہو جاتا ہے اگر مصور اپنے حقوق اور ناظرین کی امید کو ملحوظ رکھکر چھتری سے کام نہ نکالتا۔ موٹر پہ ہولیٹر کی ضرورت ہے۔ ڈانڈیون اور رکشا والے کانوں پر ہاتھ سکتے ہیں۔

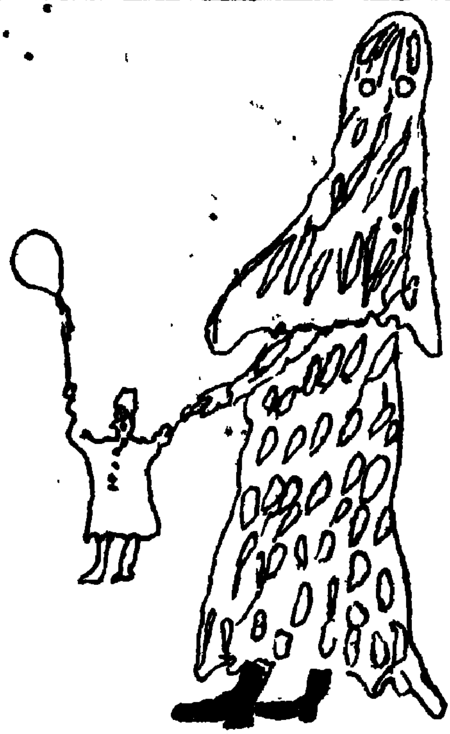


قصاب کی دوکان صبح وشام گھومتی پھرتی ہے میونسپلٹی کے قواعد کے بموجب چلمن ڈالدی گئی ہے مگر اندر قسم قسم کے پارچے موجود ہیں مثلاً سیڈل - لائن - گگ ہمپ شولڈر - بادامی - قیمہ - مغز - توخیز - بوڑھا - حلوان -

سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲

انتخاب زوج

تمدن سے اس کتاب کو خصوصیت اسلیے ہے کہ یہ اُن مضامین کا مجموعہ جو "تمدن" میں شائع ہو چکے ہیں یہ مضامین دہلی کی ایک خاتون کے قلم سے نکلے تھے جو آج کتاب کی صورت میں پیش کیے جا رہے ہیں - اس کتاب میں بے رضی کی شادی اور خاوند کے انتخاب میں لڑکی کا دخل نہونے کی خرابیاں دکھلائی گئی ہیں کتاب ایک ناول کے پیرایہ میں لکھی گئی ہے جسکی زبان نہایت پاکیزہ اور سلیس ہے جسمیں شوہر کے غلط انتخاب کیوجہ سے سوسائٹی کی ایک نوجوان خاتون کی زندگی کی تباہی کا فوٹو کھینچ کر دکھایا گیا ہے اور رسوم قبیح پر کاربند رہنے والے لوگوں سے پُر درد اپیل کی گئی ہے کہ وہ ایسے الم ناک نتائج سے سبق لے کر سوسائٹی کو تباہی سے بچائیں - ۱۸×۲۲ تقطیع پر بہت صاف لکھائی چھپائی کی کتاب صرف ۲ر قیمت پر ناظم دایرۃ الادب سے مل سکتی ہے -



سروپا انکھیلہ

یہ عجیب درخت ہے جو سرو سے مشابہ ہے زیادہ تعریف کرنی تحصیل حاصل ہے۔

سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴



چھتر یوریشیائی المعروف بہ ”بول سگ“ یعنی مشروم

یہ نباتات تازہ صحرائی ہے۔ یعنی صحرا میں پہنچکر تازہ صورت پیدا کی ہے ۔
بالیدگی اچھی ہے مگر قبل از وقت اگر شادابی نہ پہنچی تو سوکھکر رہجائیگا۔ باغبان نے نمایش کا خیال کیا
مگر ضرورت کو نہ سمجھا امید نہیں کہ انعام پائے کیونکہ ممتحن ہر چیز کو کاٹکر دیکھتے ہیں صرف صورت پر نہیں جاتے

شعراء عرب
اور
اُنکا سالانہ مشاعرہ

جسطرح تمام افراد انسانی باعتبار اتحاد و ذات و ذاتیات و بلحاظ ماہیت مشترکہ ایک کلی نوع کی تحت میں حیثیت مساوات رکھتے ہیں اسیطرح تمام طبقات عالم کے شعرا بلحاظ فلسفہ شاعری وہی نسبت آپسمیں رکھتے ہیں جو ایک نوع کے افراد میں اتحاد نوعیت کے لحاظ سے ہونی چاہیے اور بعینہٖ اُسی قسم کا تفاوت باہم شعرا میں بھی ہے جسطرح کا تفاوت نوع انسان کے افراد زید عمر بکر میں باعتبار تشخصات محضہ ہے اور زنگی و رومی و عراقی و حجازی میں بلحاظ اصناف ہے مادہ شاعری میں تمام افراد شعرا اسیطرح متحد ہیں جسطرح ماہیت۔ انسان ہے مختصر یہ کہ صرف تشخصات یا اصناف زبان میں تفاوت ہے ورنہ بادہ شاعری میں سب متحد ہیں میرا اس تمہید سے صرف اسقدر منشا ہے کہ ہر طبقہ کو دوسرے طبقہ کے جذبات شاعرانہ پر پورے طور سے روشنی ڈالنے کا حق حاصل ہے عام اس سے کہ ارباب فارس کے تخیلات شاعری ہوں یا عرب کے سنسکرت ہو یا بھاشا۔ انگریزی ہو یا یونانی۔ لاطینی ہو یا رومی۔ اگر اُردو ادب کے پرچوں میں ان سب کے ادب شاعری پر روشنی ڈالی جائے تو بجاے قابل اعتراض ہونے کے نہایت مفید ہوگا وسعت نظر کے ساتھ ہی ساتھ وسعت تخیل کا فائدہ پہنچیگا علوم کیطرف رغبت ہوگی جن کمالات اخلاقی و علمی و تمدنی وا؟ نگاری وغیرہ سے ابھی تک اُردو کی شاعری بے خبر و بیحس ہے س ہو۔ ممکن ہی کچھ توجہ ہو۔ مجکو اس تمہید کے بعد اولاً یہ دکھانا ہے کہ مادہ شاعری جو تمام افراد شعرا میں ماہیت مشترکہ کی طرح پایا جاتا ہے شعراء عالم کے مختلف اصناف میں سے کن کن اصناف میں بیاعد

زیادتی و کمال کے ساتھ پایا جاتا ہے اور کن اصناف میں کمی و نقصان کے ساتھ موجود ہے
دنیا کی تاریخ پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جسطرح اعراب نے تمام تو ہشترکہ
انسانی میں مثل علم و عقل و جودت و ذہانت و حافظہ و علم الاخلاق و تمدن و صنعت و حرفت وغیرہ کے
مقابل میں اپنی افراد قومی کے سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اُسیطرح مادۂ شاعری میں بھی اُنکا نمبر سب سے زیادہ
رہا اور کیف شاعری بھی سب سے زیادہ پردۂ عدم سے بزم شہود میں لیکر آئے چنانچہ فن شاعری میں
عربوں نے ایسی ترقی کی تھی کہ رسالتمآب کے زمانہ کے بہت ہی قبل بلکہ صدیوں پہلے اُنھوں نے ایک
سالانہ مشاعرہ قصبہ عکاظ میں جو کہ مکہ معظمہ سے غالباً تین دن کی راہ ہے قرار دیا تھا اس مشاعرہ میں
عربستان کے کل اطراف و جوانب سے شعرا آکے جمع ہوتے تھے اور ہر ایک دوسری کو کمال نیک نیتی
کے ساتھ داد سخن دیتا تھا صرف زبانی داد سخن پر اس مشاعرہ کا خاتمہ نہیں ہوتا تھا بلکہ انصاف
تنقیدی نظر سے تمام شعرا کے کلام کو جانچنے کے بعد جو کلام سب سے اچھا سمجھا جاتا تھا
اور در حقیقت وہ اُس مشاعرہ میں نسبتاً سب سے بہتر و عمدہ ہوتا بھی تھا وہ نہایت بیش بہا
چیزوں پر سونے کے حرفوں سے لکھکر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ خانۂ کعبہ میں آئندہ مشاعرہ
کے وسطی لٹکا دیا جاتا تھا ہمکو دنیا میں اس قسم کی مثال طبقۂ شعرا میں ڈھونڈے نہیں ملتی
ممکن ہے کہ کسی صاحب نے پائی ہو اس سے زائد مذاق شاعری میں کمال کا درجہ میری محدود
نظر میں نے نہیں دیکھا ہے اور خدا معلوم اس سالانہ مشاعرہ کے علاوہ اور کتنے مشاعرے
ماہوار و ہفتہ وار منعقد ہوتے ہونگے کیونکہ اُس زمانہ کا بڑھا ہوا مذاق اور عربوں کی بیچین
طبیعتیں سال بھر کی مدت مدید کے انتظار میں ہرگز ساکت و خاموش نہیں رہ سکتیں -
لیکن افسوس کہ ہم کوئی اسکا تاریخی ثبوت نہیں دے سکتے کیونکہ شعرا عرب اور دیگر حصص عربستان
کا نہایتا ادب ہم لوگوں تک نہیں پہنچا ہے اور تاریخ بالکل اُس زمانہ کے ادب کے متعلق
ساکت ہے ہاں اگر ہم کو ملتا ہے تو سنہ عیسوی کے مابعد اور سنہ ہجری کے ماقبل کا کلام
ملتا ہے جسکا کچھ حصہ عشق میں ہے اور کچھ حصہ جنگ کے متعلق ہے اس سے معلوم ہوتا

انھیں وجوہ سے اعراب کے قدیمی مذاق ہیں جو اس وقت تک اتنے ہی دلچسپی کے ساتھ ان میں موجود ہیں ہمکو اُس کلام میں عرب کے جو اُنکے زمانۂ جاہلیت کا ہے قلت استعارات و کنایات نظر آتا ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اُنکے شاعرانہ جذبات کا تعلق بہ نسبت تخیلات کے محسوسات کیطرف زائد تھا۔ بالفعل میں اُن سات شاعروں میں سے کسی کے متعلق کچھ لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں جو سبع معلقات کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں یہ وہی مشاعرہ ہیں جو قصبہ عکاظ میں سنہ کے بہت قبل زمانۂ جاہلیت میں منعقد ہوتے تھے ان مشاعروں کا بھی حال شاید ہم تک اور یہ کلام نہ پہنچتا اگر یہ اس حیثیت کے ساتھ خانۂ کعبہ پر آویزاں نہ کیے جاتے یعنی تو عرب میں ہر زمانہ میں شعرا پیدا ہوتے رہے اور شاعری کا چرچا گرما گرمی سے ہوتا رہا مگر تحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کو ایسا زور و عروج کبھی نہیں ہوا جیسا زمانۂ جاہلیت میں تھا عرب کا ہر خطہ و گروہ اسکے ہر طبقہ کے لوگ یہاں تک کہ فلاسفر اور ریاضی داں وماہرین تک یہاں تک کہ اطبا بھی اس سے خالی نہ تھے اور کم و بیش یہ جوہر لطیف بحیثیت جوہر ثبت پایا جاتا تھا میری رائے میں یہ شعرائے عرب کی شاعری کے معراج الکمال تھے کہ فقہ و فلسفہ و جبر و مقابلہ کو بھی نظم ہی کے قالب میں ڈھال کے سمجھے جاتے تھے یہ کہنا غلط نہیں ہو سکتا کہ تمام دنیا کے شعرا ایک طرف اور شعرائے عرب کے کلام ایک طرف ہم ان مشاعروں میں جو جو شعرا شریک ہوتے تھے یا جو جو اکابرین عرب یہاں سے بغرض سماعت آتے تھے اُنکی تفصیلی فہرست دینے سے افسوس کہ مجبور ہیں ہم نے بہت کوشش کی لیکن تاریخ اس وادی میں آ کے بالکل رُکی ہوئی ہے کیونکہ ہم یہ واقعات کم سے کم ہجری سے ایک صدی قبل کے لکھ رہے ہیں ہاں ان مشاعروں میں کامیابی کا سہرا جن جن شعرا کے سر بندھا ہے اُنکا مختصر ذکر کرینگے اور انشاءاللہ انھیں کے کلام پر روشنی بھی ڈالیں گے بشرطیکہ [illegible] کو اسکی طرف کچھ توجہ و دلچسپی بھی ہو۔ (باقی آئندہ)

سید علی آشفتہ لکھنوی

عالمِ تصور کے چند لمحے

او اندھیاری رات تو چاہے کتنی ہی بھیانک بن، ہاں، مان لیا تو طالع مجنوں سے ہم آغوش ہو چکی ہے لیکن میری سیہ بختی سے تیری تاریکی و ظلمت کو کیا نسبت، کہاں کوہ کہاں کاہ،

تیرے لیے آخر میں پیغام نو ہے جو تیری چوٹی کی سیاہ میں پوشیدہ طور پر لپٹا ہوا ہے مجھے اطمینان ہے کہ تیری افشاں کا سب سے بڑا ستارہ پھر چمکنے والا ہے لیکن میرے لیے تیری پر کرب طوالتوں میں پیام نور کہاں۔

تجکو اگر اپنے وحشت خیز سکوت میں شب زندہ دار کی ہولناک (ہو) پر کچھ ناز ہو تو ادھر دیکھ میری جگر سوز خاموشی اور تاب شکن خودداری (جو اب نصیب دشمناں شاید کسی کے پیمان وفا کی طرح چور چور ہوجائے گی) "کوئی آہ (ہزاروں روک کے بادلوں کو ہوا کی طرح چیرتی ہوئی) مضطرب قلب سے بیزار ہو کر لب نا مانوس فریاد جب اپنی غیر محسوس اور نہ نظر آنے والی ہستی بناتی ہے اور ساتھ ہی غیر آباد ویران پہلو سے ہُوک غولِ بیابان کی طرح اُٹھکر جگر کو کباب سیخ بنا کر کام و دہن کو خشک کرکے کسی مرست جفا پیشہ کی طرح۔ جب اُس ہستی کو چھڑاتی ہے" تو لاکھوں وحشتیں ہیں جو تجھکو وہم بھی میسر نہیں آسکتی ہیں میرے چہرے کی بلائیں لیتی ہیں۔

تیری تمام کائنات میری ہی زلف برہم کی طرح شانہ شعاع خورشید سے برہمی پذیر ہے تو اس سے کیا اتراتی ہے جو جلوۂ خورشید بھی میسر شدہ نہ ہو جسکو تیرا سایہ اور دامن خورشید یکساں ہو شاید تجکو اسپر ناز ہو کہ

تیرے پردہ میں اکثر دل گرفتہ سنسان جنگلوں میں بانسری ہی کی زبان میں اپنا درد دل شناسا کرسمہ منزل دلوں میں آگ لگا یا کرتے ہیں۔

لیکن تجکو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ سب میرے ہی ماجرا درد کے ترجمان ہیں۔ آہ دردِ جان سے پیارا درد جناں کہیں بھی ہے میرا رشتہ دار ہے۔

تجھ واژگون پیکر کا اس میں کیا ہے۔

اب تو آ ہی گئی ہے تو خیر آ تو کچھ نہ سہی تاہم میں تجکو اپنی خلوت میں جگہ دیتی ہوں۔ افسوس میری طرح تو بھی گھبرائی ہوئی ہے آ تجھ سے دو باتیں کرکے تیرا دل بہلا دوں۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ میری باتیں تیرا دکھڑا نہیں ہیں جنکو تو نیاز یا خلیقی وصحافی سے کہتی پھرے۔ یہ کتاب دل کی شرح ہے۔ جو صرف اسی کو سنائی جائیگی "جسکو ابتک تو نہیں ہی جانتی ہوں"۔

(۲)

شب تاریک دود و یا گیر)

میں کیا تھی

جیسے چینی کی مورت کسی خوشنما طاق پر باریاب ہوکر طرۂ آرائش ہوا کرتی ہے ایسے ہی میں بھی آغوش مادر میں چلتی پھرتی بولتی چالتی سونے کی نہایت نظر فریب مورت تھی۔

میری بلا کو خبر تھی کہ خندۂ خورشید میں کسقدر فرحتیں مخلوقات عالم کے لیے قدرت ارزانی فرماتی ہے اور لیلی شب کے تبسم سے کسقدر بجلیاں گداز دلوں پر کوندجا یا کرتی ہیں۔ ناگاہ یہ بھولی دنیا میرے بالے پن کے ساتھ ساتھ ہمیشہ کو عالم یاد میں سدھارے گی اور مجھکو ایک ایسے ہولناک میدان میں مسافرانہ غریب الوطن ہوکر آنا پڑا جس سے میں واقف نہ تھی۔

(باقی آئندہ) نظفر حسن علوی

محبّت

اخلاق نتیجہ ہے وجود بشری کا آفاق میں باعث ہے یہی ناموری کا
مغرور میں کیوں عیب نہو کج نظری کا بدلا یہ ملا ہے اُسے شوریدہ سری کا
کج خلق کو کوئی شہرۂ آفاق نہیں ہے
انساں نہیں جو صاحب اخلاق نہیں ہے

ذکر روش اہل جہاں ہو نہیں سکتا کچھ حال زمانہ کا بیاں ہو نہیں سکتا
وہ درد ہے دل میں کہ نہاں ہو نہیں سکتا مجبور ہیں اب ضبط فغاں ہو نہیں سکتا
رنج اُن سے ہے جو صاحب انصاف نہیں ہیں
دعویٰ تو صفائی کا ہے پر صاف نہیں ہیں

افسوس بہت سرد ہے بازار محبت کمیاب ہیں عالم میں خریدار محبت
پاتے جو نہیں داروئے آزار محبت بے موت مرے جاتے ہیں بیمار محبت
مملو زر اخلاص ہی سے صدر نہیں ہے
وہ کیا ہیں محبّت کی جنھیں قدر نہیں ہے

بے شک قمر چہرۂ زیبا ہے محبّت دل بس وہی دل ہے جو ہو شیدائے محبت
وہ آنکھ نہیں جو نہیں جو نہیں جویائے محبت وہ سر نہیں جس میں نہیں سودائے محبت
خالی ہے وہ سینہ کوئی حسرت نہیں جس میں
پہلو ہے وہ کیا درد محبت نہیں جس میں

دنیا میں ہیں جو واقف اعزاز محبت وہ دل میں چھپائے ہوئے ہیں راز محبت
پاتے ہیں جو کچھ ذائقۂ ناز محبت دل سے ہیں وہ دلدادۂ انداز محبت
دنیا کے ہزاروں میں ہیں عیبوں سے بری ہے

جو شیشہ دل میں ہے نہاں یہ وہ پری ہے

اس جنس گرانقدر کے ماہر ہیں بہت کم　　جو حاصل الفت ہو بہ از عیش ہے وہ غم
کہتے ہیں قسم کھا کے محبت ہی کی اب ہم　　ہے اسکے طلبگاروں کا اک دوسرا عالم

مغموم کسی حال میں دیکھا نہیں اُن کو
بستی ہو کہ صحرا کوئی پروا نہیں اُن کو

ہے دوست کی الفت بھی یہی دست عجب دست　　بنجاتی ہے خلوت میں دم رنج و تعب دوست
لیکن ہیں فقط نام کے دنیا میں تو سب دوست　　پر دہر میں ملتا ہے کسی کو کوئی کب دوست

جو دوست ہیں باہم عجب اوصاف ہیں اُنکے
آئینے بھی ہیں گرد وہ دل صاف ہیں اُنکے

پی لیتے ہیں آپس میں محبت کا جو بادہ　　ہو جاتے ہیں اس نشہ سے ہشیار زیادہ
کرتے ہیں جو کچھ کہنے کا باہم وہ ارادہ　　بن جاتا ہے قصد انکا دلوں کے لیے جادہ

کر دیتی ہے حال اسکا بیان سب نظر اُسکی
ہو جاتی ہے اس دوست کو فوراً خبر اُسکی

لیکن وہ محبت کہ غرض جسمیں ہو شامل　　ہرگز نہ پسند اسکو کرے گا کوئی عاقل
مطلب سے جو خالی ہو وہ ہے الفت کامل　　پھر کیوں نہ محبت کو کہیں عقدہ مشکل

ہر طرح بشر نور کا گنجینہ بنا دے
یوں دل کو کرے صاف کہ آئینہ بنا دے

دعواے محبت ہو تو پروانہ کو دیکھے　　شاکی نہ کسی زلف کا ہو شانہ کو دیکھے
گر عشق بڑھے قیس سے دیوانہ کو دیکھے　　انصاف سے خود قلب کے پیمانہ کو دیکھے

ہو درد اگر شوق فغاں سینے میں رکھے
بلبل کی طرح سوز نہاں سینے میں رکھے

محمد رشدی لکھنوی

جان گئی

شہر لکھنؤ میں گومتی کے کنارے والی سڑک پر ایک نوجوان نہایت عمدہ انگریزی لباس زیب تن کیے کسی خاص خیال میں محو چلا جاتا ہے صورت شکل نہایت موزوں اور اسقدر موزوں کہ حسین کہلائے جانے کی مستحق۔ خاکستائی رنگ کے سوٹ پر یہ تبدیلیوں والی بو کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس سڑک پر یہ نوجوان کوئی آدھی دور گیا ہوگا کہ رومال نکال کر پسینہ پونچھا اور کچھ سوچ کر لوٹا اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اس نوجوان کو لاٹوش روڈ پر ایک بنگلہ میں بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ اپنے دل سے اسطرح گفتگو کر رہا ہے۔

یہ مانا کہ اس نے انکار کر دیا کہ آپ میرے حال پر عنایت کرنی چھوڑ دیں مگر میں کیا کروں اس دل نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ آخر تو کیا چاہتا ہے۔

دل۔ میں بیچارہ تو نہ تم سے کہتا نہ سنتا اگر یہ آپ کی رفیق آنکھیں آپ کے لیے یہ سامان راحت پیدا نہ کر دیتیں۔ آنکھوں نے آپ کی مس صاحبہ کو دیکھا اور اسکے بعد میری سخت خوشامد کی کہ میرا کام جو کچھ تھا وہ تو ہو چکا اب جب تک حضرت دل آپ میری مدد نہ کریں گے جبتک میرا کام نہیں بنے گا۔ اگر آپ نے بری دوستی کی تو میں فاقہ مر جاؤں گی آپ ہی بتائیے کہ میں ان بیچاریوں کی کیوں نہ مدد کرتا جب یہ اپنی

لاچاری ظاہر کرکے میری مدد کی طالب ہوتی تھیں ۔ مگر مجھے ہرگز یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ آنکھیں مار آستین کا کام دیں گی اور ان کی یہ سازباز مجھے ہی تباہ کرنے والی ہوگی ۔ اب گو آنکھوں کا بھی آپ پر تقاضا رہتا ہے کہ ہم نرس صاحبہ کو دیکھیں گے مگر میرا تو ایسا سخت حکم آپ پر لگتا ہے کہ اگر آپ اسکے خلاف کریں تو آپ کی زندگی ہی طے ہو جائے ۔ اب مقطع کا بند یہ ہے کہ گو آپ نے بہت ذلتیں سہیں یہانتک کہ صاف جواب مل گیا کہ یہاں آنا چھوڑ دو مگر ایک دفعہ اور چل کر کوشش کرو ۔

جناب دل ۔ میرے تڑپانے والے دل میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ایک دفعہ تو اور تقدیر آزمائی کرنی چاہیے ۔ اچھا چلو اب ہمارے نوجوان پھر اُٹھے کپڑوں پر برش کیا بائیسکل اُٹھائی اور چل نکلے مس صاحبہ کے بنگلے پر پہنچے اپنا کارڈ بھجوایا اس وقت مس صاحبہ اُن حضرت کی ملاقات میں مصروف تھیں جن پر انکی نئی نظرِ عنایت ہوئی تھی ۔

ہمارے نوجوان کا کارڈ دیکھکر مس صاحبہ بہت ناراض ہوئیں ۔ اور نوکر سے کہدیا کہ " ان سے بول دو کہ اب ہم کو دق مت کریں " نوکر نے آن کر ان کو یہ جواب دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ گول کمرہ میں ... صاحب سے باتیں کر رہی ہیں ۔

یہ دونوں پیغامات سُنتے ہی ہمارے نوجوان کی حالت متغیر ہوگئی ۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں ۔ اور خجالت کے مارے عرق عرق ہو گئے کہ کاشکے وہ لکھکر یہ پیغام دیتیں کہ تم نہ آیا کرو تو یہ ذلت نہ ہوتی ۔ خیر جو کچھ ہوتا تھا سو ہوگیا ایسی زندگی سے موت بدرجہ بہتر ہے

اب یہ یہاں سے روانہ ہوئے اور اپنی کوٹھی پر پہنچے۔ ان کے والد صاحب کو جو یہاں ڈسٹرکٹ جج ہیں اس امر کی اطلاع ہو چکی تھی انھوں نے ان کو بلایا اور ڈانٹنا شروع کیا۔ اور اس سال بی۔ اے میں فیل ہو جانے کا ذکر کیا اور کہا کہ کاشکے ایسی اولاد ہونے سے میں لاولد ہوتا۔ ڈوب مرنے کی بات ہے کہ باپ تو بی۔ اے میں یونیورسٹی میں اوّل آئے اور بیٹا اور ایسے باپ کا بیٹا فیل ہو جائے اگر میں اسکی جگہ ہوتا تو زہر کھا لیتا اور دنیا میں مُنھ نہ دکھاتا۔

ہمارے نوجوان تو وہاں کے نکالے ہوئے اور زخم خوردہ سے تھے والد صاحب کے اس غصّہ نے مرے پر سو دُرّوں کا کام کیا۔ اُٹھ کر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ اور چاروں طرف کے کواڑ بند کرکے پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگے اور آخر کو یہ فیصلہ کیا کہ اب دنیا میں زندہ رہنا بے کار ہے۔

مرنے کا قطعی ارادہ کرکے پہلے بہت دیر تک روتے رہے اسکے بعد مِس صاحبہ کے خطوط نکال کر سب کو پڑھا اور ان کو انگیٹھی میں رکھکر جلا دیا۔ اسکے بعد میز پر آئے اور یہ لکھا۔

"کہ میں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اب زندہ رہنا بیکار ہے اور اس لیے میں اپنا خاتمہ کرتا ہوں"

یہ خط لکھکر اپنے والد کے کمرے میں داخل ہوئے اور انکی الماری میں سے ریوالور نکال کر اپنے دل پر رکھا اور بسم اللہ کہکر ریوالور کا گھوڑا دبا دیا۔ اسکی آواز کو سنتے ہی سب لوگ کمرہ میں پہنچے۔ دیکھا تو ہمارے نوجوان تڑپ رہا ہے اور تھوڑی دیر میں ملک عدم کو سدھار گیا۔ کپڑے اُتارتے وقت اسکی جیب میں سے وہ خط نکلا۔

کیوپڈ و سایک

(بسلسلہ تمدن ماہ نومبر)

(۷)

ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک کوہ اولمپس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے کسی آبادی کو اپنے دامن میں جگہ دی ہو، کیونکہ اُسکی بلند چوٹیاں نہ صرف اسوجہ سے کہ خداوند جوپیٹر کی تجلی گاہ تھیں، بلکہ اسوجہ سے بھی کہ اُنکو آباد کرنا اک انسانی قوت سے باہر تھا، ہمیشہ ویران اور سنسان رہیں۔ ناقابل پیمائش غاروں کی تاریک وسعت، نہایت ہولناک سیاہ پانی کے چشموں کی اُسمیں روانی، بڑے بڑے درختوں سے پیدا ہونے والا ہوا کا مہیب سناٹا، خوفناک درندوں کی گرج کی آوازِ بازگشت اور بڑے بڑے کانٹوں والی جھاڑیوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ اور اسی طرح کی اور بہت سی ڈراؤنی چیزوں اور جسم میں لرزہ پیدا کر دینے والے مناظر کا مجموعہ۔ یہ تھا کوہ اولمپس، جہاں کیوپڈ نے سایک کے ساتھ رہنا پسند کیا اور جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کیوپڈ سب دیوتاؤں میں بہت کمسن، ناتجربہ کار اور نازک دیوتا … … تھا تو یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اُس نے کیوں ایسے زہرہ گداز مقام کو سایک کے قیام کے لیے منتخب کیا۔ مگر نہیں یہ انتخاب اُس نے اپنی کمسنی اور ناتجربہ کاری ہی کے لحاظ سے کیا تھا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ جب اُسکی ماں وینس کو خبر ہو جائے گی تو وہ کوئی دقیقہ سایک کی ہلاکت کے لیے نہ اُٹھا رکھے گی۔ پھر وہ کہاں جاتا؟

کوہ اولمپس ہی اک ایسا ٹھکانا تھا، جہاں کسی کی رسائی نہ تھی اور وہ اپنی زندگی سایک کے ساتھ امن و سکون میں بسر کر سکتا تھا۔ کیونکہ جب جوپیٹر کو کوئی عذاب نازل

کرتا ہوتا تھا تو وہ اسی پہاڑ کی چوٹیوں پر اُتر آتا تھا اور عذاب نازل کرتا تھا چنانچہ اس سے قبل بار ہا اولمپس کی چوٹیوں سے جیوپٹر کا غصہ آگ بنکر نکلا اور دور دور کی آبادیوں کو بھی تباہ کر دیا پھر ایسی جگہ جو آسمان کے دیوتاؤں میں سب سے بڑے دیوتا کے قہر کرنے کی جگہ ہو کون جا سکتا تھا یا کس کو ہمت ہو سکتی تھی کہ وہاں جانے کا خیال دل میں لائے مگر کیوپڈ چونکہ جیوپٹر کا محبوب ترین فرزند تھا اور اپنی خدمات کے لحاظ سے نہایت اہم دیوتا تھا اسلیے وہ وہاں پہنچ سکا اور اپنے ساتھ رہنے والی مخصوص دیویوں مارفیس و زفر کو بھی اپنے ساتھ لا سکا۔

اس زرّیں قصر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے جو اُس نے سایک کو مسرور کرنے کے لیے تیار کیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ کیوپڈ سے مواصلت کی مسرت ایک ایسی مسرت سایک کے لیے تھی کہ ایک ہفتہ تک تو اُسے یہ ہوش بھی نہیں ہوا کہ وہ ہے کہاں اور نہ اسکا وہ کبھی خیال کر سکتی تھی، کیونکہ اب تو اُسکے دل میں صرف ایک آرزو تھی کہ وہ کسی وقت کیوپڈ سے جدا نہو مگر پورے ایک ہفتہ تک تو اس برج طلائی کی خلوت میں بند رہنے کے بعد وہ وقت آیا کہ سایک کو اپنی نئی زندگی پر کچھ غور کرنا پڑا اور اب اُسے یہ دلشکن حقیقت معلوم ہوئی کہ اب کیوپڈ اس سے زیادہ مسلسل وقت اُسے نہیں دے سکتا، کیونکہ انہیں آٹھ دس دن میں کیوپڈ کے معطل بیٹھ رہنے سے کرۂ ارض میں بے رحمی، کج خلقی، اور ورد زندگی بہت پھیل گئی تھی اور اس لیے ضرورت تھی کہ وہ اپنے تیر و کمان سنبھال کر نہایت سرگرمی کے ساتھ چند دن کام کرے اور جتنی کمی محبت کی دنیا میں ہو گئی ہے اُسے پورا کر دے۔

نہ سایک کو اُسوقت تک اس بات کا علم تھا کہ اُسکا شوہر یا عاشق کیوپڈ ہے اور نہ کیوپڈ ہی اس حقیقت کا اظہار اس پر کر سکتا تھا اس لیے اُس نے سایک کو یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اُسکے فرائض کیا ہیں اور کیونکہ یہ معلوم کرنے کے بعد کون جوان لڑکی ایسی تھی جو نہ پہچان لیتی) مگر ہاں اُس نے اپنی رعائی کو نہایت اہم وجوہ کی بنا پر ضروری قرار دے کر سایک سے اجازت طلب کی اور کہا کہ اس مختصر غیر حاضری سے اُسکی محبت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا سایک نے

آخرکار بادل ناخواستہ اُسکو اجازت دی، لیکن سوال یہ تھا کہ جبتک وہ آئے گا سایک کیونکر اپنا وقت بسر کرے گی، کن مشاغل میں اپنے تئیں الجھائے رکھے گی؟ - اسکا حل بیشک ذرا دشوار تھا، لیکن آخرکار سایک نے کچھ غور کرنے کے بعد کیوپڈ سے کہا کہ وہ حوالی قصر میں اُن تمام سامان تفریح کو مہیا کردے، جنکی وہ اپنے زمانہ دوشیزگی میں عادی تھی۔ کیوپڈ نے فوراً فرش سے دو گلدستے لے کر زمین پر دے مارے جو زمین میں غائب ہو گئے اور بجائے اُن کے دو حسین فرشتے جن کے پروں میں الماس ٹکے ہوئے تھے اور جن کی عمر میں چودہ سال سے زائد نہ تھیں نکلکر سایک کے سامنے کھڑے ہو گئے، کیوپڈ نے اُنسے کہا کہ "جاؤ اور قبل اسکے کہ ملکہ سایک اُٹھکر دروازہ تک پہنچے، تمام حوالی قصر کو ان مناظر سے آباد کردو جو والی یونان کے محل سے متعلق ہیں" اُن کو رخصت کرکے کیوپڈ نے جتنے گلدستے وہاں رکھے تھے سبکو فرش زمین پر ٹپکنا شروع کیا یہاں تک کہ چشم زدن میں سارا قصر نہایت حسین پریوں سے بھر گیا اور سایک ان پریدار حبیش خدمتوں سے گھر گئی۔ اُنکے ہاتھوں میں مختلف قسم کے ساز تھے جن کے تاروں سے ارتعاش کے وقت عجیب مشکر خوشبو پیدا ہوتی تھی، سایک اس مختصر زمانہ میں اس نوع کے عجائب و غرائب سے اس درجہ آشنا ہو گئی تھی کہ اُسے زیادہ حیرت نہیں ہوی اور وہ کیوپڈ کے شانے پر ہاتھ رکھکر پریوں کے حلقے میں قصر سے باہر نکلی، لیکن اُسکی نگاہ دروازہ سے باہر نکلکر پھیلی ہی تھی کہ وہ ششدر رہ گئی، کیونکہ اُسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ چند لمحات میں، شاہ یونان کا باغ مع اپنی روشوں، کنجوں، درختوں حوضوں، فواروں، اور نہروں کے کیونکر یہاں منتقل ہو سکا، وہ اس باغ اور اُس باغ میں سوائے اسکے اور کچھ فرق نہ پاتی تھی کہ وہاں بلور کے ٹکڑے روشوں پر پھیلے ہوئے تھے اور یہاں ذرہ ہائے الماس، وہاں حوض سنگ مرمر

اور بلور کے تھے اور یہاں شفاف طلا و صیقل کی ہوی چاندی کے، وہاں حوض کی مچھلیاں صرف رنگین تھیں اور یہاں رنگین بھی تھیں اور درخشاں بھی۔ ساپک خوش خوش اس باغ میں داخل ہوی اور ٹہلتے ٹہلتے ہر چیز کو دیکھتی ہوی پھولوں کو سونگھتی کیوپڈ کو لے کر ایک کنج کے اندر چلی گئی، اور ساری پریاں باہر مودب کھڑی رہیں، شام ہو گئی تھی اور چاند نکل آیا تھا اس لیے پھر سائک یہاں سے نہیں نکلی اور وہ رات قصداً اُسنے کیوپڈ کے ساتھ اُس کنج میں بسر کرنا چاہی کیونکہ جب وہ یونان میں تھی تو یہی کنج تھا جہاں اُس نے پوری ایک طویل رات نہایت حسرت و ناکامی کی حالت میں کاٹی تھی اور اسیلیے آج وہ اس چاندنی کو جلانا چاہتی تھی جس نے ساپک کو اسدن بہت تڑپایا تھا۔

صبح ہوی اور کیوپڈ کے رخصت ہونے کا وقت آیا۔ ہر چند ساپک کو یہ جدائی نہایت شاق تھی، لیکن اس نے کہا "کہ اچھا جاؤ میں بھی جب تک تم نہ آؤگے پھولوں کے ہار تمھارے لیے گوندھا کروں گی اور پھر انھیں یہ کہکر توڑ ڈالا کروں گی کہ اچھے نہیں گندھے، یہانتک کہ تم آجاؤگے اور تب صرف ایک ناتمام ہار تمھارے محبت بھرے سینہ کے لیے پیش کرسکوں گی۔"

کیوپڈ نے جلدی سے ساپک کو آغوش میں کھینچکر

فضا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گیا۔

(۸)

کچھ زمانہ اسی انداز سے گزر گیا کہ کیوپڈ دو چار دن کے لیے باہر چلا جاتا تھا اور پھر اک نیا شوق، نیا جوش لے کر واپس آتا اور ساپک کے پاس آکر رہتا ہر چند سائک بھی اُسکی عادی بننا چاہتی تھی اور کیوپڈ کی غیبت میں وہ انتظار کی گھڑیاں کو مختلف مشاغل تفریح میں کاٹتی تھی، لیکن، وہ کیوپڈ کی اس گھڑی

گھڑی کی مفارقت سے بسا اوقات بہت دلگرفتہ اور مضمحل ہوجاتی ہے کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُسی کا ہمجنس مل جائے اور وہ اُس سے اپنی موجودہ کامرانی کی داد سے وہ ان پریوں سے اشارہ سے کام لیا کرتی تھی، کیونکہ کام کرنے والی پریاں بات نہیں کرسکتیں اور شاید کیوپڈ نے قصداً ایسی پیش خدمتیں مہیا نہیں کیں جن سے وہ ایک گفتگو کرسکتی۔ غرضکہ جب کیوپڈ چلا جاتا تو وہ سخت متوحش ہوجاتی اور باوصف اسکے کہ کنیزوں کی ایک کثیر تعداد اُسکے جلو میں ہوتی، لیکن وہ ان بیجان یعنی بے زبان متحرک تصویروں سے گھبرا کر یہی سمجھتی کہ "میں تو اب بھی ویسی ہی تنہا ہوں" جسوقت تک عورت اپنی محبت میں کامیاب نہیں ہوتی، اُسوقت تک اُسکی زندگی اِک کلی کی سی خلوت آرمیدہ زندگی ہے نہ وہ کہیں جانا پسند کرتی ہے اور نہ کسی سے بات کرتا، لیکن جب وہ اپنی محبت میں کامیاب ہوجائے، جب اُسکی حیات معاشقہ اک عملی صورت اختیار کرلے، تو وہ تنہا ہونے پر بھی بجائے خود اک انجمن ہے اور خلوت سے بیزار جب تک اُسکی محبت کا کوئی جواب دینے والا نہیں ہوتا وہ یہی آرزو کیا کرتی ہے کہ کوئی اُسے یہ بتائے کہ اُسکے حسن و شباب میں کچھ لذتیں ہیں بھی یا نہیں، لیکن جب کوئی شخص اُسے مل جاتا ہے اور اُسکی جوانی کی لذتوں کو اپنے اعترافات فعلی سے اُسکے لیے قابل الفہم بنا دیتا ہے تو پھر عورت اپنے مسرت کے بار کو برداشت نہیں کرسکتی اور اپنے ہی جنس و عمر کا کوئی فرد اپنے پاس چاہتی ہے، جس سے وہ اپنی لذتوں کو بیان کرسے، یعنی جسطرح وہ اپنی ناکام زندگی میں دوسروں پر رشک کیا کرتی تھی اُس طرح اب اپنی مسرور شادکام حالت میں یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسرا بھی اُسپر رشک کرسے۔ اسلیے سائیک بعض وقت گھبرا اُٹھتی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی اور نہیں تو کم از کم اُسکی بہنیں ہی اگلا رس دکیوپڈ سں آکا دکھیں اور اُسکی خوش قسمتی پر رشک کریں۔

ایک دن، جبکہ کیوپڈ خلافِ معمول کئی دن کی دیر لگا کر آیا، تو سایک مچل گئی کہ میں تو اپنی بہنوں کو دیکھوں گی اور اگر میں وہاں نہیں جا سکتی تو انہیں کو یہاں بلواؤں گی۔ وہ میرے لیے مضمحل و پریشان ہوں گی کہ خدا معلوم کس عفریت نے میرا لقمہ کیا۔ اسلیے میں چاہتی ہوں کہ وہ یہاں آ کے مجھے دیکھیں اور خوش ہوں۔ اُس نے یہ بھی کیوپڈ سے کہا کہ اب وہ تنہائی سے بہت گھبرانے لگی ہے۔ یا تو وہ کہیں جایا نکرے کہ اس صورت میں پھر اسکو کسی چیز کی ضرورت نہیں اور اگر اُسکا جانا نہیں رک سکتا تو پھر کیوپڈس اور اگلارس ہی کو بلوا دے کہ چند دن انہیں کے ساتھ کٹیں۔

کیوپڈ خاموشی سے سایک کی اس ضد کو دیکھتا اور سنتا رہا اور جب وہ کہہ چکی تو اُسنے نہایت سنجیدگی سے یہ متفکر جواب دیا کہ اے سایک میرے لیے اس سے زیادہ مسرت کسی بات میں نہیں کہ تیرے احکام کی تعمیل میں اپنی ساری قوتوں کو صرف کردوں، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کہیں کیوپڈس و اگلارس کا آنا میری مسرت کو خاک میں نہ ملا دے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ اُنکے آنے سے تمہاری بعض ضدیں پھر از سرِ نو زندہ ہو جائیں اور وہی خدشات پیشِ نظر ہو جائیں جنکے خیال سے میں کانپنے لگتا ہوں، شاید وہ یہاں آ کر تیرے دل میں کوئی جستجو پیدا کردیں اور یہی ایک چیز ایسی ہے جو میں تیرے دل میں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اے سایک رحم کر اور مجھے انکے بلانے پر مجبور نہ کر۔ مگر سایک جسے اپنی محبتوں پر پورا اعتماد تھا اور جو اسوقت یہ نہ سمجھ سکی کہ وہ آ کر کیا ایسی نئی بات پیدا کر سکیں گی جو کیوپڈ کے خلاف ہو، اپنی ضد پر قائم رہی۔ کیوپڈ نے مجبوراً مارفیس اور زفر کو پھر بلایا اور اگلارس اور کیوپڈس کے لانے کا حکم دیا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ تاکید بھی کردی کہ انپر کسی طرح نہ ظاہر ہونے پائے کہ کس کے ارشاد یا حکم سے وہ طلب کیجاتی ہیں۔ شام کا وقت تھا، آفتاب کا ارغوانی سایہ کوہ اولمپس کی چوٹیوں کو رنگین بنائے ہوئے تھا۔ سایک اپنی بہنوں کی

انتظار میں فرش گل پر بیٹھی ہوئی کیوپڈ کے سامنے ساز پر گا رہی تھی کہ :-
"میں اُن راتوں پر رشک نہیں کرتی جنہیں تو میرے پاس ہوتا ہے، کیونکہ جب تک تو میرے پہلو میں ہے صرف میرا ہے - لیکن ہاں جلتی ہوں میں ان راتوں سے جنہیں تو مجھ سے بچھڑ جاتا ہے کیونکہ پھر تیری معیت انھیں کے ساتھ ہے جب تو کہیں چلا جاتا تو نہ سمجھ کہ میں تجھ سے جدا ہوں کیونکہ میں تو صرف تجھے چاہنے کی اک آرزو ہوں، اور وہ آرزو تیرے ساتھ ساتھ ہے جہاں بھی تو ہو - پھر اگر تو مجھ سے جدا ہو کے تو میرا خیال رکھتا ہے تو تو غلطی کرتا ہے، کیونکہ میں تو تیرے ساتھ ساتھ ہوں خیال کیسا؟ تو اپنے فرائض کے انہماک میں ایک دفعہ ناگہاں چونک کر کچھ سکوت کرتا ہے سوچنے لگتا ہے، وہ سکوت و فکر میں ہی تو ہوں جو تیری نگاہوں کو تیرے کام سے ہٹا لیتے ہیں - تو رات کو کسی دور دراز ملک میں سوتے سوتے چونک پڑتا ہے اور گھنٹوں جاگ کر کروٹیں لیا کرتا ہے یاد رکھ کہ وہ بیداری اور کروٹ خود سا ایک ہے جو تیری آنکھوں میں سما جاتی ہے اور تیرے پہلو میں لپٹ جاتی ہے - لوگ کہتے ہیں کہ محبت بُری ہے مگر میں دیکھتی ہوں کہ میرے زخمی کرنے کے لیے شاید کوئی خاص تیر تھا جو کیوپڈ نے چلایا - ــــــــــ"

کیوپڈ کے بدن میں اس فقرے سے اک جنبش ہوئی اور اپنا اضطراب دور کرنے کے لیے قطع نغمہ کر کے بولا کہ "اے سا ایک کیوپڈ نے کیا چلایا یہ کہو کہ میں نے چلایا" سا ایک بولی "ہاں سچ ہے تمھیں نے چلایا - تو کیا تم کیوپڈ ہو؟ نہیں تم کیوپڈ نہیں ہو سکتے، کیونکہ میں نے سُنا ہے وہ خود کسی سے محبت نہیں کر سکتا، اُسکے دل میں ذرا بھی غم نہیں ہے اُسکا سینہ گداز عشق سے خالی ہے وہ سفاک ہے اور تم تو مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھے چاہتے ہو، کیوپڈ - " "ہاں میں کیوپڈ نہیں ہو سکتا اس وجہ سے کہ میں واقعی کیوپڈ نہیں ہوں مگر یہ خیال کہ کیوپڈ کو کسی کے ساتھ محبت نہیں ہو سکتی، شاید

درست نہ ہو، کیونکہ بہت سی روایتیں یوں ہی غلط مشہور ہو جاتی ہیں اور تمھیں کیا معلوم کہ اسوقت وہ کس حالت میں ہے"

یہاں یہ گفتگو جاری تھی کہ مارفیس اور زفر سایک کی بہنوں کو اپنے نازک ہاتھوں پہ لیے ہوئے آگئیں اور انھیں جگا کر غائب ہوگئیں۔ سایک اپنی بہنوں کو قصر میں لے گئی اور اک اک چیز وہاں کی دکھائی اور پھر وہاں سے باغ میں لائی اور بڑے تفاخر کے ساتھ ہر ہر کنج کی سیر کرائی، دل میں تو وہ بہت کڑھیں کہ سایک انجی نہ صرف زندہ ہے بلکہ ایسی شاہانہ زندگی بسر کر رہی ہے کہ کبھی انکے خواب و خیال میں بھی ۔۔ ۔۔ نہ آسکتی تھی، لیکن ظاہر میں انھوں نے سایک کو مبارکباد دی اور پوچھا کہ یہ زروجواہر، یہ سامانِ نشاط کہاں سے آیا"؟

سایک نے جواب دیا کہ "مجھے نہیں معلوم کہاں سے آیا اور کون ہے جس نے مہیا کیا؟"

انھوں نے نہایت حیرت سے کہا "تو کیا اسوقت تک تیرے شوہر نے اپنا نام بھی تجھے نہیں بتایا"

"آہ، میں اس کا نام نہیں جان سکتی، کیونکہ اُسکی سخت ممانعت ہے"

وہ بولیں "اگر اے بہن تو نے اس کا چہرہ تو ضرور دیکھا ہوگا۔ کیا بہت خوبصورت ہے"

"نہیں میں نے اُسکا چہرہ تو نہیں دیکھا کیونکہ وہ ہمیشہ نقاب ڈالے رہتا ہے، مگر ہاں جب میں سو جاتی ہوں تو خواب میں اُسکا چہرہ محبت سے روشن و منور پاتی ہوں"

کیوپڈس بولی "اے لڑکی تجھے فریب دیا گیا، کیونکہ یہ وہی بدشکل عفریت ہے جو کسی دن تجھے کھا جائے گا"

سایک نے کہا "نہیں وہ عفریت تو نہیں ہو سکتا، مجھے اسکا یقین ہے مگر وہ

انہوں نے پھر یہی کہا اور اس قدر اصرار کے ساتھ اس کے عفریت ہونے کا یقین دلایا کہ سایک بھی کچھ متفکر سی ہو گئی۔ اس فکر سے انھوں نے اور فائدہ اٹھایا اور اسے مجبور کیا کہ ابھی جائے اور نقاب الٹ کر اسکا چہرہ دیکھے۔

رات ہو گئی تھی اور کیو پڈ اپنی خوابگاہ میں بیہوش پڑا سو رہا تھا۔ سایک آہستہ آہستہ گئی اور اسکے چہرہ سے نقاب الٹ دیا، مگر بجائے اسکے کہ وہ ایک عفریت کی ڈراؤنی صورت دیکھتی اس نے نہایت ہی حسین و جمیل شکل کیوپڈ کی دیکھی اور اسی اک لمحہ میں سایک کی محبت نے خدا جانے کتنے مدارج اور طے کر لیے۔ کیوپڈ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور برہم ہو کر بولا کہ:۔

او لے بیوقوف سایک یہ تو نے کیا کیا۔ کیا تو یہ نہ جانتی تھی کہ میں ایک دیوتا ہوں اور کیا تجھے یہ علم نہ تھا کہ کوئی شخص میرے چہرہ کو دیکھکر زندہ نہیں رہ سکتا، یہ کہہ کر اس نے باہر نکل جانا چاہا، لیکن بدقسمت سایک نے اپنی بستر سے نکل کر کیوپڈ کو دیکھکر اپنے ہاتھ بڑھائے کہ وہ لوٹ آئے اور اسکی خطا معاف کرے۔ ہر چند کیوپڈ سایک کی اس ادا سے بے انتہا متاثر ہوا اور بے اختیار اسکا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے، لیکن وہ رک گیا۔ کیونکہ اب ایسا کرنے سے اسکی غیر فانی روح چھین لی جاتی۔ اس لیے کیوپڈ فوراً ایک بادل اپنے اور سایک کے درمیان حائل کر کے غائب ہو گیا اور سایک بیہوش ہو کر گر پڑی۔

کیا خبر وہ کتنے عرصہ تک بیہوش رہی، لیکن ہاں، جب اسکی آنکھ کھلی، تو نہ وہ قصر تھا اور نہ وہ اسکی مکلف خوابگاہ۔ نہ وہاں باغ اور نہ کوئی کنیز وہی سنسان اور وحشتناک کوہ الوند کی چوٹی تھی جہاں وہ قربانی کے لیے لائی گئی تھی اور وہی شاہ بلوط سامنے تھا جسکے تنے سے وہ باندھ دی گئی تھی۔ پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ میں کوئی وحشتناک خواب دیکھ رہی ہوں لیکن نہیں تھوڑی دیر بعد سے

یہ یقین کرنا پڑا کہ خواب یہ نہیں ہے مگر خواب تو وہی تھا جس میں اس نے ایسی پُرلطف زندگی بسر کی تھی۔ مگر ایسا طویل خواب کبھی خواب نہیں ہوسکتا۔ مگر پھر کیا تھا؟ آہ، وہ اس حقیقت پر غور کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ بالکل مبہوط تھی دیوانہ پن اُسکے چہرہ سے نمایاں ہونے لگا تھا اور وہ فوراً مرجانا چاہتی تھی۔

(۹)

سایک دیوانہ وار پہاڑ پر پھر رہی تھی، پاؤں کانٹوں سے مجروح تھے سارا بدن چوٹوں سے داغدار، کراہتی تھی اور روتی تھی۔ چیختی تھی اور گر پڑتی تھی، کہ ہائے اب وہ صورت کہاں ملے، ہر شخص اُسکی تباہ اور برباد حالت پر جی دکھا سکتا ہے لیکن وینس کی بیہمی کا وہی عالم تھا۔ اُسنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سایک کو پکڑ کے سامنے لائیں اور خود یہ حکم دے کر جیوپٹر کے پاس گئی۔ جیوپٹر اُسکا شوہر اولین تھا اور یہ کسی زمانہ میں اُسکی محبوب ترین بیوی رہ چکی تھی اس لیے اس نے کچھ ایسی تدابیر حُسن افزا وینس کو بتادیں جس سے وہ سایک کے سامنے حجاب نہ کرسکے اس نے ان تدابیر پر عمل کیا اور اپنے پندار میں ایسی حسین بنکر بیٹھ گئی کہ اب اُسے سایک کے حُسن کیطرف سے ذرا کھٹکا نہ رہا یادلی سایک لائی گئی، مگر وینس یہ دیکھکر کہ اس خستگی و پریشانی کے عالم میں بھی سایک کے حُسن کا وہ عالم ہے کہ اب بھی وہ اُسکا مقابلہ نہیں کرسکتی عرق عرق ہوگئی اور دل میں یہ ٹھان کر اُٹھ کھڑی ہوئی کہ اُسکو مار ڈالنا ہی بہتر ہے۔ لیکن رات کو جیوپٹر نے وینس کے خواب میں آکر اُسکا یہ خیال بدلدیا اور سایک کی جاں بخشی کی شرط یہ قرار دی گئی کہ وہ دیوی پرسرپائن کا طلسمی صندوق لے آئے جس میں طلائے حسن بند ہے۔

سایک اپنی قسمت کا فیصلہ سنکر کانپ اُٹھی، کیونکہ اُسکی نسبت مشہور تھا کہ وہ کوہ ہیڈس کے سب سے گہرے غار میں محفوظ ہے اور کسی کی رسائی وہاں تک نہیں ہوسکتی

لیکن ایک آواز اسکے کانوں میں آئی جسے سوائے اسکے اور کسی نے نہیں سُنا کہ "گھبرا نہیں تیرا محافظ تیرے ساتھ ہے" یہ محبت بھری آواز اُسے کچھ آشنا سی معلوم ہوئی اور وہ اس شرط کے پورا کرنے کا وعدہ کرکے رخصت ہو گئی۔ نہ اس نے دشوار گزار پہاڑی راستوں کی پرواہ کی اور نہ درندوں کی، نہ اُس نے کانٹوں کا خیال کیا اور نہ مہیب غاروں کا، کیونکہ وہاں ایک روشنی تھی، اک محبت بھری جھلک تھی جو اُسکی رہنما تھی اور ان مصائب میں اُسے تسکین دیتی جاتی تھی۔ راستے میں درندے اُسے ملے مگر وہ اُسکے حسن سے مسحور ہو گئے، متلاطم دریا اُس کی راہ میں آئے، لیکن وہ بھی خشک ہو گئے غرضکہ وہ کسی نہ کسی طرح پرآسرپاین کے دربار تک پہنچی اور اُسنے رحم کھا کر وہ صندوق سایک کے حوالہ کر دیا۔

سایک خوش خوش واپس آئی اور وہ صندوق وینس کے سامنے لا کر ڈال دیا مگر وینس سایک کے اس عزم و استقلال سے اور زیادہ جل گئی اور بدعہدی کے لیے تیار ہو گئی۔ مگر جیوپٹر اسپر راضی نہوا اور وینس کو حکم دیا کہ سایک کو چھوڑ دے کیونکہ جب وینس کے پاس طلسمی صندوق آگیا ہے تو اسکو کسی کے حسن سے جلنے کی ضرورت نہیں ہے آخر کار وہ بھی اسپر راضی ہو گئی اور سایک کو جیوپٹر نے خاص اپنی شراب الوہیت منگا کر پلادی جسکے اثر سے وہ بھی غیر فانی ہو کر آسمانی مخلوق میں شمار ہونے لگی۔

(۱۰)

کیوپڈ و سایک پھر اُسی کوہ اولمپس پر چلے گئے اور سایک کی پھر وہ زندگی شروع ہو گئی جس زندگی کا خواب وہ ایکدفعہ دیکھ چکی تھی۔ اسکے بعد کیوپڈ نے کبھی اپنے چہرہ پر نقاب نہیں ڈالا، مگر ہاں اُس وقت جب اُسکو انسانوں کی نگاہ سے چھپکر تیر عشق چلانا مقصود ہوتا تھا —————— نیاز فتحپوری

سیر چمن

۲۰ر اپریل سنہ ء کی رات تھی گرمی کا موسم تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے دل میں آیا آؤ آج تو کنگ ایڈورڈ پارک (دہلی) کی سیر کریں بس پھر کیا تھا حضرت دل کے نادر شاہی حکم کا اقلیم ہستی میں اعلان ہو گیا۔ فوراً حواس خمسہ کی تار برقی پاؤں کی سفر مینا کو پہنچا دی گئی کہ ہاں بڑھے چلو۔ سینے کے ہوادار پہ جلالت مآب سلطان الاعضا دل خلد اللہ ملکہ و حشمتہٗ سوار تھے جلو میں شوق ہمرکاب تھا قطع سفر کچھ منٹوں میں ہو گیا۔ یہ باغیچہ جامع مسجد کے سامنے واقع ہے اول تو یہاں کی فضا پہلے ہی سے قابل دید تھی اب اس باغیچے نے سونے پر سہاگے کا کام دیدیا ہے اس باغ کے چاروں طرف لوہے کے جنگلے لگے ہوئے ہیں ان سے ملے ہوئے پھولوں کے درخت چلے گئے ہیں پودے چشم بد دور جو برس ڈیڑھ برس کے لگے ہوئے ہیں وہ جوان رعنا کے ہم قد نظر آتے ہیں کیاریاں گو عہد طفولیت میں ہیں مگر قرینہ بتا رہا ہے کہ شباب آنے دو قیامت کے فتنے دیکھ لینا ہمارے ہی رنگ میں پوشیدہ ہونگے دلفریبی عشوہ گری میں ہم اپنی نظیر آپ ہوں گے۔ غرض زمردی فرش پہ زندہ دلان دہلی جلوہ آرا نظر آتے ہیں چھپے قہقہے کی صداؤں نے عالم بالا کے رہنے والوں کو ہوشیار کر دیا۔ خوش گلو حضرات نے علم موسیقی کے دلکش ترانوں سے بزم تیموری کے آخری تاجدار بہادر شاہ کے شبستان عیش کا سماں پیش نظر کر دیا جب حضرت دل کی سواری باغ میں داخل ہوئی ہے تو خدمت تعظیم کے لیے استادہ ہو گئے شاخیں جھک جھک کر آداب بجا لائیں۔ یہ سب کا سلام لیتے ہوئے آگے بڑھے

نرگس ہمراہ کھڑی تھی فوراً آنکھ ماری دل اپنا دل پکڑ کر بیٹھ گیا کسی کا تیر نگاہ پہلے ہی مجروح کر چکا تھا۔ اوس نقطے نے زخم پر پھر خاکشی کر دی ہمنشینوں نے سنبھل سنبھالا گلاب کے تختے کے پاس لیجا کر لٹا دیا۔ رفتہ رفتہ ہوش میں آئے طبیعت ٹھکانے پہ آنی شروع ہوی تھی کہ قریب سے کسی غنچے کے چٹکنے کی آواز آئی یہاں خیال ہوا

کوئی بم پھینکا گیا

فوراً مصاحبوں نے حلقے میں لے لیا۔ یہ دیکھکر غنچہ مسکرایا۔ دل کو بہت ہی تاؤ آیا نہایت خفیف ہوے غنچے نے کہا آؤ میری بہار دیکھو۔ انھوں نے یاس کے انداز میں فرمایا تم میری حسرتوں کا مزار دیکھو۔ غنچے نے کہا پھر میرے اجزا پریشان ہو جائیں گے۔ جواب دیا گیا۔ تیرے پریشان ہونے سے میرے اوسان بجا ہونگے یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ موتیا نے آگے بڑھکر کہا بندہ پرور آداب عرض ہے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو مست ہو گئے۔ موتیا کا کٹورا تھا کہ مئے ارغوانی کا جام فرمایا آگے آؤ۔ موتیا نے کہا دست شوق دراز کیجیے توڑ یے اور دامن میں رکھ لیجیے۔ یہ بار بار اسکی خوشبو سونگھتے اور حظ اٹھاتے رہے یک بیک کچھ خیال آیا آبدیدہ ہو گئے فرمانے لگے۔ آہ تو مجھ سے لاکھ درجے بہتر ہے کہ ٹوٹنے کے بعد بھی کوئی سر پر جگہ دیتا ہے کوئی زیب گلو کرتا ہے لیکن میرے مرنے کے بعد سونگھنا تو درکنار ہزاروں من مٹی کا انبار ڈالدیتے ہیں تاکہ پھر کبھی صورت نہ دکھائی دے یہ سن کر

پھول نے قہقہہ مارا

اسکا آپ عاقل ہو کر نادان بنے جاتے ہیں مرنے کے بعد میں اور آپ دونوں یکساں ہیں غور فرمائیے میں شب کو کسی بت طناز کے گلے کا ہار ہو جاتا ہوں اور صبح ہی نوچ کھسوٹ کر پھینک دیا جاتا ہوں۔ میری زندگی میرا شباب ہے اور شباب کے

ساتھ ہی میری قدر ہے جہاں باسی ہوا اور نظروں سے گرا۔ لیکن آپ ایک ایسی مخلوق ہیں کہ بعد جوانی بھی قدر کے قابل ہیں لوگ آپ سے پیچیدہ معاملات کو سلجھاتے ہیں آپ کی رائے کی عزت کرتے ہیں ہر محفل میں تجربہ کار آدمی کو بڑا سمجھ کر صدر بنایا کرتے ہیں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میری زندگی یک شبی ہے اور آپ کی ہزار شبی بلکہ اُس سے بھی زائد۔ تاہم میری ہستی کا ہر ورق معرفت الٰہی کا دفتر ہے نصیحت و عبرت کی مجلد کتاب ہے اگر آپ کی آنکھیں روشن ہیں تو آپ دیکھ سکتے ہیں بیجیے یہ پہلے ورق کی چند سطریں تو پڑھیے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ یہ دوسرا صفحہ ملاحظہ ہو۔ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ اسکے علاوہ سب سے آخری صفحہ یہ ہے ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ لیکن مجھے آپ کی حالت پر افسوس آتا ہے کہ اشرف المخلوقات ہو کر تمہاری آنکھیں مظاہر کے دیکھنے کی عادی نہیں اگر دیکھ بھی لیتے ہو تو حظ نفس کے لیے آپکو زیبا تھا کہ بلحاظ اپنے مرتبہ کے سب سے زیادہ خدا کی معرفت کے ساتھ قربت حاصل کرتے۔ اب مجھے چپ لگ جانے کا بتانے لگا ہوں میری زبان آپ کی اُنگلیوں میں مقید ہے ورنہ کچھ اور بھی کہتا یہ سنکر دل نے ایک چیخ ماری ہاتھ پیروں میں رعشہ آگیا کپکپایا لڑکھڑایا آخر دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ پھول کے ساتھ دل بھی خاک پر پڑا ہوا تھا۔

مقرب حسین مقرب دہلوی

اُردو کا طوطی

اے میری پیاری زبان۔ تیری اداؤں کے قربان۔ تیری شیرینی و لطافت کے صدقے۔ تیری خوبیاں مجھ جیسے دلدادہ سے پوچھے۔ ہاں پوچھے مگر میں اُسکے اظہار سے عاجز۔ اُس کے بیان سے قاصر۔ قوت گویائی گو تجھ پر ناز کرتی ہے مگر تیرے اوصاف کے اظہار میں سرگریباں۔ زبان کو یارا نہیں۔ اسکی اوقات کیا اُس کی بساط ہی کیا جو دم مارے۔ اچھا میں دم بخود ہوں۔ دل خوب جانتا ہے۔ اُسکا جاننا کافی اُسکی گواہی قابل وثوق۔ تیرا لطف حُسن تو ادراک ہی پر منحصر ہے۔

مگر کچھ تو کہوں۔ ہائے دل کا تقاضا بھی بُرا ہوتا ہے۔ تو تیری سوانحعمری بیان کروں تیرے عالم وجود میں آنے کی کیفیت لکھ ڈالوں۔ نہیں نہیں۔ یہ سب جانتے ہیں۔ اسکا بتانا۔ اس کا لکھنا کیا۔ سیکڑوں نے لکھا۔ ہزاروں نے پڑھا۔ عالم جانتا ہے۔ تو تیری خوبیوں کو احاطہ تحریر میں لاؤں ہاں کچھ کرنا چاہیے۔ کچھ تو ہو۔

تو ایک مرغ زریں بال ہے۔ شیریں مقال ہے۔ خوش لہجہ ہے۔ خوش نوا بھانت بھانت کی بولی بولتا ہے۔ کبھی ہندی راگ الاپتا ہے۔ گاہے فارسی کی زبان میں نغمہ سرائی کرتا ہے۔ کبھی عربی لہجے اُڑتا ہے۔ تجھ سے کوئی زبان نہ بچی۔ ترکی۔ انگریزی۔ کیا کیا کہا جائے اور لطف یہ کہ پھر اُردو کی اُردو ہے اللہ رے تیرا حُسن قبول۔ غیروں سے یہ مناسبت۔ یوں شیر و شکر ہونا کیا مجال ہے ذرا بھی پیدا ہو۔ بے لطفی کا نام نہیں۔

اے میری پیاری زبان - تیری اداؤں کے قربان - ہے تو عجب چیز - تیری فصاحت و بلاغت - تیری شیرینی و لطافت کا کیا کہنا - تُو کمان نہیں - تیرا سکہ چار دانگ عالم میں چل رہا ہے - بنگالے پر تیرا جادو چلا - پنجاب میں تیرے بحرِ بے پایاں کی روانی - کشمیر میں تیری گرم بازاری بمبئی مدراس جہاں دیکھیے تو موجود تیرے شیدائیوں کا جمِ غفیر دست بستہ حاضر - اے حسنِ بلاغت کی دیوی تیرے مرکز بھی بتادوں - تیرا مندر لکھنؤ میں - تیرا کلیسا دہلی میں مگر تیرے حُسنِ عالم افروز کا کیا کہنا زمانہ فیض یاب - تیرے حسن کی جھلک - دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچتی ہے جہاں جا تیری - تیرے شیدائی - تیری پرستش کرنے والے - تیرے پوجنے والے - دوڑ دوڑ کر سے ان مرکزوں کی جانب کھنچ کر جاتے ہیں - تیری بارگاہ میں باریاب ہو کر تیرے چشمۂ فیض سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں - وہ ذائقہ حاصل ہوتا ہے کہ تاابد نہیں بھولتے - امتیاز کی آنکھیں کھل جاتی ہیں - کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے - تیرا دیدار ٹکسالی صورت میں نصیب ہوتا ہے -

اے میری پیاری زبان - تیری اداؤں کے قربان - ہے تو عجب چیز - ہاں تیرا سکہ دلوں پر چلتا ہے اور چلتا رہے - تیرا عالم فریب حُسن مسخر کرتا ہے اور کرتا رہے - تیری زلف گرہ گیر کمند پھینکتی ہے اور پھینکتی رہے - ہاں ہاں تیرا طوطی بولتا ہے اور تا حشر یونہی بولتا رہے - آمین ثم آمین -

ماسٹر باسط بسوانی

ناولہائے قاری

یعنی سعید - سعادت - شاہد رعنا

جناب قاری محمد سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی کے اخلاقی ناول جو دو مرتبہ چھپ چکے ہیں - اب پھر زیرِ طبع ہیں - جو صاحبان خریداری چاہیں وہ دفتر تمدن کو اطلاع دیں -

ناداری

مثل مشہور ہے "پیری و صد عیب" میں کہوں گا "ناداری و صد عیب" مفلس ہونا بذاتہ کوئی عیب نہیں ہے۔ لوگوں میں مفلس مشہور ہونا مصیبت ہے۔ جہاں لوگوں کو یہ گمان ہو گیا کہ فلاں شخص غریب ہے۔ بس پھر دنیا اُس سے بچ کر نکلنے لگے گی۔ مالدار چور لباس فاخرہ پہنکر نکلے تو شریف سے شریف اُسکے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سر بازار نکل جائے گا۔ لیکن مفلس ساہوکار سے گلی میں بات کرتے ہوئے بھی ہر شخص شرمائے گا۔ جس طرح ہندو غیر مذہب والے سے چھوت کرنے لگتے ہیں اسی طرح دنیا مفلس سے بچتی ہے۔ امیر ہو کر جو غریب ہو جائے اسکی اور بھی مشکل ہے۔ اسکے قدیم نمکخوار۔ ہم پیالہ و ہم نوالہ دوست۔ اسکے بھائی بند سب اُس سے آنکھ چرانے لگتے ہیں۔ وہ خود بھی اُن سے بچنا چاہتا ہے۔ کہاں وہ زمانہ کہ سب اُسکی جوتیاں سیدھی کرتے تھے اُسکی غلط بات کو بھی صحیح بتاتے۔ اُسکے عیوب کو خوبی سمجھتے تھے کہاں یہ وقت کہ اُسکی طرف سے منہ موڑ لیتے ہیں وہ ٹھیک بات بھی کہے تو اسے جھوٹ سمجھتے ہیں اسمیں کوئی خوبی ہو تو اسمیں بھی بُرائی نکال دیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ شاہان دہلی و نوابان اودھ کا عروج تھا۔ اُن سے زیادہ نہ کوئی شکیل تھا نہ اُن سے زیادہ کوئی عقیل تھا۔ دنیا بھر کی خوبیاں اُن ہی میں جمع ہو گئی تھیں۔ اُن ہی کی اولاد اب ہے کہ اُسکے پاس پیسہ نہیں ناداری کی بلائیں گرفتار ہے کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا بلکہ اُنکی خوبیوں کو بُرائی سمجھتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ "ان لوگوں میں زبانی جمع خرچ بہت ہے انکے کام نہیں ہوتا" کوئی کہتا ہے "صاحب لغویات کے تہذن کے جلن سے پانی نہیں

اُترتا دس سو پیہ مہینے کے پان کھا جاتے ہیں۔ بھلا ان سے کیا نوکری ہوتی ہے
ابھی ان کے پاس دولت ہوتی تو ان ہی عیوب کے متعلق یہ کہا جاتا "ابی ہاتھی
مرا ہوا بھی لاکھ ٹکے کا ہوتا ہے۔ کیوں نہوں شہزادے ہیں امیر ابن امیر ابن امیر
ہیں اب وقت پڑا ہے تو کیا ہے لیکن پہلی خوبیاں تو نہیں جا سکتیں طلاقت زبان
تو ملاحظہ فرمائیے۔ کسقدر فصیح کلام ہے کیسی سلیس اردو بولتے ہیں زبان تو بس ان
لوگوں کا حصہ ہے۔ کام نہیں ہو سکتا مگر اس سے معذور سمجھنا چاہیے انھوں نے
کبھی کہاں کام کیا ہوگا" برف و پان کے متعلق کہتے "حضرت اس گئی گذری
حالت میں بھی صرف ایکدم کے لیے دس سیر روز برف آتی ہے اور کچھ نہو کچھ ہو
تو بھی دس روپیہ ماہوار کے تو پان اُڑ جاتے ہوں گے۔ آخر شہزادے
ہیں امارت کی بو کہاں سے جائے گی"

غرضکہ دنیا کا تو یہ حال ہے۔ امیر غریب سے یوں بھاگتا ہے کہ کہیں کوئی سوال نہ کر بیٹھے غریب غریب سے یوں بچتا ہے کہ اس سے مل کر کیا ملے گا۔ دنیادار تو دنیا دار اللہ والے لوگ بھی غریب کی قدر نہیں کرتے۔ وہاں بھی امیری کی شناسائی ہے۔ مندروں پہ جاکر دیکھو مزاروں و زیارات پہ دیکھو امیروں کے چڑھاوے لیے جا رہے ہیں اور غریبوں کو دھتکارا جا رہا ہے۔ مرنے کے بعد گناہوں کی بخشش کے لیے بھی "دان" چاہیے غریب کے پاس رکھا ہی کیا تھا جو اب اسکے لیے دان دیے جائیں۔ مسلمانوں کے ہاں یہ رسم ہے کہ قضا نمازوں کے عوض اسقدر گیہوں خدا کے نام غریبوں کو تقسیم کیے جائیں تو معافی مل جاتی ہے۔ امیر تو گیہوں چھوڑ مرا وہ تقسیم ہو گئے اسکو معافی مل گئی۔ غریب کہاں سے اپنی نماز قضا ہونے کا عوض دے۔

وہ دنیادار لوگ جو طاؤس اور ہیں پیشواؤں پہ امیر پرستی کا اعتراض کرتے ہیں

خود امیر پرستی میں پھنسے ہوے ہیں اور غریب کا حق اُسکو نہیں دیتے - فی زمانہ جسقدر
قوم کے لیڈر ہیں ان میں سے ایک ایسا نہیں کہ جو محض قوم کی محبت - ذاتی
لیاقت و دماغی قابلیت ہی کی وجہ سے لیڈر ہوا ہو اور روپیہ کی وجہ سے نہو۔
میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نادار ہو لیکن اسمیں گرمجوشی - محبت -
لیاقت - قابلیت سب موجود ہوں اور وہ چاہے کہ میں قوم کے فائدے کے
لیے کوئی کام کروں - قوم کے فائدہ کی کوئی بات کہوں - قوم کو اور بادہ زر پرستی
و خوشامد خوری سے بچاؤں تو ممکن نہیں کہ اُسکی کوئی بات پوچھے - کوئی کہے گا
میاں یہ بھی کمائی کرنے کا سلسلہ نکالا ہے کوئی کہے گا کہ یہ چندہ تو جمع کرتے
پھرتے ہیں مگر کھا گئے تو کیا ہوگا کوئی اسکے لباس پر اعتراض کرے گا تو کوئی
اُسکے پاس سواری نہونے پر معترض ہوگا - غرضکہ اُسکی بات کوئی نہ سُنے گا
کہ یہ کہتا کیا ہے - اگر واقعی عقل کی بات کہتا ہے تو خواہ غریب ہی کیوں نہ ہو لیکن
اس کو اپنا رہنا بنانا چاہیے اپنا لیڈر سمجھنا چاہیے - نہیں ہرگز نہیں - قوم
کے لیڈر سر سید احمد خان تھے پنشن یافتہ سب جج تھے - مہدی علی تھے جنکو اب
بھی ۲ ہزار سو روپیہ ماہوار پنشن کے ملتے تھے ہزاروں روپیہ سال کی ذاتی
آمدنی ان کے پاس تھی - مولوی مشتاق حسین بھی نواب تو ہیں - جسٹس
شاہ دین جج ہیں - سر فاضل بھائی کریم بھائی - آدم جی پیر بھائی - نواب سلیم اللہ
مرحوم وغیرہ وغیرہ سب اونچی حیثیت کے لوگ ہیں - ان کے مقابلے میں سینکڑوں نادار
اور گمنام مگر سچے ہمدرد و بہی خواہان قوم کا کوئی نام بھی نہیں جانتا - شیخ
سادہ لوح ریاست تیراگڈھ کے کامدار ہوگئے - بول وہ نہیں سکتے - کہ وہ
نہیں سکتے - قوم کی حالت سے وہ واقف نہیں - کامدار ہونے سے پہلے کوئی
ان کے نام تک سے واقف نہیں تھا - مگر کامدار کیا ہوے دنیا بھر کی قابلیت

دنیا بھر کی لیاقت اور عقل ان میں آگئی اور اسی دن سے وہ لیڈران قوم میں شمار ہونے لگے۔ میر خضر احق مدرسۂ جہل آباد میں دینیات کے مدرس سب لوگ مسجد کا ملّا سمجھتے تھے۔ اتفاق سے نواب صاحب کی ان کے حال پر مہربانی ہوئی قاضی القضاۃ کردیا جاگیر دیدی مالدار بن گئے اب کیا تھا انجمن رفیق الاہلیان کا وفد انکی خدمت میں حاضر ہوا کہ ہمارے سالانہ جلسے کے پریسیڈنٹ ہونا منظور فرمائیے۔ کسی وجاہت پسند کالج نے دعوت دی کہ ہمارے انتظام دینیات کی تصدیق کیجیے۔ بس چشم زدن میں لیڈر قوم بن گئے۔ اب میر صاحب ہیں کہ جا بے جا وقت بے وقت مدرسے کے لڑکوں کے بجائے دنیا بھر کو سبق پڑھاتے پھرتے ہیں اور عربی فقروں اور غلط منطق سے لوگوں کے دماغ کو پریشان کر رہے ہیں۔ جہاں ایک منٹ کی اسپیچ کی ضرورت ہے وہاں گھنٹوں بک بک کر رہے ہیں۔ مہذب مجلس میں نامہذب باتیں فرما رہے ہیں مگر کس کی مجال ہو ان سے آنکھ ملا سکے یا ان کو ان کی بیجا عنایت پر منع کر سکے اس کے برخلاف ایک معمولی حیثیت کا آدمی جس نے نہایت مطالعہ و مشقت کے بعد ایک دلچسپ و ضروری مسئلہ پر ایک مضمون تیار کیا ہے ایک جلسے میں اپنا مضمون پڑھتا ہے۔ لوگ سنتے ہیں اور چپ ہو رہتے ہیں۔ بعض وقت سمجھتے ہی نہیں کہ کیا کہتا ہے۔ بعض وقت اسکی اسپیچ ہی بند کرا دیتے ہیں۔ اگرچہ اسی اسپیچ کے چھپ جانے کے بعد بڑے بڑے لیڈران قوم اسکے خیال کو اسکے فقروں کو اپنی دوسری اسپیچوں میں استعمال کرتے ہیں اسوقت سب واہ وا کرتے ہیں تعریفوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ اور تحسین و آفرین کے نعرے آسمان تک پہنچتے ہیں۔ لیڈر پرستی کی حد ہے۔ سچ ہے ناداری بُری چیز ہے۔

م - ا - ز

ہنری ڈونان
بانی انجمن صلیب احمر

ہر قوم میں کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ہمیشہ پیدا ہوتے رہے ہیں جنکی قوت تفکر اور قوت عمل ہر ساعت اور ہر لحظہ قومی فلاح وبہبود میں مصروف رہتی ہے، وہ اپنی قوم کی چھوٹی سی چھوٹی مصیبت سے بھی بیچین ہو جاتے ہیں اور اُسکے دفعیہ کے لیے اپنی جان تک قربان کر دینے میں تامل نہیں کرتے ہیں، درحقیقت ایسے ہی لوگ اپنی قوم کے سچے ہمدرد اور حقیقی تاجدار ہوتے ہیں جنکے سہارے قومی حیات کی کشتی مقصود تک پہنچتی ہے، یہ دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں مگر اُنکے سچے کارنامے ایک شفیق معلم کیطرح اُنکی قوم کی آئندہ آنے والی نسلوں کو رحم و محبت اور ہمدردی کا درس دیتے رہتے ہیں۔

ان ہی مخصوص لوگوں میں ہنری ڈونان کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل فخر ہے جس نے ابنائے جنس پر وہ بڑا احسان کیا ہے جو صفحات تاریخ پر زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

ہنری ڈونان ۱۸۲۸ء بمقام جنیوا ایک نہایت مشہور دولتمند اور شریف خاندان میں پیدا ہوا، اسکی طبیعت کا میلان انسانی شفقت کیطرف بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگا تھا اور وہ جنگوں کے ہولناک واقعات اور مجروحوں کی کرب اور بہچینیاں سُن سُنکر سخت متاسف ہوتا، ۱۸۵۹ء میں جب اسٹریا اور فرانس کے درمیان جنگ چھڑی تو وہ بنفس نفیس میدان کارزار گیا تاکہ کوئی بہتر سے بہتر طریقہ مجروحوں کی امداد کا دریافت کر سکے، اسی سال بتاریخ ۲۴ جون معرکہ ہولفرینو([illegible] سولفرینو) میں بھی جو مذکورہ سلطنتوں میں واقع ہوئی موجود تھا، ایکدن شام کے وقت میدان کا چکر لگانا شروع کیا

یکایک کیا دیکھتا ہے کہ ایک بہت بڑی تعداد مجروحوں کی ہے جو خون میں لتھڑے پڑے ہیں آہ و بکا کی صدا فریاد کی آواز لبوں پر جاری ہے اور وہاں اُنکا نہ کوئی مددگار ہے اور نہ کوئی پرساں حال، وہ اس عبرتناک اور دردانگیز نظارہ سے بہت متاثر ہوا اور اُسکا نہایت رحیم دل اس خونی منظر سے بھر آیا، اُسوقت اُسکی زبان سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے "ہائیں! یہ لوگ مار ڈالے گئے، اُف! کسقدر یہ عبرتناک اور تعجب خیز امر ہے کہ ایک انسان اپنے بھائیوں کے قتل کے لیے پیشقدمی کرتا ہے" اُس نے اسیوقت سے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا شروع کیا آخرکار اس نتیجہ پر پہنچا کہ جنگ انسان کے لیے نہایت جانکاہ مرض ہے جس سے چھٹکارا پانا کسیطرح ممکن نہیں، اُسکا جڑ سے اُکھاڑ دینا تقریباً محال ہے، اسکے لیے کوئی ایسی دوا نہیں ایجاد ہو سکتی جو اسکو بالکل نیست و نابود کرسکے، اُس نے اپنے دل میں کہا "لیکن ہمکو ایسی چیز ضرور ایجاد کرنی چاہیئے جو کم از کم اس مرض کی غیر معمولی بےچینیوں کو دور کرسکے اور مجروح دلوں کے لیے باعث تسکین ہو"

اسکے بعد ہنری ڈُوناں نے عہد کرلیا کہ اس مبارک تجویز کے پورا کرنے میں میں اپنی تمام کوششیں صرف کروں گا اور اپنی تمام زندگی صرف اس مقصد کی تکمیل کے لیے وقف کردوں گا، پہلے پہل اُس نے "یادگار سولفرینو" کے عنوان سے ایک زبردست مضمون لکھا جسمیں تمام متمدن قوموں کو ایک ایسی انجمن قائم کرنے کے لیے دعوت دی جسکے ذریعہ تمام مجروحین کی امداد بحسن و خوبی کی جاسکے، اس مضمون کا اثر بہت زیادہ پیدا ہوا لوگوں نے ہر چہار طرف سے اسکی دعوت کو لبیک کہا مگر تھوڑے ہی دنوں بعد اسکی یہ صدا پست ہونے لگی، تب اسکو معلوم ہوا کہ یہ تجویز مسلسل کوشش اور جد و جہد کی مقتضی ہے، اس غرض سے اُس نے بڑے بڑے اور اہم مقامات کا دورہ کرنا شروع کیا اور مختلف صحبتوں اور مجلسوں میں پرزور تقریریں کیں

ایک دن اسکے مقصد کی بنیاد پڑ رہی کر رہی،

اس سلسل دوا دوش میں اسکو بہت بڑی کامیابی پیرس میں یہ ہوی کہ وہاں اسکے بہت سے مددگار اور ہمخیال پیدا ہو گئے اور اول جس شخص نے اسکی طرف دست امداد بڑھایا وہ ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا جس نے اُسکے تمام مضامین اپنے اخبار میں شائع کیے، بہت سے مضمون نگاروں کے قلم کو جنبش ہوی اور اُنھوں نے بھی اس عنوان پر مضامین کا دراز سلسلہ جاری کر دیا جس سے اسکے مقصد کی اشاعت اور زیادہ ہوی، اسکا خوشگوار نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں انجمن صلیب احمر کی بنیاد مکمل ہو گئی، اس انجمن کے رکن اور ممبر بڑے بڑے شرفا اور امرا قرار پائے، اور اسکا پہلا جلسہ ۲۶، اکتوبر سنہ ۱۸۶۳ء بمقام جنیوا منعقد ہوا اور پھر اسکے بعد کے اجلاسوں میں تمام متمدن دول نے اپنے اپنے نمایندے بھیجے، اسوقت سے آج تک یہ انجمن تمام مجروحین کی مرہم پٹی اور انکے آرام رسانی کا سامان کرتی آئی ہے،

ہنری ڈونان کو سنہ ۱۹۰۱ء میں وہ قابل فخر انعام ملا جسکا اعلان فرڈ نوبل نے اس شخص کے لیے کیا تھا جس نے اپنے مفید معلومات زبردست تحریر و تقریر اور بہترین تجاویز کے ذریعہ انسانی خدمت ادا کرنے میں امتیازی درجہ حاصل کیا ہو، لیکن موت نے نوع بنی آدم کے اس سچے ہمدرد اور مخلص کو نہیں چھوڑا نومبر سنہ ۱۹۱۰ء میں اس شریف النفس شخص کو دنیا سے کوچ کرنا پڑا۔

مولانا احمد اللہ متعلم ندوہ

رباعی

ہر ایک سے صلح و آشتی بہتر ہے — گر ہو سکے سب سے دوستی بہتر ہے
مغرور [illegible] نہ تنا گردن خم کر — انساں کے لیے فروتنی بہتر ہے

حضرت واسطی

چاندنی رات

سچ ہے نیچر کے دلدادہ کو سہانی تاروں بھری رات اور تابش ماہ کا فرش تمام لوازمات استراحت سے بے پروا کر دیتا ہو۔ کیا ہی پُر فضا وہ سین ہوتا ہو۔ جبکہ آخری شب کی آہستہ گھڑیوں میں کوئی نوجوان قدرت کی فیاضیوں کا لطف اُٹھانے کو آبادی سے باہر نکل جاتا ہے۔ شیروں کی گرج جنگلی جانوروں کی خوفناک آواز نہ تو اسکا تفریح کا شوق کم کر سکتی ہے۔ اور نہ اسکو ڈرا دھمکا کر وہیں کا وہیں ساکت کر سکتی ہے۔

آخر یہ کیوں؟۔ ہو نہو وہ نوجوان چاندنی کے فرش سیمیں پر چلتا ہوا نسیم سحر کے پُر ناز پُر لطف و پُر ادا جھونکوں سے گفتگو کرنے میں اسقدر غرق ہو کہ وہ اُن آوازوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور یا تو یہ سبب ہے کہ گُل کے رنگ و بو نے معشوق کی یاد کو تازہ کر دیا ہے اور یا یہ کہ شاید ماہ کامل کے حسن صبیح نے اسکو اسقدر متوجہ کیا ہو کہ وہ جلوہ رنگین طرح سے اس نیچر کے عظیم نشان پر فریفتہ ہے۔

جبکہ شبنم کے موتی گلاب کی سُرخ و سفید پنکھڑیوں پر ایک عجب انداز و زینت پیدا کر رہے ہوں تو یہ بالکل ناممکن ہو کہ ایک عجائب پسند طبیعت انکو سرسری نظر سے دیکھکر نظر انداز کر دیے۔ یورپ والے گو جادو ٹونہ تسلیم کریں مگر پھر بھی وہ کون سا دل ہوگا جو پیاری شب ماہ کے لطف اُٹھائے اور نیچر کے اس جادو کے اثر سے بچ جائے۔ شعرا اور قدرت کے دیگر دلدادہ اسی چاندنی رات یا پیاری تاروں بھری رات کی آرزو کیا کرتے ہیں۔ اُنکے شاہان نازاسی جادو والی رات کو سیر گلزار کو میتا باتا نکل آتے ہیں۔ یہی رات عشاق ناکام کو اُنکے بستر استراحت سے سیر گلزار کے لیے کشاں کشاں کھینچ لاتی ہو۔ اور سچ تو یہ ہو کہ فراق کے صدمہ اسی رات میں تارے گن گن کر کم ہو جاتے ہیں۔

میرا خیال تو یہ ہو کہ ماہ کامل کے پُر نور چہرہ کا جادو دربا حسن دلربا۔ اُنکے معشوق کی یاد فراموش کر دیتا ہوگا۔ ورنہ یہ نہوتا۔ وہ دل جو برسوں سے کسی دلربا کی زلف پریشاں سے گھائل ہو کر سیماب کیطرح تڑپ رہا ہو۔ اسی رات کو ماہ کامل کے پر لطف نظارہ سے آرام پاتا ہو۔ سیر و تفریح کیلیے یہ نہایت ہی مناسب رات ہوتی ہو۔ دریا کے کنارے صحرا میں ہرے بھرے سبزہ زار پر گذرتے ہونگے۔ یہ رات طبیعت کو طرفہ لذت بخشتی ہو۔

محمد حسین علوی

غزلیات

حضرت وحید الدین صاحب بیخود دہلوی مدظلہ العالی

دل ہے مشتاق جدا آنکھ طلبگار جدا
خواہش وصل جدا حسرت دیدار جدا

کچھ کھڑے جھومتے ہیں طالب دیدار جدا
اینڈتے پھرتے ہیں کچھ خلد میں میخوار جدا

زاہدوں سے نہ بنی حشر کے دن بھی یارب
وہ کھڑے ہیں تری رحمت کے طلبگار جدا

ہمی جلانے کو ستانے کو مٹانے کو مجھے
وہ جدا غیر جدا چرخ ستمگار جدا

تیغ و خنجر بھی ہیں انداز و ادا بھی موجود
سر کے گاہک ہیں الگ دل کے طلبگار جدا

کعبہ ہو آتے ہیں دل تک ہے رسائی مشکل
سارے رستوں سے ہے یہ منزل دشوار جدا

باغ میں یاد نے اُسکی مجھے ٹکنے نہ دیا
چٹکیاں لینے لگے پھول جدا خار جدا

ہر قدم پر ہے مری خاک سے کھٹکا اُنکو
ہاتھ دامن سے نہ ہوگا دم رفتار جدا

تجلیاں حضرت موسیٰ پہ گریں دو اک بار
شعلۂ شوق جدا شعلۂ دیدار جدا

ہمسری قال سے کب حال کی ہو سکتی ہے
خانقاہوں سے بنے خانۂ خمار جدا

دست صیاد میں ہوں خاک اُڑ دوں کیا پر کو
قینچی گردن میں جدا چنگی میں منقار جدا

ہو گئے وہ سحر وصل یہ کہکر رخصت
تجھ سے کرتا ہے مجھے چرخ ستمگار جدا

دلمیں الفت بھی رہی رشک کے کانٹے بھی رہے
اسنے سو بار ملے ہم ہوے سو بار جدا

قتل کرتے ہی مجھے جلوہ نمائی بھی ہوئی
در پہ ہنگامہ الگ ہے پس دیوار جدا

سختیاں عشق کی جھیلوں کہ سنوں میں دلکی
کھائے جاتا ہے محبت میں یہ غمخوار جدا

حالِ یعقوب کی کیونکر ہو خبر یوسف کو
کوچۂ عشق سے ہے حسن کا بازار جدا

زاہدوں کی تری رحمت پہ چڑھائی ہے الگ
ٹولیاں باندھ کے آئے ہیں گنہگار جدا

وضع کا پاس بھی ہے بیخودی میخوارہ ضرور
کاگ بوتل سے نہ کیجیے سر بازار جدا

حضرت مولانا عزیز لکھنوی مدظلہ العالی

جو راز ہے دل میں وہ ہے اندوختہ انکا — کچھ کہہ نہیں سکتا ہے دہن دوختہ انکا
انکی نگہ گرم ہو جب مانع فریاد — کیا آہ کرے گا کوئی دل سوختہ انکا
کھل جائے گا جب کوئی لگا دینگے وہ ٹھوکر — سب خاک کے پردے میں ہے اندوختہ انکا
دوزخ کے کلیجے میں بھی اک آگ لگی ہے — سرگرم فغاں ہے کوئی دل سوختہ انکا
خود آکے بجھائیں تو لگی دل کی بجھے گی — یہ عشق ہے اک شعلہ افروختہ انکا
کیا کیا نہ عزیز آپ کو ناصح نے پڑھایا
لیکن نہ رہا یاد کچھ آموختہ انکا

حضرت مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی مدظلہ العالی

چھری ہے ہر نفس ہر ہر قدم پر کام قاتل سے — عدم کی شاہراہیں ملگئی ہیں اک رگ دل سے
کسی کا رنج دیکھوں یہ نہیں ہوگا مرے دل سے — نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہدوں عنادل سے
تمنا کی شکایت کیا جو نکلے آہ مشکل سے — یہ کس نے پھیر لیں آنکھیں کہ دنیا پھر گئی دل سے
تعجب خیز ہے معجز نمائی عشق صادق کی — تمنائے دل مجنوں نکل آئی ہے محمل سے
چل اے ہمدم ذرا ساز طرب کی چھیڑ بھی سن لیں — اگر دل بیٹھ جائیگا تو اٹھ جائینگے محفل سے
زیادہ کر رہی ہے بیوفائی طول فرقت کو — تمہارا فاصلہ بڑھتا ہی جاتا ہے مرے دل سے
امید و ناامیدی کا بہم ہونا وہی جانے — کہ جسنے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہو ساحل سے
خدا اے کم سپہری دل کا مطلب خوب ہی نکلا — جنازہ مرکے بھی اٹھتا نہیں ہے کوئے قاتل سے
ترقی عشق نے حد سے بڑھایا پائے الفت کو — تعلق ہو گیا آخر دل مجنوں کو محمل سے
مرے پائے بیاباں گرد کو زنداں سے کیا مطلب — اگر کانٹے نہ پائیگا تو الجھیگا سلاسل سے

نہ سمجھا معنیِ گور و کفن سمجھا تو یہ سمجھا — تھکا تھا میں لپٹ کر سو رہا دامانِ منزل سے
تڑپتا ہے شبِ غم یوں کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا — بتا اے نامرادی کونسی باتیں کروں دل سے
ادھر میں سر بکف پہنچا عدالت گاہِ محشر میں — لہو کی بو ادھر آنے لگی دامانِ قاتل سے
وہی میں ناخدا تھا کشتیِ دل جسکو ڈوبی — مرا قصہ کوئی کہدے سبکسارانِ ساحل سے

وہ جس دن آ گئے شمعیں چڑھانے قبر پر ثاقب
اُسی دن روشنی داغوں کی پھوٹی پردۂ دل سے

جناب عبدالرحیم صاحب کلیم لکھنوی مدظلہ العالی

بیکار یہ فراق کے صدمے گزر گئے — مرنا جو تھا تو مرتے ہی ہم کیوں نہ مر گئے
عیسیٰ کو دیکھکر ترے بیمار مر گئے — صحت کا نام سُنتے ہی چہرے اُتر گئے
تنہا ہم ایک رہ گئے سب اسیر مر گئے — صدمے جہان بھر کے ہمیں پر گزر گئے
میت کے ساتھ ساتھ وہ کیوں ننگے سر گئے — ہم مر کے آج اور بھی بےموت مر گئے
دونوں جہان ایک کیے وہ جدھر گئے — دو چار تیر ادھر گئے دو چار اُدھر گئے
تیر اُنکے اتنے دل میں ہمارے اُتر گئے — ٹیس آبلوں سے دور ہوئی زخم بھر گئے
انجام قربِ یار تناسخ سے بڑھ گیا — سو بار زندہ ہم ہوئے سو بار مر گئے
کچھ میرے ضبطِ عشق کی تصویر کھینچدی — ناکام جو مرے وہ بڑا کام کر گئے
بھولے نہیں عتاب میں بھی اُنکی نازکی — جب ہم چڑھے نظر پہ نظر سے اُتر گئے
آئینہ ہم نے دے کے اُنھیں پیار کر لیا — مُنھ دیکھتے وہ رہ گئے ہم اپنی کر گئے
شق جا بجا زمیں ہوئی اُتنے مقام کی — وحشت میں جس جگہ ترے شوریدہ سر گئے
کہنے کو یوں تو سب کا لیا اُس نے امتحاں — جیتے نشان ہو گئے وہ نام کر گئے
آنکھوں میں وہ بسے کہ نگاہوں میں وہ سمائے — دل سے مرے نکل کے نجانے کدھر گئے
مارا جہاں ہے اپنا سنبھالے ہوئے جگر — تیرِ نظر ترے مرے دل سے اُتر گئے

کہنے کو اک ادا ہے زمانہ کی ہے قضا — لاکھوں اُنھوں نے خون کیے اور مکر گئے
اس بدگمانیوں نے مرا ضعف کھو دیا — میں اُنکے ساتھ ساتھ رہا وہ جدھر گئے
غیروں کو میرے قتل سے ایسی خوشی ہوئی — قاتل پر آج سیکڑوں صدقے اُتر گئے
ہو جنکو لطف زیست اُنھیں کو ہے حضور — ہم کو تو آپ ابھی سے سمجھیے کہ مر گئے
ایسا زمیں کوے صنم کا تھا اشتیاق — ہم آپ وقت دفن لحد میں اُتر گئے
سوئیں نہ آکے کیسلیے تربت میں چین سے — ہم آج امتحان میں پورے اُتر گئے

موسیٰ نہیں کلیم جو غش کھاے طور پر
دیکھ آئے اُسکو صاف جب اہلِ نظر گئے

حضرت مولانا صفی لکھنوی مدظلہ العالی

وہ آئیں تیغ بکف عذر امتحاں میں نہیں — لہو کی بوند مگر جسم ناتواں میں نہیں
سُنیں تو دل پہ لگے چوٹ سُننے والوں کے — یہ کیوں کہوں کہ اثر کچھ مری فغاں میں نہیں
کسی کی بزم میں یہ اعتبار کیا کم ہے — سبک نگاہ حریفاں سبرگراں میں نہیں
کیا ہے کچھ تو سمجھکر یہاں کسی نے قیام — وہ کنج دل میں فضا ہے جو لامکاں میں نہیں
یہ گوش آہ میں جوش اثر نے پھونکا ہے — کہ آج تیرے برابر کوئی جہاں میں نہیں
ہلال میں خم ابرو دستاں ہے تو ہو — کشادِ تیر جگر دوز اس کماں میں نہیں
پگھل گیا مرے نالوں سے سنگ کعبہ تک — مگر نہیں تو اثر کچھ دلِ بتاں میں نہیں
کیا ہے وعدہ کسی بیوفا نے آنے کا — وگرنہ عذر ہمیں مرگ ناگہاں میں نہیں
وہ ہیں ہمارے جبین نیاز میں مضمر — جو نقش سجدہ کسی سنگ آستاں میں نہیں
ملا ہے تھوڑے دنوں کے دوستوں میں جو لطف — نصیب خضر کو وہ عمر جاوداں میں نہیں
نہیں حریص سخن یاں یہ دیکھنا ہے مجھے — کہ دل کی طرح تو کوئی گرہ زباں میں نہیں
پسینہ آگیا جنکو تری ہے تلافیِ رشک — یہ دیکھکر کہ لہو چشم خونفشاں میں نہیں

حرارت غم جانسوز اے معاذ اللہ بھرا ہوا ہے دھواں مغز استخواں میں نہیں

صفیؔ ترا وشش خونابۂ جگر کب تک

لہو کی بوند بھی اب چشم ناتواں میں نہیں

حضرت محشرؔ لکھنوی مدظلہ العالی

عمر کی صرف جستجوئے حبیب اللہ اللہ ری آرزوئے حبیب

ہوئےگا یارب وہ انقلاب کبھی کہ بدل جائے جس سے خوئے حبیب

اس سے مطلب نہیں ملے نہ ملے ہم ہیں اب اور آرزوئے حبیب

اب کہاں میں کہاں حواس مرے ہر نفس آرہی ہے بوئے حبیب

مجھسے امید و یاس کا ہے یہ قول پیے بیٹھا رہ آرزوئے حبیب

اور کچھ ہو گیا دماغ مرا جب سے کھائی ہوائے کوئے حبیب

انتظامات شوق کے صدقے ہاتھ دل پر نظر ہے سوئے حبیب

نکلا آنکھوں سے یوں لہو دل کا بن کے تصویر آرزوئے حبیب

محشرؔ اٹھو چلو ذرا دیکھیں

آرہی ہے کہاں سے بوئے حبیب

جناب منشی عبدالخالق صاحب خلیق دہلوی مدظلہ العالی

جلا دل پہلے جاں اب جل رہی ہے لگی میں اور یہ کیسی لگی ہے

مئے الفت نشیلی ایسی پی ہے کہ ساقی بیخودی سے بیخودی ہے

ہماری تلخ اب جو زندگی ہے کسی کی ترشروئی نے یہ کی ہے

بتوں کو دیدیا ہے حسن ایسا یہ اُسکی شان اُسکی خالقی ہے

نہ میری بات اے شیریں سخن کاٹ زباں ہے تیری یا میٹھی چھری ہے

سمجھ سکتا ہے ناصح عشق آساں کوئی دل کا لگانا دل لگی ہے

نہ اچھی شکل پر مائل ہو اے دل — کہ تیرے حق میں یہ صورت بری ہے
گلے سے تو لگا لینے دے قاتل — تری تلوار کیا ہے اک پری ہے
تمھارے اچھے ہونے میں نہیں شک — مری جاں میری ہی قسمت بری ہے
دکھایا اک حسیں جو آج اُن کو — عجب نخوت سے بولے آدمی ہے
رلاتے ہیں مجھے ذکر عدو سے — جو میری چڑ ہے وہ اُنکی ہنسی ہے
امانت اپنی واعظ تم اُٹھا لو — نصیحت طاقِ نسیاں پر دھری ہے
تمھیں ہم چاہیں تم اوروں کو چاہو — یہ سُنکر بولے اپنا اپنا جی ہے
وہ یکتا شکل آنکھوں میں سمائی — جدھر دیکھو اُدھر صورت وہی ہے
نہ چوکے ظلم سے وہ پیش داور — قیامت پر قیامت ہو رہی ہے

نواسنجان گلستن دم بخود ہیں
غزلخواں کیا خلیق دہلوی ہے

جناب فدا علی صاحب خنجر لکھنوی مدظلہ العالی

ہوا حیران قاتل جذبہاے شوق بسمل سے — چلا تیر نظر اور مل گیا خونِ رگِ دل سے
کھلی ہیں عشق سے آنکھیں ناصح نافہم مشکل سے — نکالی بحث بیجا تو نے پھر ٹوٹے ہوے دل سے
جراحت کے مزے پوچھو دل بیتاب بسمل سے — رگوں میں دوڑنے لگتا ہے خوں یدِ قاتل سے
کہیں ایسا نہو جل بھُنکے قالب خاک ہو جائے — بس اے سوز محبت اب دھواں اُٹھنے لگا دل سے
طلسم عالم ایجاد کیا تھا اک تماشا تھا — کھُلا یہ راز ہم پر جب اُٹھے ہستی کی محفل سے
خدا کی شان ہے وہ ذبح کرنے آئے ہیں مجھکو — اُلجھ پڑتے تھے کل تک جو صدائے نالۂ دل سے
کٹی شام جوانی آئی پیری ہمنفس اُٹھے — شیشے جاتے ہیں ٹوٹے پھوٹے جام محفل سے
بہت تھا دعوی دیدار موسیٰ اب غشی کیسی — کچھ اُسکا ظرف دیکھو بات کی جسنے مقابل سے
بتاؤ تو سہی کیونکر دعا کیواسطے اُٹھتے — ان ہاتھوں کو ہوی کب فرصت ماتم دل سے

ہواؤں کے یہ سناٹے یہ طوفانِ قہ باراں کا
یہ پوچھو اُس سے جو مایوس ہو دامانِ ساحل سے

ستم ہے پھر کسی حسنِ نظارہ سوز نے چھیڑا
سنبھالا تھا ابھی ہم نے دلِ مضطر کو مشکل سے

کچھ ایسی بیکسی سے کشتیِ عمرِ رواں ڈوبی
صدائے الرحیل آنے لگی دامانِ ساحل سے

وہ تشنہ کامِ الفت ہوں کہ میرے قتل ہونے پر
لہو تا دیر برسا دیدۂ شمشیرِ قاتل سے

زمانہ مرکزِ اصلی پہ خود پہنچائے گا خنجر
یہ کیوں تشویش بیجا ہے تو مایوس منزل سے

جناب مرزا واجد حسین صاحب یاس عظیم آبادی مدظلہ العالی

چراغِ زیست بجھا دل سے اک دھواں نکلا
لگا کے آگ مرے گھر سے میہماں نکلا

دل اپنا خاک تھا پھر خاک کو جلانا کیا
نہ کوئی شعلہ اُٹھا اور نہ کچھ دھواں نکلا

سنیں گے چھیڑ کے افسانۂ دلِ مرحوم
ادھر سے ملکِ عدم کا جو کارواں نکلا

تڑپ کے آبلہ پا اُٹھ کھڑے ہوئے آخر
تلاشِ یار میں جب کوئی کارواں نکلا

لہو لگا کے شہیدوں میں ہو گئے داخل
ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا

لگا ہے دل کو اب انجامِ کار کا کھٹکا
بہارِ گل سے بھی اک پہلوئے خزاں نکلا

زمانہ پھر گیا چلنے لگی ہوا اُلٹی
چمن کو آگ لگا کر جو باغباں نکلا

ہمارے صبر کی کھاتے ہیں سب قسم اغیار
جفا کشی کا مزہ بعدِ امتحاں نکلا

خوشی سے ہو گئے بدخواہ میرے شادیٔ مرگ
کفن پہن کے جو میں گھر سے ناگہاں نکلا

اجل سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا
خدا کی شان کہ دشمن نگاہباں نکلا

حریمِ ناز میں شاید کسی کو دخل نہیں
دلِ عزیز بھی ناخواندہ میہماں نکلا

نہاں تھا خانۂ دل ہی میں شاہدِ معنی
جو بے نشاں تھا وہ دیوار درمیاں نکلا

ہے فنِ عشق کا اُستاد بس دلِ وحشی
مریضِ غم کا یہی اک مزاج داں نکلا

دکھایا گورِ سکندر نے بڑھ کے آئینہ
جو سر اُٹھا کے کوئی زیرِ آسماں نکلا

عدسے بڑھکے نہیں کوئی گوشۂ راحت　　قیامت آئی جو اس گھر سے میہماں نکلا
اب اپنی روح ہے اور سیر عالم بالا　　کنوئیں سے یوسف گم کردہ کارواں نکلا

کلام یاس سے دنیا میں پھر اک آگ لگی
یہ کون حضرت آتش کا ہمزباں نکلا

جناب کنور محمد حیات علی خانصاحب آتش رئیس اترولی مظلہ العالی

تیغ کے ٹکڑے ہوے شل دست قاتل ہوگیا　　سخت جانی سے خجل ہوکر میں بسمل ہوگیا
عشق میں پورا محبت میں وہ کامل ہوگیا　　لطف جسکو وصل کا فرقت میں حاصل ہوگیا
جسکو خلوت میں بھی آنکھیں چار کرتے شرم تھی　　خیر سے اب وہ زمانہ بھر کا قاتل ہوگیا
کرتے کرتے وعدۂ دیدار پورا رہ گئے　　ہوتے ہوتے شادماں پژمردہ یہ دل ہوگیا
مدرسہ میں عشق کے دو حرف جس نے پڑھ لیے　　ہوگیا ماہر اک فن میں وہ کامل ہوگیا
دل فرشتہ خو مرا الفت میں اُسکے غرق ہو　　آپکا چاہ ذقن بھی چاہ بابل ہوگیا
ہر کرم میں بھی مجھے ملنے لگا لطف ستم　　مائل ذوق مصیبت اسقدر دل ہوگیا
جسکو دیکھا جاں کا خواہاں نظر آنے لگا　　اپنا گھر اپنا محلہ۔ کوئے قاتل ہوگیا

جی جلاتا تھا جو میرا خاک کرتا تھا مجھے
آج اے آتش وہ آکر شمع محفل ہوگیا

ابن مسلم

"تمدن" کے پرانے کرمفرما جناب سلطان حیدر صاحب جوش (علیگ) نے ابن مسلم نامی ایک ناول دو سال کی مسلسل کوشش سے تیار کیا ہے جسکا حجم دو سو سوا دو سو صفحہ کے قریب ہے ہمکو معلوم ہوا ہے کہ ناول زیر طبع ہے۔ ناظرین "تمدن" جنھوں نے مسٹر جوش کے مضامین پڑھے ہیں ضرور اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ ناول کیا چیز ہوگا۔

(سفرنامہ میں غلطی سے بعض جگہ ۱۹۱۳ء کی جگہ ۱۹۱۱ء چھپ گیا ہے ناظرین صحت کرلیں)
(سفرنامہ کے سلسلے کے ۱۷ اکتوبر نمبر ملاحظہ ہو)

میرا پہلا لکچر نگاساکی میں بدھ مذہب کے مشہور مندر نمی بہ چو شو جی میں انگریزی میں ہوا۔ اُس کا مختصر ذکر "نگاساکی پریس" مورخہ ۱۹۔ دسمبر ۱۹۰۵ء نے حسب ذیل الفاظ میں کیا:۔

ترجمہ

نگاساکی پریس ۱۹ دسمبر ۱۹۱۵ء

ڈاکٹر محمد سرفراز حسین نے چشوجی کے مندر میں ایک لیکچر دیا۔ لیکچر کا عنوان "خدا کا خیال" تھا دو سو کے قریب جاپانی لیکچر میں موجود تھے۔ جلسہ کے صدر مسٹر سوزوکی ایڈیٹر "تو یو صنودے" تھے جنھوں نے لیکچر کا ترجمہ بھی کیا کیونکہ لیکچر انگریزی زبان میں تھا۔

لیکچرار مسلمان ہے اور اُس نے نہایت دلچسپ پیرایہ میں ثابت کیا کہ توحید جو کسی نہ کسی صورت میں ہر مذہب و فلسفہ میں موجود تھی اسلام میں درجۂ تکمیل کو پہنچی۔ اسی کے ضمن میں لکچرار نے کل مشہور مذاہب اور فلسفوں کا ذکر کیا۔

میں مسٹر سوزوکی کا نہایت ممنون ہوں۔ اُن ہی کی کوشش سے یہ لکچر ہوا علاوہ ترجمہ کرنے کی تکلیف اُٹھانے کے انھوں نے مجھ سے از حد محبت کا اظہار کیا۔

نگاساکی سے کوبے پہنچا اور وہاں ایک ہفتہ قیام کرکے دار السلطنت ٹوکیو میں پہنچا۔ وہاں کے اخبارات نے میرا خیر مقدم نہایت عمدہ الفاظ میں کیا۔ ہندوستان میں اخبار وکیل نے حسب ذیل نوٹ شائع کیا۔

از اخبار وکیل امرتسر مورخہ ۲۔ فروری ۱۹۰۶ء

ناظرین یہ خبر نہایت مسرت سے سُنیں گے کہ اسلام کے سچے خادم	**سفر جاپان**

اور ہمارے کرمفرما قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی جو ایک سال کی فرلو لے کر جاپان تشریف لے گئے ہیں ۱۱ دسمبر کو ناگاساکی پہنچے اور ۱۸ دسمبر کو بدھ مذہب کے مندر چوشوجی میں توحید پر انگریزی میں لیکچر دیا۔ جسکا ترجمہ جاپانی زبان میں ایک لائق جاپانی جنٹلمین نے کیا۔ دوسو کے قریب حاضرین تھے جنھوں نے لیکچر مذکور کو دو گھنٹہ تک نہایت توجہ اور غور سے سُنا۔ ایک امریکن لیڈی مِس رینڈ لعت گوڈ بھی موجود تھیں۔ اگلے روز انگریزی اور جاپانی اخباروں نے آپکے لیکچر پر نہایت معقول ریویو کیا۔ اور کلمات تحسین کے بعد لکھا کہ یہ پہلا موقعہ ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی توحید کا وعظ جاپان میں کیا گیا ہے کثرت سے لوگ آپ سے ملنے آتے اور اسلام کی حقانیت کی باتیں نہایت شوق سے سُنتے رہے۔ ناگاساکی سے آپ شہر کوبے میں پہنچے جو دوسرا بندرگاہ ہے وہاں سے اب آپ ٹوکیو دارالسلطنت جاپان میں پہنچ گئے ہیں۔ امید ہے اشاعت اسلام کے متعلق قاری صاحب کی کوششیں بارآور ہوں گی اور آپ وقتاً فوقتاً اپنی قابل قدر مذہبی خدمات کے نتائج سے وکیل کے کالموں کو مزیں فرماتے رہیں گے۔

ٹوکیو میں ایک ماہ کے قریب رہا۔ وہاں اُن ہندوستانی طلباء نے جو وہاں پڑھتے تھے مجھ پر بہت عنایت کی۔ مسلمان طالبعلم تو صرف ایک تھے باقی طلبہ ہندو اور بنگالی تھے۔ ان سب نے خلوص کا برتاؤ کیا۔ ٹوکیو کے اخبارات نے بھی مروت کا برتاؤ کیا۔ اور میری آمد کی خبر اور مقصد کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا مگر وہ انجمن جسکی تلاش میں میں نکلا تھا نہ ملنی تھی نہ ملی۔ ناچار میں نے وہاں بطور خود لیکچروں کا بندوبست کیا ایک لیکچر یونی ٹیرین چرچ میں ہوا لیکچر انگریزی میں تھا۔ ترجمان صاحب ایک ایک فقرہ کا ترجمہ جاپانی زبان میں

کرتے جاتے تھے۔

دوسرا لیکچر سوسائٹی برائے انسداد مظالم برحیوانات میں ہوا۔ اخبارات نے میرے لیکچروں پر بہت معقول ریویو کیے۔

۱۸ فروری ۱۹۰۶ء کے وکیل میں میرے متعلق حسب ذیل نوٹ شائع ہوا

از اخبار وکیل امرتسر مورخہ ۱۸ فروری ۱۹۰۶ء

قاری سرفراز حسین صاحب دہلوی جاپان میں اسلام کی منادی کرنے کو پہنچ گئے ہیں اور وہاں کے لوگ ان کے لکچر دلچسپی کے ساتھ سنتے ہیں۔ اخبارات میں خاص طور پر ان کی تقریروں کا اقتباس درج ہوتا ہے۔

اسی تاریخ یعنی ۱۸ فروری ۱۹۰۶ء کے اخبار روزگار میں میرے متعلق حسب ذیل مضمون شائع ہوا جس کا میں تہ دل سے ممنون ہوں۔

جاپان میں اشاعت اسلام

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

قاری سرفراز حسین ایک مسلمان مشنری

قاری سرفراز حسین صاحب مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے ایک پرانے طالبعلم اور ہمارے دیرینہ کرمفرما دوست ہیں۔ انسپکٹر جنرل سپلائی و ٹرنسپورٹ ایسٹرن کمانڈ نینی تال کے دفتر میں ملازم ہیں۔ عربی زبان اور علوم دینیات کے بہت اچھے ماہر اور انگریزی زبان میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ رکھتے ہیں اور قومی ترقی کے جد و جہد کے میدان میں ہمیشہ ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں اسوقت جس اولوالعزمی اور ہمت کا کام اُنھوں نے کیا ہے وہ قرن اولیٰ کے

مسلمانوں کی ہمت اور جوانمردی کا ایک نمونہ ہے - جاپان میں اشاعت اسلام کی ضرورت کے چرچوں کو سُن کر یہ جوان ہمت اور محب اسلام بزرگ بغیر کسی شور وشغف کے چپ چاپ اُٹھکر ملازمت سے رخصت لے کر اپنے خرچ سے جاپان پہنچ گیا ہے اور اشاعت اسلام کے متعلق جاپان کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے - جاپان سے انھوں نے اپنا پہلا خط حسب ذیل لکھا ہے جو پیسہ اخبار میں چھپوایا گیا ہے -

از مقام کوبے ملک جاپان - محل مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۵ء

برخوردار عباس حسین طول عمرہٗ - بعد دعا کے معلوم ہو کہ مَیں نے ایک پوسٹ کارڈ مقام ناگاساکی سے ڈالا تھا - امید ہے کہ پہنچا ہو گا - مَیں اللہ کے فضل و کرم سے بالکل تندرست ہوں اور ہر طرح سے آرام و آسایش میں ہوں - سردی ابھی تک نینی تال ہی کے مثل مل رہی ہے - اور کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے - برف ابھی تک یہاں شروع نہیں ہوی - جنوری میں پڑے گی - صحت کے اعتبار سے آب وہوا جاپان کی نہایت عمدہ ہے اور مجھے موافق ہے - میں ۱۱ دسمبر کو ناگاساکی پہنچا تھا اور دس روز وہاں رہ کر ۲۰ تاریخ کو روانہ ہو کر کل صبح کو یہاں پہنچا - ہندوستان میں جو خبر سُنی تھی کہ ناگاساکی میں مذہب کی کمیٹی ہے وہ مجھے وہاں نہ ملی - دس روز تک میں نے ہر قسم کی کوشش کی - لوگوں سے ملاقات کی - اخباروں میں اشتہار دیے - مگر اسکا پتہ نہ چلا - غالباً کسی دوسرے شہر میں ہو گی - جس کا حال مجھے آیندہ معلوم ہو جاوے گا - ۱۸ تاریخ کو میں نے ناگاساکی کے ایک مشہور مندر میں انگریزی میں توحید پر لکچر دیا - دو سَو سے زیادہ آدمی تھے - اور لوگوں نے بہت پسند کیا اُس کا ترجمہ جاپانی زبان میں کرکے ایک دوسرے شخص نے سُنایا - دوسرے دن مجھے

اخباروں نے میرے لکچر کی اللہ کے فضل سے بہت تعریف چھاپی اور ایک
جاپانی اخبار نے لکھا کہ یہ پہلی مرتبہ ہے کہ جاپان میں اسلام کا لکچر سنایا گیا
اُسکے بعد جو میں دو دن وہاں رہا۔ تو لوگ مجھے ملنے میرے ہوٹل میں آتے رہے
اور ایک جاپانی جنٹلمین اور ایک امریکن لیڈی نے بعد چندے مطالعہ کے
اسلام قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے اب میں انشاء اللہ دار السلطنت ٹوکیو
جارہا ہوں تاکہ اس کمیٹی کے آدمیوں سے مل کر اور اپنا کام وہاں جاکر تقریر
و تحریر کی کارروائی وہاں سے شروع کروں اور پھر دوسرے شہروں میں لکچر
دینے نکلوں۔ جاپانی لوگ پڑھنے کے لیے رسالے مانگتے ہیں۔ ٹوکیو پہنچ کر
رسالے بھی تصنیف کر کے چھپوا دوں گا۔ اس کام میں بڑا خرچ درکار ہے
بغیر اسکے یہاں گذارہ نہیں ہے۔ کل یا پرسوں انشاء اللہ میں ٹوکیو روانہ ہوں
اب تک تمہارے پاس سے کوئی خط مجھے نہیں ملا۔ آئندہ خطوط ٹوکیو بھیجنا۔
جو خط ناگاساکی پہنچیں گے۔ وہ مجھے ٹوکیو بھیج دیے جائیں گے۔ اسکا انتظام
میں نے کر دیا ہے۔ مجھے اس لکچر میں بہت تقویت ہو گئی ہے اور اللہ کے
فضل سے ہر طرح امید ہے کہ ٹوکیو پہنچ کر میں اپنے مقاصد میں اچھی طرح
کامیاب ہوں گا۔ خدا کے فضل سے میرا دل زیادہ قوی ہوتا جاتا ہے۔ ایک
پادری صاحب سے جہاز میں مباحثہ ہوا۔ اور دو جاپانی عیسائی شدہ پادری
بعد لکچر کے مجھ سے گفتگو کرنے ہوٹل میں آئے۔ ان تینوں کو میں نے اللہ کے
فضل سے قوی دلائل سے بند کر دیا۔ ان لوگوں کو کچھ جواب بن نہ آیا۔
یہاں پادریوں کا زور ہے۔ اور دن بدن ہوتا جاتا ہے۔ لاکھوں روپے
مشن کے کام پر خرچ کر رہے ہیں اور گرجا اور مدرسے اور سوسائٹیاں قائم
ہیں۔ اسلام کے ایک باقاعدہ مستقل مشن کی یہاں اشد ضرورت ہے۔ ٹوکیو پہنچ کر

اس مضمون پر ایک مفصل تحریر ہندوستان بھیجوں گا۔"

قاری صاحب کے اس خط کے پڑھنے کے بعد کون سا ایسا مسلمان ہوگا جسکے منہ سے احسن و مرحبا کی صدا اس نیک اور سچے اور باہمت مسلمان کی نسبت نہ نکلے گی اور کون سا ایسا مسلمان دل ہوگا جس سے قاری صاحب کے مشن مبارک اور عظیم الشان مقصد اور مدعا کی کامیابی کی دعا نہ نکلے گی۔ لیکن جہاں تحسین و تعریف کی جاوے گی اور دعائیں مانگی جائیں گی۔ وہاں اس امر پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ قاری صاحب کو جو احتیاجات پیش آئیں گی ان کے پورے کیے جانے کے لیے وہ مسلمانان ہندوستان کی امداد کے مستحق ہیں یا نہیں۔ اس امر کی نسبت ہم اپنے ذاتی علم اور واقفیت سے مسلمانان ہندوستان کو یقین اور اطمینان دلا سکتے ہیں کہ قاری صاحب نے جو کام اختیار کیا ہے اور جس نیک اور اہم مقصد کے پورا کرنے کے واسطے اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ اسکے کرنے کے وہ بہمہ وجوہ قابل ہیں۔ ہر ایک مسلمان کو ان کی عالی ہمتی اور اس سب سے بڑے قومی اور اسلامی خدمت کا دل سے مشکور ہونا چاہیے لیکن قاری صاحب کی قوت ایمان نے جس امر کا ان کو تقاضا کیا اس کو وہ اپنی طرف سے پورا کر چکے ہیں۔ اُنھوں نے اپنا گھر چھوڑا۔ عزیز و اقارب کو چھوڑا۔ آرام و آسایش کو چھوڑا۔ اپنا وقت اپنے پاک اور پیارے دین کی خدمت کے واسطے وقف کر دیا۔ اور اپنے مقدور کے موافق اپنی گرہ سے خرچ بھی برداشت کیا۔ لیکن ممالک غیر میں اشاعت اسلام کا کام ایسا کام نہیں ہے جس کے واسطے ضروریات مصارف کی حاجات کو قاری صاحب اپنی گرہ سے پورا کر سکیں۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس کے واسطے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں روپیہ کی ضرورت ہے اور اگر محض اس وجہ سے کہ روپیہ کی

امداد نہیں مل سکتی اس بزرگ کام کے متعلق کوششوں کو ترک کردینا پڑیگا
تو اس سے بڑھکر شرمناک پست ہمتی کے اظہار کا کوئی امر مسلمانان ہندوستان
کے واسطے نہیں ہوگا۔ مسلمانان ہندوستان نے اپنی قومی ضرورت کے
کاموں میں اب تک جو امداد دی ہے وہ گو توقع سے کم ہو مگر پھر بھی قابل
تعریف ہے۔ ہر ایک قومی ضرورت جو مسلمانوں کے سامنے پیش کی گئی ہے
اس میں ان تمام مسلمانوں نے جنھوں نے اس ضرورت کو سمجھا ہے بہت عمدہ امداد
دی ہے۔ تو اشاعت اسلام کے عالیشان مقصد کے واسطے اگر مسلمان امداد
دینے میں قصور یا کوتاہی کریں تو اسکے معنی صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ مسلمانان
ہندوستان اشاعت اسلام کے کام کو ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن ہم یقین
کرتے ہیں کہ تمام دنیا کے کروڑوں مسلمانوں میں گو ایسے مسلمان موجود ہوں
جو اپنے دیگر اقسام کے حوائج سے ناواقف اور بے خبر ہوں مغربی علوم و
فنون کے حصول کی ضرورت کو نہ سمجھتے ہوں۔ اقوام یورپ کے نقش قدم
پر چل کر اپنے حالات کی اصلاح کے گر سے بے علم ہوں لیکن کوئی مسلمان
با علم و باخبر یا جاہل ایسا نہیں ہوگا جو اشاعت اسلام کے مقدس کام کی
ضرورت سے انکار کرے یا جسکے دل میں اس نیک کام کے کرنے کا شوق نہو
اور اگر یہ امر صحیح ہے تو اس ضرورت کے مانے جانے اور شوق کا ثبوت صرف
ایک ہی طریق پر دیا جا سکتا ہے کہ تمام مسلمان اپنی اپنی ہمت اور توفیق کے
مطابق اس مدعا کے حاصل کیے جانے کی کوششوں کے لیے روپیہ سے
امداد کریں۔ ہم گذشتہ تحریروں میں بیان کر چکے ہیں کہ یہی ایک ایسا
کام اور مقصد مسلمانوں کا ہے جسمیں ہر طبقہ اور ہر فرقہ اور ہر قسم کے
مسلمان بلا اختلاف رائے شامل اور شریک ہو سکتے ہیں پس جب چندہ کی

ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہر ایک مقام پر ایسے اہل دل مسلمان پائے جائیں جو اس کار خیر کے واسطے چندہ جمع کریں۔ چندہ دینے والوں کی کمی کی شکایت کہیں بھی پیش نہیں آئے گی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے جن دوستوں اور جن محبان ... پاک کے کانوں میں ہماری یہ صدا پہنچی ہے انھوں نے اپنے اس سب سے بزرگ اور ضروری کام کے واسطے کیا کچھ کیا ہے اور آخر میں ہم خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں کہ وہ رب کریم و رحیم جس کے کرم و فضل پر قاری سرفراز حسین بھروسہ اور توکل کرکے اس نیک اور پاک کام کے واسطے پردیس میں جا پہنچے ہیں مسلمانوں کے دلوں میں ان کی امداد کا خیال ڈالے اور ان کی امداد کی ہمت اور توفیق عطا کرے اور قاری صاحب کو اپنے اس مہتم بالشان کام میں کامیابی اور بارگاہ باری تعالےٰ سے اجر عظیم حاصل ہو۔ آمین "

۳۰ مارچ سنہ ۱۹۰۶ء کے روزگار میں مسٹر محمد دین صاحب کا حوصلہ افزا خط شائع ہوا جسکو شکریہ کے ساتھ درج کرتا ہوں وھوھذا

اشاعت اسلام

مکرم بندہ جناب قاضی صاحب زاد لطفہ،۔

سلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالےٰ وبرکاتہ۔ روزگار کے پرچہ مورخہ ۱۷ فروری سنہ ۱۹۰۶ء میں جاپان میں اشاعت اسلام کے مضمون کو پڑھکر جسقدر مسرت ہوئی ہے۔ اسکو میں احاطۂ بیان سے باہر پاتا ہوں قاری سرفراز حسین صاحب نے جس جوش محبت و اولوالعزمی سے یہ مقصد اعلیٰ

اصلی حسن افزا صابون

معزز صاحبان و حکماء یونان کے نسخوں سے سائینٹفک [illegible]
خبردار ہوشیار رہنا ایسا نہ ہو کہ دھوکہ کھا جاؤ کیونکہ بہت سے
جعلی اشتہار حسن افزا صابن کے نام سے شائع ہو رہے ہیں

جو کہ بے خوبصورت ہونے کی بینظیر دوا ہے۔ تازہ تازہ پھولوں اور طبی ادویات سے تیار کیا جاتا ہے جو حسن کو دوبالا کرتا ہے اور چہرے کو آئینہ وار شفاف بنا دیتا ہے۔ اور جلد کی تمام جھائیاں۔ مہاسے۔ داغ۔ دھبے۔ پھوڑے۔ پھنسیاں زائل کر دیتا ہے اور جلد کو مخمل کے مانند ملائم اور گلاب کی پتی کی طرح خوبصورت بنا دیتا ہے صرف سات روز مل کر نہانے سے کالا رنگ کھلا ہوا چہرہ صاف ہو کر بدن گورا خوبصورت نکل آتا ہے بدن پر شعور کی سی سرخی نظر آنے لگتی ہے۔ معزز رئیسوں اور خاص بیگمات نے پسند فرمایا ہے قیمت بھی معمولی ہے یعنی فی بکس تین ٹکیہ مع ایک نفیس صابن دانی کے صرف ایک روپیہ [illegible]

روغن دل بہار گیسو دراز

یہ نفیس تیل جو اپنی خوشبو میں لاجواب ہے اسکو خواتین نے خاص طور پر پسند فرمایا ہے۔ اسکے استعمال سے بدن دماغ اور دل کو فرحت ہوتی ہے خشکی وغیرہ کو رفع کرتا ہے۔ اسکے استعمال سے بال لمبے سیاہ اور باریک ہو کر ریشم کی طرح ملائم ہو جاتے ہیں۔ اسکی بھینی بھینی خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا ہے طبیعت ہر وقت سرور اور ہشاش بشاش رہتی ہے قیمت فی شیشی دو روپیہ ایک روپیہ دواخانہ کی بڑی فہرست مفت طلب کریں

پتہ حکیم محمد یعقوب خان مالک دواخانہ

[illegible]

جلد [illegible] جنوری ۱۹۱۶ء نمبر [illegible]

تمدن

معاشرتی، تمدنی، ادبی، فلسفی، اخلاقی، تاریخی اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر۔ ایم۔ اے۔ قاری (علیگ) دہلوی خلف اکبر جناب قاری
محمد سرفراز حسین صاحب (علیگ) عزمی دہلوی سیاح جاپان و انگلستان

فہرست مضامین

[illegible]

[illegible]

(۱) [illegible] کی [illegible] شائع ہوگا ارسال [illegible]

(۲) ایسے مضامین [illegible] کہ کسی صاحب کے پاس بطور لفافہ

چھپے یا ذاتیات بحث یا سیاسی [illegible] کی خدمت [illegible] لفافہ کوئی خبر نہ پہنچے تو کسی

چھپے ہوں درج [illegible] نہیں ہوتے۔ [illegible] تاریخ تک طلب کریں ورنہ پھر

(۵) مضامین [illegible] کی [illegible] آئے [illegible] آنے پر [illegible]

لکھے جانے چاہئیں۔ [illegible] ہوگا۔

(۴) جو مضمون کسی دوسرے رسالے میں (۶) تمام مضامین درج [illegible]

شائع ہو چکا ہو اسکو قبول نہ کیے نہیں ہو سکتے۔

ناولہائے قادری

مولوی محمد سرفراز حسین صاحب قریشی دہلوی [illegible] کے اخلاقی

ناول سید سجادت شاہد [illegible] قدر دانوں

کے ہاتھوں [illegible] چکے ہیں اب ایک مجموعہ کی صورت میں

چھپوائے گئے ہیں ۳۰ [illegible]

[illegible]

[illegible]

تمدن

جذبات الاقوام

برگ برگ گلبن امیدم از لب تشنگی
با زبانِ حال مے گوید کہ یاراں راچہ شد

اس کائنات میں جو کچھ ہم دیکھتے یا جو کچھ پاتے ہیں عام اس سے کہ ہم اب تک اُسکی کیفیت اور حقیقت سے واقف ہو چکے ہوں یا ابھی انکشاف حقیقت کی حقیقت تو کُھلی ہو اُن سب میں ایک قسم کی نسبت اور رشتہ ہے خواہ وہ نسبت اور رشتہ نوعیت کے اعتبار سے ہو یا جنبیت اور شخصیت کی جہت سے اس نسبت اور رشتہ کے ساتھ قدرت کی جانب سے ایکتا اور رشتہ بھی رکھا گیا ہے جو ایک رشتہ کو دوسرے رشتہ سے باعتبار نوعیت جنبیت اور شخصیت کے ملاتا ہے ملاتا ہی نہیں بلکہ ایک نسبت دوسرے نسبت سے انجذابی رنگ میں متلاصق ہونے کی کوشش میں رہتی ہے اور چاہتی ہے کہ کسی دوسری ہستی سے اُس رنگ میں

نسبت پیدا کرے کہ اُس نسبت سے اُسکی نسبت اُس فوقیت اور اُس برتری پر حائز ہو جو فوقیت اور جو برتری اس کائنات میں ایک ہستی یا نظام ہستی کو قائم اور ثابت رکھنے کے واسطے ایک ایسی لابدی شرط شمار ہوتی ہے جس سے یہ تمام کائنات درجہ بدرجہ اپنے اپنے رنگ میں جامہ ہستی زیب تن کیے ہوئے ہے جب یہ شرط مفقود ہو جاتی ہے تو نظام ہستی میں بھی فتور آ جاتا ہے اور اس حالت میں صرف وہی ہستی اس کائنات میں قائم اور ثابت رہتی ہے جو اصول تنازع للبقاء رہنے کے قابل ہے یا رہ سکتی ہے۔

کھلے یا موٹے الفاظ میں اس عمل یا اس خاصہ کا نام کشش یا جذبہ رکھنا زیادہ ترموزوں ہے اور یہی نام علمی رنگ میں بھی رکھا جاسکتا ہے ہم تھوڑے سے غور کے بعد یہ بات یقینی رنگ میں کہہ سکتے ہیں کہ فیضان قدرت سے ہر ہستی میں ایک مواد کشش یا جذبہ کا رکھا گیا ہے ہر ہستی اور ہر شے اس کشش اور اس جذب کی وجہ سے اپنی ہستی کو محض قائم ہی نہیں رکھتی بلکہ مقابلتاً قائم رہنے کی کوشش بھی کرتی ہے گو اس تگ و دو میں بعض وقت اُسکی اپنی ہستی بھی معرض زوال میں جا پڑتی ہے اور بعض اوقات ایسی کشمکش کی بھی نوبت آجاتی ہے کہ خود ایک ہستی بھی جامۂ ہستی میں رہنے سے بیزار ہو جاتی ہے اور چاہتی ہے کہ اُسکا رشتۂ ہستی ٹوٹ جائے اور وہ اس عدم میں جا بسے جہاں اُسکی ہستی کا ذکر بھی نہ ہو۔

کسی شخصیت کو کسی ایک شے یا کسی ایک ہستی میں جسطرح کشش اور جذب ہوتا ہے اسی طرح خاندانوں۔ کنبوں اور قوموں کی بھی ایک کشش یا ایک جذب ہوتا ہے جسطرح ایک شخصیت ایک ہستی دوسری شخصیت دوسری ہستی کے مقابلہ میں اپنی ذات کی حفاظت کرتی اور قائم و ثابت رہنا چاہتی ہے اسی طرح ایک کنبہ

ایک خاندان ایک قوم بھی اسی کشمکش میں رہتی ہے یا ہر ایک کنبہ خاندان اور قوم کو اسی کشمکش میں رہنا چاہیئے۔

جس طرح شخصیتیں۔ خاندان اور کنبے ہمیشہ اس فکر اور تردد میں رہتے ہیں کہ انفرادی رنگ میں اُن کی شخصیت۔ اُنکا خاندان اور اُنکا کنبہ مقابلتاً اپنی ہستی قائم رکھ سکے اسیطرح اجتماعی رنگ میں قومیں بھی اس کشمکش میں رہتی ہیں جو لوگ شخصیتوں۔ خاندانوں اور کنبوں کے رجحانات ہستی پر غور کرنے کے عادی ہیں وہ اجتماعی رجحانات یا اقوامی رجحانات کا پتہ بھی بخوبی لگا سکتے ہیں کیونکہ دونوں صورتیں ایک ہی اصول اور ایک ہی شرط کے ماتحت کام کرتی ہیں اگر ایک شخصیت دوسری شخصیت پر غالب آکر اپنی شخصیت کو فائق اور ممتاز بنا سکتی ہے یا مقابلتاً قائم اور ثابت رہ سکتی ہے تو ایک قوم کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ دوسری قوم کے مقابلہ میں خود کو ایک ممتاز درجہ پر رکھنے کی کوشش میں رہے۔

اخلاقی رنگ میں یہ کہنا کہ یہ عمل اخلاق کے خلاف ہے یا انصاف اس کا متقاضی نہیں ہے اُس ضابطہ اور اُس قانون سے بے خبری کا ثبوت دیتا ہے جو نظام اقوام میں ہی نہیں بلکہ نظام کائنات میں بھی ساری اور شمول ہے

جب ایک شخصیت یا ایک قوم کسی دوسری شخصیت یا دوسری قوم کے مقابلہ میں ساعی ہوتی ہے تو اُسکا ہمیشہ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دوسری شخصیت یا دوسری قوم صفحۂ ہستی سے محو کردی جائے بلکہ یہ کہ وہ اس کشمکش میں خود کو قائم رکھ سکے وہ کسی دوسری شخصیت یا قوم کو اُس کوشش سے منع نہیں کرتی جسکی وہ خود مشتاق اور رہین ہے البتہ اپنے وسائل کے تابع بنانے اور اُن ذرائع پر بخوشی اسلوب اور بغیر کسی مانع کے قابض اور دخیل رہنا چاہتی ہے جو اسکے اور دیگر ہر ایک ہستی نظام ہستی کے قائم رکھنے کے واسطے موجود یا مہیا پائے جاتے ہیں قدرت کی

جانب سے بہت کچھ ہمیں مفت بھی دیا گیا ہے اگر ہم اُسکی قیمت لگائیں یا قیمت پر اُنکا فیصلہ ہو تو شاید کوئی ہستی بھی اس کائنات زندگی میں ثابت اور قائم نہ رہ سکے جن بعض عناصر پر انسان کی زندگی کا بہت کچھ دار ہے اور جنکے بغیر کوئی زندگی بھی اس کامیابی سے اس دارالحیات میں رہ نہیں سکتی اگرچہ وہ اسوقت ہمیں محض ارزاں ہی نہیں بلکہ مفت سے بھی زیادہ تر سہل معلوم دیتے ہیں اُنکا نرخ یا گرانی اُس وقت معلوم ہو سکتی ہے جب کبھی اُن کا ایک ادنیٰ جزو بھی ہمیں تلاش کرنے پر۔ تلاش کرنے پر ہی نہیں بلکہ ایک گراں بہا معاوضہ دینے پر بھی میسر نہیں آتا۔ اگر ایک پیاسے کو پانی نہ ملے اور اسکے ارد گرد وہ مل بھی نہ سکے تو اُس حالت میں اُسکی ضرورت اور اُس قطرہ کی قیمت اور گراں بہائی کا وزن ہو سکتا ہے اور ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ایک قطرہ پانی کی قیمت بھی کیا کچھ ہو سکتی ہے دوسرے الفاظ میں یہ کہنا پڑے گا کہ

انسان کی زندگی ایک قطرہ پانی پر موقوف ہے یا انسان کی زندگی ایک قطرۂ آب کی رہین ہے۔ اگر ایک وقت پانی میسر نہیں آ سکتا تو انسان کی زندگی بہت کچھ زوال پذیر ہو سکتی ہے۔ اور انسان یہ معلوم کر سکتا ہے کہ ان مفت چیزوں کی قیمت بھی کس قدر گراں ہے۔ قدرت کی جانب سے جو چیزیں جو عناصر اور جو مواد ہمیں مفت دیا گیا ہے اُسپر اگرچہ بعض وقت بعض ہستیاں قبضہ کرنے کا حق حاصل کرتی ہیں اور مختلف انسانی دلائل سے اُن پر اپنا حق جتاتی ہیں لیکن دراصل جو کچھ ہمیں مفت دیا گیا ہے وہ کسی ایک کا حق نہیں ہے سب کائنات کا اُسمیں حصہ بخرہ ہے۔

اگر کوئی ہستی یہ دعوے کرتی ہے تو وہ ایک مغالطہ میں گرفتار رہے اور وہ اپنے حق کو حقوق عامہ پر فوقیت دیتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ قدرت کی جانب سے

صرف اُسی کے نام پر تمام عناصر کی رجسٹری کردی جائے اور کوئی دوسری ہستی اُس میں شرکت نہ رکھے ہم کسی دوسری ہستی کو اس خوان یغما سے بند نہیں کرسکتے لیکن ہمیں قدرت نے یہ بھی سکھایا پڑھایا ہے کہ جہانتک ہوسکے جلب منافع اور سلب مفاد میں جائز طریق سے کوشش کی جاے اپنا حق لیا جائے دوسرے کے حق میں دست اندازی نہ کی جاے اس عمل اور اس طریق کا نام ہستیوں کی کشمکش ہے اور اسی کو علمی رنگ میں تنازع للبقاء کہتے ہیں -

ہر نوع کو اس کائنات میں ایک وسیع فیلڈ دیا گیا ہے اور یہ ہدایت کی گئی ہے کہ افراد نوع اُس احاطہ میں اپنی اپنی بساط کے موافق بود و باش رکھیں وہ آسایش اور وہ مفاد حاصل کرنے کی کوشش کریں جو اُن کو اس کائنات میں مل سکتا ہے اور جسکے وہ مستحق ہیں یا خود کو مستحق جانتے ہیں یہ جدا بات ہے کہ اس کشمکش اور اس تگ و دو سے کوئی قوم یا کوئی دوسری شخصیت جلب منافع اور سلب مفاد سے رہ جائے مثلاً ایک دہانۂ آب پر لوگ پانی لینے جاتے ہیں ہر شخص اس کوشش میں رہتا ہے کہ اُسے اپنی ہستی کے مطابق پانی سے حصہ ملے اگر اس کشمکش میں کوئی محروم رہ جائے تو یہ کسی دوسری ہستی کا گناہ نہیں ہوگا یہ کامیابی اور یہ مایوسی اُس ضابطہ کوشش اور اُس طریق عمل کے ماتحت ہے جو ہر ہستی کا معمول ہے اگر ایک منڈی میں ایک خریدار صبح ہی صبح پہنچکر تازہ اور عمدہ پھل خرید لاتا ہے اور دوسرا شام کو آتا ہے تو یہ قصور پہلے خریدار کا نہیں ہے وقت کسی کے ساتھ بے وفا نہیں ہے وقت کی قیمت ہمیشہ وقت پر ہی پڑتی ہے وقت کو کوئی دھوکا نہیں دیسکتا ہے البتہ وقت اکثر اوقات دھوکا دے جاتا ہے -

غافل ز فکر خویش دلا یکنفس مباش   چوں فکر روزگار ندانستۂ کہ چیست

سلطان احمد   (باقی آئندہ)

آئینۂ ہستی

پہلا رخ

(جسمیں یہ دکھلایا گیا ہے کہ موت لازمی ہے اور اس سے بچنا محال)

لا جلد بھر کے جام مے ناب ساقیا — مُردوں کو جو جلائے وہ دے آب ساقیا
دل کو نہیں ہے صبر کی اب تاب ساقیا — جاگ اُٹھوں جلد دور ہو یہ خواب ساقیا
دنیا کا رنگ دیکھ کے دل اپنا سرد ہے
آنسو بھرے ہیں آنکھوں میں پہلو میں درد ہے

یوسف لقا حسینوں کی چاہت فضول ہے — ان ظالموں سے مہر و محبت فضول ہے
دنیا میں جاہ و مال کی الفت فضول ہے — عزو وقار دولت و ثروت فضول ہے
کیا اعتبار دہر کا ناپائدار ہے
پیغام موت گردش لیل و نہار ہے

دن بھر ترقیوں پہ ہے کیا رونق جہاں — کس شان سے ہے مہر جہانتاب ضوفشاں
نور و ضیا سے طور کا ہر بام پر گماں — ملتا نہیں اندھیرے کا ڈھونڈھے سے بھی نشاں
لیکن لفافہ کھل گیا جب شام ہو گئی
لیلائے صبح شب کو سیہ فام ہو گئی

وہ بزم جسمیں عیش و مسرت کا ہے سماں — ہر سمت جسمیں نور کی روشن ہیں بتیاں
غنچہ ہے گلعذاروں کا ہیں جمع مہوشاں — محفل پہ صاف بزم سلیماں کا ہے گماں
دیکھو بوقت صبح تو ویران پاؤ گے

عشرت کدہ وہ سارا بیابان پاؤ گے

وہ باغ جس میں جوش پہ فصلِ بہار ہے
ہر سو کھلے ہیں پھول چمن لالہ زار ہے
نسرین و نسترن پہ غضب کا نکھار ہے
فرطِ خوشی سے محوِ ترنم ہزار ہے
کل دیکھنا فسردہ و پامال ہو گیا
جورِ خزاں سے باغ کا کیا حال ہو گیا

وہ گھر کہ جس میں آج ہے شادی کی دھوم دھام
خوشیاں منائی جاتی ہیں با جاہ و احتشام
کل دیکھنا کہ گور و کفن کا ہے اہتمام
ویران گھر پڑا ہے مکیں کا لحد مقام
نیرنگ جتنے دہر میں صبح و مسا کے ہیں
یہ سب نشان آمدِ پیکِ قضا کے ہیں

دنیا میں کوئی مثلِ سکندر ہوا تو کیا
قاروں سے بڑھ کے کوئی تونگر ہوا تو کیا
جمشید سا کسی کا مقدر ہوا تو کیا
جامِ جہاں نما جو میسر ہوا تو کیا
اک روز اس جہاں سے گذرنا ضرور ہے
پیدا ہوا ہے جو اُسے مرنا ضرور ہے

افسوس مومنو تمہیں اپنی نہیں خبر
ڈوبے ہوئے ہو عیش و مسرت میں سر بسر
خوفِ اجل ہے دل میں نہ اللہ کا ہے ڈر
ہرگز نہ چھوڑے گی تمہیں موت اپنے وقت پر
اولاد جاہ و مال نہ کچھ کام آئے گا
اپنا پرایا کوئی نہیں ساتھ جائے گا

ایسی بھی اک گھڑی کبھی آئے گی دیکھنا
مخلوق تم سے آنکھ چرائے گی دیکھنا
بیماری ساتھ موت کو لائے گی دیکھنا
جانِ عزیز بھی کبھی جائے گی دیکھنا
اُلٹا اثر دکھائے گا نسخہ طبیب کا
مٹتا نہیں مٹائے سے لکھا نصیب کا

وہ ماہران رمز شریعت کدھر گئے — شمع نبین بزم حقیقت کدھر گئے
وہ واقفانِ راہ طریقت کدھر گئے — تھی حق پسند جنکی طبیعت کدھر گئے

جو اپنے علم وفن میں عدیم المثال تھے
خاکِ لحد ہیں آج جو کل باکمال تھے

لقمان سا حکیم جہاں سے گذر گیا — سقراط سا فہیم وخردمند مرگیا
حکمت کا جام ناصر خسرو جو بھر گیا — حاتم بھی اپنا نام سخاوت میں کرگیا

عذرا رہی نہ وامق دیوانہ رہ گیا
شیریں وکوہکن کا بس افسانہ رہ گیا

کھلتے ہیں پھول باغ میں مرجھانے کیلئے — لاے کا ... داغ الم کھانے کے لیے
سرسبز نونہال ہیں کٹوانے کے لیے — باد خزاں ہے بوے فنا لانے کے لیے

باغ جہاں میں نام کو رنگ بقا نہیں
جس گل کو سونگھیے کہیں بوے وفا نہیں

سید محمد اسمعیل رسا ہمدانی گیاوی

رباعیات اکبر

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں — بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور وزر ہے بے کار — مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

گذرا ہے مری نظر سے سب کا جلوہ — سب سے بہتر ہے روز وشب کا جلوہ
کہتا ہے عجم عجم میں جسم ہے موجود — کہدو کہ عرب میں دیکھو رب کا جلوہ

درفشانی نے تری قطرہ کو دریا کردیا — دل کو روشن کردیا آنکھوں کو بینا کردیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بنگئے — کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا

"النظامیہ"

غالب اور آتش

غالباً اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت تو بہت ہی کم ہے کہ قسام ازل کے ہاں سے مقبولیت کا بیش بہا جو ہر ہر کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ اور جس کسی کو یہ بیش بہا خلعت پہنا دیا گیا ہے اُس کا بجبر چھین لینا بھی کسی کے قبضۂ قدرت میں نہیں ہے مندرجۂ بالا تمہید کے ختم کرنے کے بعد ہم اُس مضمون پر ایک منصفانہ نظر ڈالتے ہیں جو جناب یاس صاحب جانشین آتش مغفور نے مرزا غالب اور آتش مرحوم کی ایک غزل کا موازنہ کر کے گلدستۂ خیال ہاپوڑ میں ماہ نومبر کے نمبر میں شائع کرایا ہے۔ لکھنے کے لیے تو جناب یاس صاحب نے بھی یہی لکھا ہے کہ ہم منصفانہ پہلو کو مدنظر رکھینگے مگر جو دلائل آپ نے غالب کے اشعار کو پست ثابت کرنے کے لیے دیے ہیں وہ اُن لوگوں کے نزدیک جو غالب کے بجا طور پر طرفدار ہیں کچھ زیادہ وقیع نہیں ہیں۔ چونکہ آپ خود بھی جو کچھ لکھتے ہیں وہ حضرت آتش کے رنگ میں ڈوبا ہوا بتایا جاتا ہے۔ اس لیے ضرور ہے کہ اُن کی نظر میں دوسرا کوئی شاعر اسقدر وقیع نہوگا جیسے کہ حضرت آتش۔ مگر دنیائے شاعری جانتی ہے کہ غالب غالب ہیں اور آتش آتش۔ یوں تو کہنے کے لیے شاید کسی کو آتش صاحب مرحوم کی استادی میں بھی شک نہوگا۔ مگر غالب کے مقابلہ پر اُن کے اشعار لانا کسی سنجیدہ شاعر سے زیادہ قابلیت رکھنے والے کا کام ہے۔ اول تو دونوں کے رنگ تغزل میں زمین و آسمان کا فرق۔ غالب معانی آفرینی نازک خیالی کے دلدادہ۔ اردو کو یہ کہکر ٹالنے والے کہ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست۔ آتش صاحب

صفائی زبان کے سوا ئے مضمون آفرینی سے بیزار۔ یا مجبور۔ پھر ان دونوں کا توازن طبع کیا۔ اور اگر موازنہ کیا بھی جائے تو وہی نتیجہ نکلے گا "چہ نسبت خاک را باعالم پاک" چنانچہ اسی بنا پر ہم غالب اور آتش کی اُسی غزل کا جو جناب یاس صاحب اپنے قلم انصاف رقم سے لکھ چکے ہیں موازنہ کرتے ہیں۔ انصاف صرف ناظرین پر ہے ہم اپنے مضمون میں یاس صاحب کی وہ کمزوریاں بھی پبلک کو دکھائیں گے جو انھوں نے ایک مسلم الثبوت اُستاد پر چوٹیں کر کے ثابت کی ہیں۔ اول تو مرزا غالب کا زیادہ تر طبعی میلان فارسی گوئی کی طرف تھا۔ اور اُردو کی محاورہ بندی اور صفائی زبان کو ہیچ سمجھ کر انھوں نے ذوق کے جواب میں یہ کہہ دیا تھا کہ ع

انچہ اندر شعر فخر تست آن ننگ من ست

مگر کسی حکیم کا مقولہ ہے کہ ع ہر یکے را بہر کارے ساختند۔ ہر کارے و ہر مردے۔ چونکہ مرزا دنیا میں صرف اسی شاعری کے لیے خلق ہوئے تھے اسواسطے جب اُنھوں نے احباب کے سمجھانے بجھانے۔ یا ضرورت زمانہ کی وجہ سے خود ہی اردو کی طرف توجہ کی تو اُسمیں بھی وہ وہ رنگ برنگ کے خوشنما پھول کھلائے۔ جنکا جواب اُردو کی شاعری کے باغ میں مشکل سے ملتا ہے بلکہ نہیں ملتا۔ میر جیسے باکمال کا دیوان بھی بعض اوقات اُن کے جوابوں سے قریب قریب خالی نظر آتا ہے۔ اور اُستاد آتش جیسے تو خدا جانے کتنے شاعروں کے دیوانوں کو توان کا جواب دیکھنے کے لیے اُٹھانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ یاس صاحب غالب کی مقبولیت کو بے معنی بتاتے ہیں اور ان کی تقلید کو صرف حُسن عقیدت یا جہل مرکب خیال فرماتے ہیں مگر ہمیں آج دنیا میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ دنیا نے کسی شخص میں بغیر کسی خاص کمال کے

یا اُسکے آگے ماننا۔ اور اُسکے قول و فعل کو معتبر سمجھا ہو۔ یاس صاحب مرزا کی زبان دیکھ اردو کی زبان کہیں اسکا بجز اسکے اور کوئی جواب نہیں ہو سکتا کہ وہ فارسی کی بڑی اُردو کے لطف سے نا آشنا ہیں ورنہ کم سے کم وہ غالب کے اشعار میں فارسی کے لفظ دیکھکر بلا تکلف یہ نہ فرما دیتے جو کچھ جوش نا انصافی میں فرما گئے ہیں۔ غالب کی اُستادی اُسکی ہمہ دانی کا ثبوت دنیا میں اس سے زیادہ ملنا محال ہے کہ خود جناب یاس نے بھی مجبوری سے یہ کلمہ کہدیا ہے کہ میں اُنکے اچھے شعر کا عاشق ہوں اس سے اتنا تو ضرور پتا چلگیا کہ غالب کے ہاں اچھے شعر بھی ضرور ہیں رہے انکے قابل اعتراض شعر جن پر یاس صاحب معترض ہیں اُنہیں ہم لکھتے ہیں اور ان کی خوبیوں سے معترض صاحب کو آگاہ کرتے ہیں جاننے والے مشتے نمونہ از خروارے کے موافق سمجھ لیں گے کہ غالب کا وہ کلام جو بعض احباب کی سمجھ میں نہ آئے وہ بے معنی نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اُنکی ہی سمجھ کا قصور ہے وھو ھذا

(آتش)

پامال کیجیے اُنھیں رفتار ناز کا
طاؤس و کبک رکھتے ہیں دعوی نیاز کا

صاف صاف شعر ہے مگر جناب یاس جو اسے مُلّا صائب کے شعر کے مصداق پر تصوف کے حدود میں لیجاتے ہیں وہ سوائے الہام کے اور کیا کہا جائے۔ ہماری نظروں میں تو یہی پُرانی شاعروں کی شاعری ہے گل و بلبل کے افسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا رہی یہ بات کہ شاعرانہ نقطۂ خیال سے اگر اسکو دیکھا جائے تو بڑے پلّہ کا شعر ہے اسکا یہی جواب ہے ؎

کسانے کہ یزداں پرستی کنند
بر آواز دولاب مستی کنند

ع ہوا سے ہلتے نہیں ہیں جتنے درخت ہاتھوں کو مل رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ لہذا

اوقات دیکھا گیا ہے کہ اکثر اہل دل ذرا ذرا سی بات پر بے خود اور مدہوش ہو گئے ہیں۔ چنانچہ سُنا ہے ایک مالن سوے اور چوکے کا ساگ بیچ رہی تھی کسی نے دریافت کیا کہ سویا کس نرخ سے دیا ہے اور چوکا کس نرخ سے اُس نے سیدھا سا جواب دیا کہ۔ سویا۔ سو چوکا۔ ایک عارف کامل سُن کر مدہوش و بیخود ہو گئے۔ اس نظر سے دیکھیں تو ہمیں کسی بڑے سے بڑے شاعر کے دیوان میں بھی کوئی ایسا شعر نہ ملیگا جو حقیقی اور مجازی پہلو نہ لیے ہو۔ پھر اگر آتش جیسے شاعر کے کلام میں ایسا ہے تو کیا کمال ہے۔ نہیں بلکہ یہ سب کچھ سُننے والے کے خیالات پر منحصر ہے اتنا الٰہی اخواہے صرف سامع کے دل کا اندازہ ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ رہی شاعری وہ وہی ہے جسمیں جو جھلک دکھائی گئی ہو وہ صاف نظر آئے چنانچہ مرزا غالب کا مطلع ملاحظہ ہو۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہاے راز کا
(غالب)
یہاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اسمیں تصوف کا جو رنگ ادا کیا ہے ممکن نہیں کہ شاعر کی اُسپر نظر نہ پہنچے۔ اور (نحن اقرب الیہ من حبل الورید) کا نقشہ آنکھوں کے سامنے نہ کھنچ جاے۔ بخلاف آتش کے شعر کے کہ کوئی غیب دان اُڑ لے تو عرش اعلےٰ تک اسکا مضمون پہنچ جاے۔ ورنہ اگر خواہ مخواہ اُسکے اندر تصوف ٹھونسا جائے تو وہی۔ المعنی فی بطن الشاعر کی مصداق بن کر رہ جاے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کے اس مطلع کا غالب کی زبان سے بھی نکل جانا تعجب کی نظر سے دیکھنے کے قابل ہے۔

کیونکر وہ نازنیں نہ کرے بے نیازیاں
(آتش)
اغیار سے بھی حوصلہ عالی ہے ناز کا

میرے خیال میں بے نیازی کو ناز کہنا غلط سے کم نہیں اور اس طریقہ سے اگر شعر کو

دیکھا جاے تو آتش صاحب دھوکہ کھا گئے ہیں۔ اسکے صرف یہ معنی ہوسکتے ہیں کہ وہ نازنین عشاق کی خبرگیری وغیرہ سے بے نیاز ہے۔ اور یہی بے نیازی اُس کا ناز ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ بے نیازی کو ناز نہیں کہتے۔ اُسے تغافل یا استغنا کے سواے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ حالانکہ یاس صاحب نے اسکے معنی دوسرے لکھے ہیں۔ مگر جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ وہ بھی فرما رہے ہیں کہ۔ وہ بے نیاز ہے اُسے کوئی پروا نہیں۔ اور کہیں کہتے ہیں کہ وہ ہمہ تن ناز ہے۔ خیال کا بوجھ اُٹھا کر دیکھیے یاس صاحب نے اگرچہ اہل دلّی کے سبب سے۔ اسے بھی تصوف کا خلعت پہنایا ہے۔ مگر ٹھوکریں خوب خوب کھائی ہیں۔ رہا یہ امر کہ وہ فرماتے ہیں اسمیں صفائی بیان و زبان ہے۔ میرے خیال میں یاس صاحب نے ان کے دوسرے ہمعصروں کے دیوان نہ دیکھے ہوں گے ورنہ اس معمولی شعر۔ یا مصرعہ کو ایسا نایاب نہ بتاتے

رنگ شگفتہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گلہاے ناز کا
(غالب)

یہ وہ شعر ہے جس پر یاس صاحب نے یہ راے قائم کی ہے کہ یہ شعر وہی شاعر کہہ سکتا ہے جو اُستاد ہو۔ ہر شخص نہیں کہہ سکتا۔ یہ وہ شعر ہے جس سے یاس صاحب جیسے عالی خیالوں کے دماغ کو تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ مگر افسوس کہ سعدی علیہ الرحمہ کا مقولہ بھی اسکے ساتھ ہی ساتھ شاید اُن کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ سہ

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اسمیں شک نہیں کہ مرزا غالب نے اسمیں استعارات اور تشبیہیں بدیع استعمال کی ہیں مگر سواے خاص خاص دماغوں کے ہر شخص اُنکو سمجھ سکتا ہے مرنا کے سیدھے ویسا ہی شعر باعث فخر ہے کیونکہ ان کی شاعری کا بہترین لعد غالب رنگ یہی ہے

جسکے خود یاس صاحب بھی قائل ہیں۔ رہی یہ بات کہ یاس صاحب کے نزدیک اسکے
احتمال کی دلیل یہ ہے کہ ہر کسی نے نئے نئے معنی پیدا کیے ہیں۔ ہماری سمجھ میں
نہیں آتا کہ آپ نے کون سے دس پانچ معانی دیکھے کیونکہ خود جناب یاس حسرت
کی شرح کو جو انھوں نے شرح نہیں کی ہے بلکہ ایک ادنیٰ ملابست کی وجہ سے اسے
دوسرے شعر کا مماثل ٹھہرایا ہے۔ غلط بتا چکے۔ رہی طبا طبائی صاحب کی شرح
اسکی نسبت آپنے کوئی بُری رائے قائم نہیں کی ہے۔ تیسرے بذات خود آپنے
کوئی معنی نہیں بیان کیے۔ پھر کیونکر کہدیا کہ شعر مہمل ہے اور اسمیں اکثر معانی
پیدا ہوتے ہیں۔ حضرت یاس نظرِ انصاف سے ملاحظہ فرمائیں گے تو انھیں نظم
صاحب کی شرح میں ہی نقص نظر آئے گا۔ اگرچہ انھوں نے اپنی حد کے موافق
اسکی شرح خوب کی ہے مگر پورا مفہوم نہیں سمجھا سکے ہیں اس سے لوگوں کی
نارسائی ذہن کی شکایت ہوسکتی ہے نہ کہ غالب کی شاعری کی۔

رہی یہ بات کہ یاس صاحب نے بھی فرمایا ہے اور خود نظم صاحب نے اپنی
شرح میں اکثر جگہ لکھا ہے کہ جس میں چند معانی پیدا ہوں وہ شعر کچھ شعر نہیں ہے
غالباً قرآن شریف کو ان دونوں صاحبوں نے ملاحظہ فرمایا ہوگا اور اگر پڑھے
نہونگے تو پڑھے لکھوں سے یہ ضرور سُنا ہوگا کہ اسکی مختلف تفاسیر ہیں اور ہر فرقہ اپنے
اپنے خیال کو صحیح جانتا ہے۔ اور پھر بھی حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن
اللہ تعالےٰ علما اور مفسرین کی جماعت سے فرمائے گا کہ میرے کلام کو اسکے سمجھنے
کے موافق کسی نے نہیں سمجھا۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ کلام غالب
معاذ اللہ کلام اللہ کا مماثل اور مقابل ہے۔ بلکہ میرا منشا یہ ہے کہ چند معانی
کی صورت میں ایک شعر میں نظر آنی حُسن شعر ہیں نہ کہ عیب۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ
اسمیں ایک مرجح پہلو کی ضرورت ہے مگر ساتھ ہی یہ کہ اگر اور محاسن پیدا ہوں تو

کچھ بُرائی نہیں ہے۔

درصل غالب نے اسمیں وہ نازک خیالی دکھائی ہے جوان کے حریفوں کو حسد کی آگ سے جھلسنے والی ہے اسمیں مرزا نے ایک محاورہ کا مفہوم پیدا کیا ہے جو نہایت ہی لطیف ہے۔ اور صاحب فہم اسکو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے ملقاہ معشوق نے میرا رنگ اڑایا۔ وہ رنگ پریدہ مثل صبح بہار کے ہے۔ رنگ شکستہ اگرچہ صرف صبح سے تشبیہ پا سکتا ہے مگر صبح بہار سے اُسکو اسلیے مشابہ کیا ہے کہ گلہائے ناز شگفتہ ہوں گے۔ صبح بہار میں پھولوں کا کھلنا۔ اور پھولوں کے کھلنے سے صبح بہار پیدا ہونا لازم و ملزوم ہیں۔ اور اس جگہ مرجع پہلو پھولوں کے کھلنے سے صبح بہار کا پیدا ہونا ہے۔ نہ کہ برعکس اور اس وقت جو پھول کھلنے والے ہیں وہ ناز کے پھول ہیں۔ یعنی میرا رنگ اُڑتا دیکھکر اب تا رہ گل ناز کھلیں گے۔ کبھی وہ مجھپر ستم کریگا۔ کبھی اُسے اپنے حُسن پر ناز ہوگا۔ کبھی وہ ناز پر مغرور ہوگا۔ کہ میرے دیکھنے سے صبح پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ ناز کرے گا اور گل دیگر شگفت کا مضمون یہ ہوگا کہ مجھکو کوئی دیوانہ خیال کرے گا۔ کوئی کچھ کوئی کچھ

اتنی معنوی خوبیوں کا اس ذرا سے شعر میں ادا کر دینا اعجاز شاعری نہ کہا جائے تو اور کیا ہو سکتا ہے یاس صاحب نے ساری باتوں سے چشم پوشی کرکے صرف شکل استعارات پر نظر ڈالی۔ اور ایک معمولی درجہ سے بھی گرا ہوا شعر اسکے مقابلہ میں لکھکر غالب کو شاعری کے درجہ سے بھی گرا دیا یہ اگر اُن کی نا انصافی نہیں تو اور کیا ہے۔ زمانہ جانتا ہے کہ غالب کے یہاں صرف لفظوں کی شاعری ہے کم سے کم اگر اُنکا لفظ نکال کر بجائے اُسکے ویسا ہی لفظ نہ رکھدیں جو خود غالب ہی رکھ سکتے ہیں تو اُسکے شعر میں وہ بات نہ رہے گی جو غالب کے لیے شایاں ہے کہاں یہ آتش کا شعر۔ اور کہاں یہ بحر معانی۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

غالب کے شعر میں ایک اور بھی نازک معنی پیدا ہوتے ہیں وہ یہ کہ بہار نظارہ کے اثر سے بیمار رنگ فق ہوکر مثل صبح کے ہوگیا ۔لہذا اگلھا ئے نازک کے کھلنے کا موقع ہے۔ یعنے اب تو جسقدر ناز کرے بجا ہے کہ تیرے اندر یہ صفت موجود ہے

آتش

عمر خضر سے اسکی زیادہ ہو زندگی
دھوون پیے جو یار کی زلف دراز کا

اول تو اس شعر میں خضر کی ض متحرک ہے یہ بڑی حد تک غلط ہے دوسرے اگر کہیں نہ کہیں سے تلاش کرکے دکھا یا بھی جائے کہ خضر متحرک صحیح ہے تو اس شعر میں سوائے اسکے اور خوبی نظر نہیں آتی کہ چونکہ اس کی زلف دراز ہے اس لیے اسکے دھوون کا بھی یہ اثر ہے کہ آدمی کی عمر زیادہ ہو جائے باقی نہ اسمیں تصوف ہے نہ تلمیح ہے نہ ایہام ہے ۔یاس صاحب نے بلاوجہ اسے ایک رسم کی طرف منسوب کردیا ہے حالانکہ اس میں اشارۃً بھی کہیں اسکا ذکر نہیں رہا دھوون کا لفظ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب یاس کی آنکھ میں یہی کانٹا بن کر کھٹکا ہے مگر چونکہ خوش عقیدگی کا حلقہ زیب گلو تھا اسلیے اسکو بھی عمدہ اور بے مثل کہتے بنی ہے اور سوا سے اپنے ایک زمانہ کو مردہ دل قرار دیا ہے ۔اور اسے بھی زبان و مضمون کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے اور اسکے مقابلہ میں غالب کے شعر کو بے حقیقت ٹھہرایا ہے ۔ مگر انصاف ناظرین پر ہے۔

غالب

تو اور سوے غیر نظر ہاے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہاے دراز کا

اسے نا انصافی ایسے شعر کو جسمیں کمال عشق اور جوش رقابت نازو انداز حسرت ارمان کی تصویریں کھینچدی گئی ہیں اُسے تیرا ہی کام تھا کہ بینی اور معمولی کہلا کر

آتش

ظاہر ہے گرم جوشی پروانہ کا اثر
روشن ہے حال شمع کے سوز و گداز کا

شعر کے اچھے ہونے میں کلام نہیں۔ مگر یہ مضمون اتنا پامال ہے کہ ہر شاعر کے دیوان میں دس بیس شعر ایسے ہی مضامین کے ضرور مل جائیں گے۔

غالب

صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفس جانگداز کا

عموماً شعرا آج تک یہی مضمون لکھتے آئے ہیں کہ آہ کے ضبط کرنے سے دل پھک گیا اور چپکے چپکے جل گیا۔ یہ ہوا اور وہ ہوا مگر مرزا نے مضمون کو علے الرغم ادا کیا ہے کہ ضبط آہ سے میرا فائدہ ہے اگر ایسا نہو تو ایک ہی نفس میں کام تمام ہو جائے کیونکہ سوز عشق سے میرا ہر نفس جانگداز ہے۔ صرفہ فائدہ کے معنی میں مرزا نے دوسری جگہ بھی استعمال کیا ہے ۔

بے صرفہ ہی گذرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر   حضرت بھی کل کہینگے کہ ہم کیا کیا کیے

غالب

ہیں بسکہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

حسرت صاحب نے اس شعر کی خوب شرح لکھی ہے۔ فی الواقعی شیشہ بازی ایک فن ہے جو ابتک بھی رائج ہے عموماً نٹ بھی ایک اسی قسم کا تماشا کرتے ہیں کہ سر پر پانی کا کوئی برتن بھر کر رکھ لیتے ہیں۔ اور بانس وغیرہ پر چڑھکر اچھلتے کودتے ہیں رقاصی کا بھی ایک فن ہے جو ابتک مشہور کتھک کرتے ہیں۔ اس شعر میں سوائے تعقید کے جو مرزا کے لیے باعث ننگ نہیں اور کوئی نقص نہیں ہے۔ اسمیں ایک خاص سین دکھایا گیا ہے۔

غالب   کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز   ناخن پہ قرض اس گرہ نیمباز کا

معنی صاف ہیں حسرت اور نظم صاحب دونوں کی شرح صحیح ہے۔ مگر یاس صاحب کا اعتراض غلط ہے دل کو گرہ نیم باز سے تشبیہ دینا اور پھر اُسکا ناخن پر تقاضا کرنا۔ نہایت لطیف مضمون ہے اگر یہاں ناخن غم ہوتا تو شعر تو بے معنی صفر ہو جاتا۔ یاس صاحب نے یہ خیال نہ فرمایا کہ اگر گرہ نیم باز کا تقاضا ناخن غم پر ہوتا تو بے فائدہ تھا کیونکہ ناخن غم اگر اُسے کھولتا تو کھل نہ سکتا تھا۔ وہ تو خود گرفتگی کی وجہ سے گرہ ہوا ہے پھر گرفتگی میں اور بھی گرفتگی پیدا ہوتی تو نیم باز بھی نہ رہتا بلکہ اس جگہ لفظ ناخن ہی بہت مناسب ہے جس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ غموں کی گرفتگی کی وجہ سے میرا دل گرہ ہو گیا۔ اب میں اُسے ایک مدت سے اپنے ناخن سے کھولنا چاہتا ہوں مگر ایسی گرہ ہے کہ اب تک وہ نیم باز ہے مگر دل میرا ہر اپنا تقاضا ناخن پر کر رہا ہے کہ اسے بالکل کھولدے۔ جب ناخن کی کاوش سے دل کی گرہ باز ہو جائے گی یعنی پورا پورا زخم ہو جائے گا تب مجھے چین آئے گا اسی مضمون کو ایک جگہ اور پہلو کے ساتھ ادا کر گئے ہیں دیکھیے۔

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراق

غالب

تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

مطلب ہذا جب دل بالکل کھل جائے گا یعنی وہ گرہ کی صورت نہ رہے گا تو دل مٹ جائے گا۔ اور دل کے مٹتے ہی تمام غم مٹ جائیں گے۔

اس شعر کی مجادلی میں یاس صاحب نے غالب کو بُرا کہنے میں کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے اور باتوں کے سوا ایک جگہ یہ بھی انتقام فرمایا ہے کہ جب غالب لکھنؤ آئے تو یہاں کے لوگوں نے خوب خوب مذاق اُڑایا۔ معاذ اللہ غالب کے اس شعر کی شرح فرماتے ہوئے ؎

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

نظم صاحب فرماتے ہیں کہ غالب خدا جانے کب لکھنؤ آئے اُن کا آنا کسی کو معلوم نہیں ہوا۔ اور یہ لیا تعجب ہے۔ خدا جانے یاس صاحب نے کس تاریخ سے یہ قصہ اخذ کیا ہے اچھا ہوتا اگر حوالہ دیتے۔ میرے خیال میں نظم صاحب کو یاس صاحب سے کسی طرح کم معلومات نہیں ہے اگر کچھ قصہ ہوتا تو وہ مہذبانہ الفاظ میں اُسکا اشارہ ضرور کر دیتے۔ غالب صاحب کا لکھنؤ آنا تو اُن کے شعر سے ضرور ثابت ہے مگر کسی سے ملنا ثابت نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ لکھنؤ آتے تو ناسخ وغیرہ وغیرہ اُن کے اکثر احباب موجود تھے شاید وہ اگر غالب بے معنی اشعار بھی سُناتے تو ایسی ہجو نہ کرتے۔ کیونکہ وہ زمانہ تو اور تھا۔ محبت اور صداقت دلوں میں بھری ہوی تھی آج بھی کسی مشہور شاعر کے بے معنی کلام کو سنکر واہ واہ کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاتا۔ تیسرے یہ کہ غالب خود وضعدار آدمی تھے وہ ایسے مسخرے جلسوں میں اپنے شعر کیونکر سنا سکتے تھے۔ آزاد مرحوم نے آبحیات میں اُنکی وضعداری کی دو ایک مثالیں لکھی ہیں اُردوے معلّٰی میں اُن کی وضعداری کا رقعات سے پتہ چلتا ہے خود اُنکی وضع کی پابندی کا اُنکی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے ایک جگہ فرماتے ہیں

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال
کہ یوں کہے کہ سر رہگذر ہے کیا کہیے

اس سے اُنکے حالات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شرفاے دہلی کے چلن کے موافق اُن کے نزدیک بھی بازار میں باتیں کرنا بُرا اور معیوب تھا۔ خدا جانے یاس صاحب نے کہاں سے یہ اتہام لگایا ہے۔ بالفرض اگر یہ صحیح بھی ہے تو کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے کیونکہ لکھنؤ اور دہلی میں ہمیشہ سے شاعرانہ نفاق ہے غالب کو

تنہا پاکر اگر ایسا کیا گیا ہو تو کیا بعید ہے۔

تاراج کاوش غم ہجراں ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا
غالب

اس پر کچھ لکھنا بے سود ہے خود حضرت یاس اسکے مداح ہیں۔

میں آتش کے اُن اشعار کا نقل کرنا فضول سمجھکر چھوڑتا ہوں جو یاس صاحب نے لکھے ہیں۔کیونکہ مجھے آتش صاحب سے دشمنی نہیں کہ خواہ مخواہ انکے شعار کا خاکہ اڑاؤں۔میں انھیں شاعر جانتا ہوں مگر حافظ اور سعدی اور خسرو اور غالب کا مقابل نہیں گردانتا۔ پہلے شاعری کا جیسا دور تھا اُسمیں آتش بھی اچھے کہنے والوں میں تھے اب یاس صاحب جو کچھ چاہیں ٹھہرائیں۔میں نے غالب کے شعروں کی حقیقت اپنی بساط کے موافق ضرور دکھا دی ہے اس پر غالب کے تمام دیوان کو قیاس فرمالیجیے۔

البتہ میرا یہ جی چاہتا ہے کہ غالب کے چند اشعار کا آتش سے مقابلہ کروں اور اُن کے مضامین کا موازنہ کروں اور یہ فرق دکھاؤں کہ جہاں دونوں اُستادوں نے کسی ایک مضمون کو ادا کیا ہے اُسمیں کیا فرق ہے۔ جسے کسی آئندہ اشاعت میں ہدیۂ ناظرین کروں گا۔

محمد ابراہیم منور دہلوی

بیگم

افسوس ہے کہ اسوقت تک رسالۂ بیگم کے خریداروں کی کافی درخواستیں نہیں آئیں۔ اسلیے میں اسکو اس ماہ سے شائع کرنے سے قاصر رہی جسوقت خریداروں کی کافی تعداد ہوگی اُس وقت رسالہ شائع کیا جاے گا۔

ح۔ج۔قاری بیگم

عباسی خلفاء کا علمی شغف

اسلامی سلطنتوں میں مختلف علوم وفنون کی اشاعت کے لحاظ سے عباسی اور اموی دو سلطنتیں نہایت ممتاز شمار کی جاتی ہیں، لیکن عباسی سلطنت کا ابتدائی زمانہ اس حیثیت سے اور بھی ممتاز تھا کہ حکومت کی عنان ایسے سلاطین کے ہاتھ رہی جو خود صاحب فضل وکمال ہونے کے علاوہ نہایت علم دوست، علوم کے بہت زیادہ مروج، ارباب تالیف وتصنیف کے بیحد قدردان اور کاملین فن کے دل سے طلبگار رہتے اُن کے ان اوصاف نے ہر قوم وملت کے اہل کمال کا نہایت جوش سے خیر مقدم کیا، اور ملک کے چاروں طرف سے مشاہیر علماء وفضلا اور بڑے بڑے ماہرین فن کو سمیٹ کر دار السلطنت بغداد میں جمع کردیا، جسکی بدولت بغداد تمام علوم ومعارف کا مرکز بن گیا اور وہیں یونان وفارس اور روم وہندوستان کے مردہ علوم میں از سر نو روح پھونکی گئی اور نقلی علوم کے ساتھ ساتھ عقلی علوم نے دوبارہ نشو ونما پائی۔

ان خلفاء کا علمی شغف اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ رنج ومصیبت کے وقتوں میں بھی علمی تذکروں سے ہی اپنی طبیعتیں بہلایا کرتے تھے، منصور کی بابت یہ واقعہ مذکور ہے کہ جب اسکے لخت جگر جعفر کا انتقال ہوا اور وہ اسکی تجہیز و تکفین سے فراغت پاکر اپنے قصر شاہی میں داخل ہوا اسوقت اس نے اپنے وزیر ربیع کو حکم دیا "جاؤ ہمارے خاندان میں کوئی ایسا شخص ہو تو بلا لاؤ جو کچھ اشعار سناکر میرے غمزدہ دل کو تسکین دے"۔ ربیع نے بنی ہاشم میں ہر جگہ تلاش کیا مگر اسوقت کوئی بھی ایسا نہیں ملا جو اپنے شعر وسخن سے بادشاہ کا غم غلط

کر سکے اسوقت منصور نے نہایت افسوس کے ساتھ کہا "خدا کی قسم اپنے بیٹے کی وفات کے رنج سے یہ رنج بہت بڑا ہے کہ ہمارے خاندان میں ایسا شخص نہ ہو جو فن ادب سے دلچسپی نہ لینے کے سبب کچھ بھی اشعار محفوظ نہ رکھتا ہو"

خلفاء عباسیہ کی علم دوستی نے عام لوگوں کے دلوں میں بھی عجیب و غریب علمی تحریک پیدا کر دی تھی گوشہ گوشہ سے علمی تذکروں کی گونج سنائی دیتی قدم قدم پر علمی مذاکرہ کے لیے مجلسیں قائم ہوا کرتیں، خاص شاہی دربار میں شعراء، فلسفی، مناظر، متکلم غرض سبھی قسم کے اصحاب علم و فن حاضر ہوا کرتے مشاعرے اور مذاکرے کی مجلسیں منعقد ہوتیں جن میں ہر شخص اپنی اپنی قابلیت کے جوہر دکھلاتا اور دادِ سخن کے علاوہ گرانقدر انعام اور صلوں سے اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی"

ایک دفعہ شاہی دربار سجا ہوا تھا بڑے بڑے شعراء وہاں حاضر تھے ہارون رشید نے اُن سے کہا جو شخص فی البدیہہ اس مصرع پر مصرعہ لگائے وہ جو مانگے دیا جائیگا مصرعہ یہ تھا " اَلْمُلْكُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ " جماز نے فوراً دوسرا مصرعہ اور ایک شعر اور پڑھکر سُنایا۔

اَلْمُلْكُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ   وَلِلْخَلِيْفَةِ بَعْدَهٗ

وَلِلْمُحِبِّ اِذَا مَا   حَبِيْبُهٗ بَاتَ عِنْدَهٗ

یعنے ملک خدا کا ہے اور اُسکے بعد خلیفہ کا اور پھر اس عاشق کا جسکے پہلو میں اُسکا محبوب شب گذار رہے، ہارون رشید فی البدیہہ یہ جواب سُن کر بہت خوش ہوا اور حوصلہ افزائی کے لیے صلے میں دس ہزار درہم اُسکو دیے،

ایک مرتبہ ہارون رشید نے حاضرین دربار سے پوچھا کہ "کیا تم میں سے کسی کو اسکا پہلا مصرعہ یاد ہے، ومن یسال الصعلوك این مذاهب اوسه

کس کا شعر ہے" لیکن کسی کو پہلا مصرعہ معلوم نہیں تھا سب چپ رہے، اصمعی ان دنوں سخت بیمار تھا اس لیے دربار میں نہ آسکا بادشاہ نے اسحٰق موصلی کو جواب دریافت کرنے کے لیے ایک ہزار دینار دے کر اسکے پاس روانہ کیا اصمعی نے جواب میں لکھ بھیجا کہ یہ شعر نشناس نہشلی کا ہے اور پہلا مصرع یہ ہے"

وسائلۃ بالغیب عنی وسائل

ومن یسال الصعلوک این مذاھب

رشید نے فضل کو ایک انگوٹھی جسکی قیمت ۱۲۰۰ دینار تھی اس صلے میں عطا کی کہ اس نے کسی عرب کے نہایت بہتر شعر کو جو بھیڑیے کے متعلق تھا پڑھکر سنایا" ان واقعات سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ صرف ایک ایک بیت اور مصرعہ کے عوض شعرا کی کسقدر حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔"

خلفاء عباسیہ کی علم دوستی کی حد تو یہاں تک پہنچی کہ ایک خلیفہ نے شہنشاہ مشرق سے محض اس غرض سے اعلان جنگ کیا کہ وہ ایک مشہور مہندس کو بغداد میں درس دینے کے لیے بھیجنے پر مجبور ہو جائے،

لیکن ان سب خلفاء میں مامون کا نام علمی دنیا میں بہت زیادہ روشن ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس نے علم کی خدمت جسقدر انجام دی ہے تمام متمدن قومیں اسکے علمی احسانات کی زیر بار ہیں اگر اسکی سخت سے سخت کد و کاوش اور بے انتہا کوششوں کی بدولت یونان اور روما کے مقفل خزانوں کی کتابیں حاصل کرکے ترجمہ نہ کرائی جاتیں تو آج ان علوم و معارف کا صفحۂ ہستی پر پتہ نہیں لگتا۔ مامون کے علمی ذوق کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کی آستینوں پر اقلیدس کے مقالہ اولی کی شکل پنجم کا طغرا بنا ہوا تھا کیونکہ یہ شکل اسکو نہایت مرغوب تھی اسی وجہ سے عربی میں پانچویں شکل کو شکل مامون کہتے ہیں

مامون نے شاہ یونان کو خط لکھا کہ حکیم لیو کو اجازت دی جاے کہ مجھکو یہاں آکر فلسفہ پڑھا جائے جسکے عوض میں صلح دائمی کا وعدہ اور پانچ من سونا دینا منظور کرتا ہوں۔

یہ واقعہ مامون کی نہایت علم دوستی اور بلند حوصلگی کا پتہ دیتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آج بڑی سی بڑی متمدن اور علم دوست سلطنت نے بھی ایسی مثال نہیں پیش کی ہے کہ ایک ماہر فن کے طلب کرنے کے لیے دوسری سلطنت سے صلح دائمی کا وعدہ کیا ہو'

ہندوستان کے ایک راجہ نے اپنی ریاست کے مشہور حکیم دوبان کو مامون کی خدمت میں بھیجا اور خط میں لکھا کہ جو ہدیہ آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں دنیا میں اس سے بڑھ کر مفید اور نامور اور معزز تحفہ نہیں ہو سکتا،

اسی اولوالعزم خلیفہ کی بابت مشہور ہے کہ وہ ہر کتاب کے ترجمہ کے عوض کتاب کے برابر تول کر سونا دیا کرتا تھا' اس کا قول تھا کہ "علما خدا کے اُن خاص بندوں میں ہیں جنھیں اس نے انسان کے فہم وادراک کو کامل کرنے کے لیے انتخاب کیا ہے یہ لوگ دنیا کی مشعلیں اور رہبر نوع انسانی ہیں اگر یہ نہوں تو دنیا پھر اپنی اصلی وحشی حالت پر آجائے"

احمد اللہ متعلم ندوہ

پرانے نمبر

بعض حضرات ہم سے پرانے نمبر طلب کرتے ہیں۔ ہمارے پاس پرانے نمبر نہیں ہیں وہ اگر مل سکتے ہیں تو "تمدن" کے سابق دفتر دہلی سے مل سکتے ہیں۔

منیجر

حسد

مندرجہ ذیل مضمون لارڈ فرانسس بیکن کے قابل دماغ کا نتیجہ ہے جو کہ میں ناظرین "تمدّن" کے لیے اُردو میں ترجمہ کرکے پیش کرتا ہوں، لارڈ بیکن انگلستان کے اُن چند اہل قلم میں سے ہیں جنکے نام انگلیوں پر شمار کیے جا سکتے ہیں میں لارڈ بیکن کے چند پر لطف مضامین ہدیۂ ناظرین کرنے کے بعد اُنکے مختصر مگر نصیحت خیز سوانح واقفیت عام کے لیے "تمدّن" کی وساطت سے ملک میں پیش کرونگا ع

گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

نصیر

کوئی جذبہ، انسان کو گرویدہ کرنے اور اُسپر جادو چلانے میں ایسا با اثر نہیں ہے جتنا کہ عشق اور حسد، ان دونوں میں زبردست خواہشیں بھی مضمر ہیں اسی وجہ سے یہ انسانی دماغ اور تخیلات میں نہایت سرعت کے ساتھ جگہ پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اسی بنا پر یہ جذبات بہت جلد آنکھوں میں اپنا گھر کر لیتے ہیں، خصوصاً اس وقت جبکہ کوئی لطیف شے سامنے موجود ہو جاتی ہے اور اگر دنیا میں دل آویزی کوئی شے ہے تو یہ نکتے اس میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔

انجیل میں حسد کو بُری آنکھ سے تعبیر کیا ہے، اور نجومی بھی ستاروں کی نحوست کو بُرے منظر سے تشبیہ دیتے ہیں، چنانچہ حسد کرنے کے وقت انسان کی آنکھ میں اک قسم کی تڑپ اور چمک محسوس ہوتی ہے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ حاسد کی آنکھ کی تڑپ اور چنچل پن اس وقت زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے جبکہ محسود شان اور شوکت، عزت اور جلال کے زیور سے آراستہ نظر آتا ہے، کیونکہ ایسا خوشنما منظر

تلوار حسد کے لیے سان کا حکم رکھتا ہے۔ ماسوا اسکے ایسے موقعوں پر محسود کی روح گویا پردۂ غیب سے باہر نکل پڑتی ہے، اور حسد سے اک جھڑپ سی ہو جاتی ہے۔

گو یہ حیرت خیز باتیں اپنے مقام پر خاص وقعت رکھتی ہیں، لیکن میں یہاں انکو نظرانداز کر کے اس مضمون پر روشنی ڈالوں گا کہ کس قسم کے اشخاص حاسد ہوتے ہیں کس قسم کے اشخاص محسود ہوتے ہیں اور ملکی اور خانگی حسد میں کیا فرق ہے۔

جس شخص کی طبیعت اور طینت میں اتقا اور نیکیاں موجود نہیں وہ ہمیشہ دوسروں کے اتقا اور نیکیوں سے حسد کرتا ہے کیونکہ انسانی دماغ کی غذا یا تو اپنی بھلائی کی فکر ہے یا دوسروں کی برائیوں کی جستجو، اور جس شخص میں اول الذکر کی کمی ہے وہ آخرالذکر پر لوٹ پڑتا ہے اور جس کسی کو کہ دوسروں کی سی نیکی اور پرہیزگاری حاصل کرنے سے ناامیدی ہو جاتی ہے وہ اُن کی خوبیوں پر دھبہ لگا کر اُن کے برابر ہو جانے کی فکر میں ہمیشہ سرگرداں رہتا ہے۔

جس شخص میں تجسس اور تفحص کا مادہ زیادہ ہوتا ہے وہ عموماً حاسد ہوتا ہے کیونکہ ہر شخص کے تمام خانگی معاملات کا جان لینا اک محض ناممکن امر ہے، خصوصاً اس وقت جبکہ خود اپنے کاموں کے جھمیلوں سے فرصت نہیں ملتی اس لیے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی ثروت اور دولت کو دیکھکر اک ایسی لذت حاصل کرتا ہے جو کہ محض لہو و لعب سے پیدا ہو سکتی ہے لیکن جس کسی کو اپنے ہی کاموں سے سر اُٹھانے کی مہلت نہیں وہ بھلا کسی سے حسد کیا خاک کرے گا، کیونکہ حسد اک آوارہ خواہش ہے جسکے پاؤں میں چکر ہے، اسلیے وہ گھر میں نچلی نہیں بیٹھ سکتی بلکہ سڑکوں اور گلیوں میں ماری ماری پھرتی ہے۔

رئیس زادے عموماً اُن نئے شخصوں سے حسد کرنے لگتے ہیں جو کہ ترقی کے زینوں پر چڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور یہ بھی انسان کی نظر کی ایک غلطی ہے کہ جبکہ وہ

دوسروں کو ترقی کرتا ہوا دیکھتا ہے اپنے تئیں گھٹتا ہوا محسوس کرتا ہے،

عیب دار اشخاص، بوڑھے، حرامزدے اور ہیجڑے عموماً حاسد ہوتے ہیں کیونکہ وہ شخص جو اپنے معاملات کی درستگی خود نہیں کرسکتا وہ دوسروں کی شہرت اور عزت ملیامیٹ کرنے میں سر سے پاؤں تک کوشش کرتا ہے۔ لیکن ہاں اگر یہ عیوب خوش قسمتی سے کسی نامور اور حیالے شخص میں موجود ہوں تو وہ بات جاتی رہتی ہے، کیونکہ وہ اپنے فطری نقص کو اپنی عزت اور مرتبت کا ایک عمدہ ذریعہ تصور کرتا ہے چنانچہ ایسی باتیں نہایت فخر کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں کہ فلاں لنگڑے نے دنیا میں ایسے ایسے کارنمایاں کیے کہ معجزہ ہی معلوم ہوتے ہیں اس دعوے کی تائید میں امیر تیمور لنگ کی مثال، نہایت تزک کے ساتھ پیش کیجا سکتی

بعینہ یہی حالت اُن شخصوں کی ہے جو کہ آلام اور مصائب کی سختیاں جھیل کر ترقی حاصل کرتے ہیں، کیونکہ وہ کچھ زمانے کی نظروں سے گرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اس لیے وہ دوسروں کے نقصان کو اپنی مصیبتوں کا معاوضہ خیال کرتے ہیں۔

وہ لوگ جو کہ اپنی حماقت اور تلون طبعی سے بیک وقت بہت سے امور میں کمال حاصل کرنے کے آرزومند رہتے ہیں ہمیشہ حاسد ہوتے ہیں۔ گو اُن کو اپنے مقصد حاصل کرنے کے لیے کاموں کی کمی نہیں رہتی مگر تاہم بہت سے امور میں اور لوگ اُن سے بڑھ جاتے ہیں اور یہ اُنکے سمندِ ناز پر اک تازیانہ ہو جاتا ہے یہی حالت شہنشاہ ایڈرین کی تھی۔ جو کہ شاعروں مصوروں اور معماروں سے پرلے درجہ کا حسد رکھتا تھا، جس کی بنیاد محض اس پر تھی کہ وہ اُن سے اُن فنون میں بازی لیجانا چاہتا تھا مگر نہ لے جا سکتا تھا۔

ہم رتبہ، عزیز، اور وہ جو کہ ساتھ ہی ساتھ پیدا ہوئے اور پڑھتے ہیں ...

مقابلوں کو اپنے سے بڑھتا ہوا دیکھکر اُن سے حسد کرنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ ایسی حالت میں خود اُن کی موجودہ ثروت اور عزت آپ اُنکھوں میں کھٹکتی ہے اور گویا اُن کو ملامت کرتی نظر آتی ہے اور یہ امر دوسروں کی نظروں میں صاف صاف دکھائی دیتا ہے اس لیے آتش حسد شہرت اور گفتگو سے دو چند مضاعف ہو جاتی ہے۔ قابیل کا حسد، ہابیل کے لیے خوفناک اور مہلک زیادہ تر اسوجہ سے ہوا کہ جس وقت اُن کی قربانی نے درگاہ خداوندی سے شرف قبولیت حاصل کیا اس وقت اس منظر کا تماشائی کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس لیے حسد کی آگ بڑھتے بڑھتے خون کے درجہ پہ پہنچ گئی۔

اب میں محسود کی جانب متوجہ ہوتا ہوں متقی اور ابرار جبکہ معرفت خدا کی معراج حاصل کر لیتے ہیں اُسوقت اُن سے بہت ہی کم حسد کیا جاتا ہے کیونکہ معرفت خدا کا جامہ خاص انھیں کے جسم کے لیے تراشا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ماسوا اس کے کوئی شخص کسی کی ریاضت اور تکلیف سے حسد نہیں کرتا۔ نہ کسی کے قرض ادا کرنے سے۔ بلکہ اُسکے جاہ و جلال، انعام و اکرام۔ عنایت اور سخاوت کا حسد ہمیشہ مد مقابل سے وابستہ رہتا ہے۔ اور جہاں مقابلہ نہیں ہے حسد بھی مفقود ہے۔ اسوجہ سے بادشاہوں سے حسد سوا بادشاہوں کے دوسرا نہیں کرتا۔ یہ امر غور کرنے کے قابل ہے کہ نالایق اور نااہل جبکہ وہ ترقی حاصل کرنی شروع کرتا ہے اُسوقت زیادہ محسود ہوتا ہے لیکن بعد کو یہ آگ کچھ بجھ سی جاتی ہے۔ برخلاف اسکے صاحب ثروت اور دولت اس وقت زیادہ محسود ہوتے ہیں جبکہ اُن کی دولت دیر پا ہو کر مستقل نظر آتی ہے۔ کیونکہ اُسوقت تک گو اُنکی نیکیاں اور بخشش موجود قائم رہتی ہیں مگر اسکی روشنی اور چمک کچھ ماند پڑ جاتی ہے۔ کیونکہ نئے اشخاص اُن سے زیادہ ترقی حاصل کر کے اُنکے روشن کارناموں پر تاریکی کا پردہ ڈال دیتے ہیں

شریف زادے اپنی ترقی کے معراج میں بہت کم محسود ہوتے ہیں کیونکہ یہ ترقی اُنکی خاندانی شرافت اور بزرگی کے لحاظ سے حق بحق دار رسید کی مصداق معلوم ہوتی ہے۔ سوا اسکے اُن کی شہرت اور دولت میں کچھ نمایاں اضافہ دکھائی نہیں پڑتا۔ کیونکہ حسد کی شعاع اس آفتاب کے مانند ہے جسکی چمکتی ہوئی کرنیں سطحی مقامات کے بہ نسبت ڈھلوان اور اونچی زمینوں پر زیادہ پڑتی ہیں، اس وجہ سے جو لوگ کہ بتدریج ترقی کے زینوں پر صعود کرتے ہیں وہ ان لوگوں سے کم محسود ہوتے ہیں جو کہ دفعتاً ترقی پا جاتے ہیں۔

وہ جن کی شہرت کے دامن سے صعوبات سفر آلام اور مصائب وابستہ ہیں بہت کم محسود ہوتے ہیں کیونکہ انسان خیال کرتا ہے کہ اُس نے یہ عزت و شہرت لوہے کے چنے چبا کر حاصل کی ہے۔ اور لوگ اکثر ایسوں پر رحم کھاتے ہیں اور رحم ہمیشہ حسد کے زخم کو مندمل کرتا ہے۔ یہ بات آئے دن دیکھنے میں آتی ہے کہ بڑے بڑے مدبر اور ملکی فدائی، ہمیشہ اپنی زندگی کے کارناموں پر حسرت اور مصیبت کے حاشیے چڑھاتے ہیں اور یہ اسی وجہ سے نہیں کہ وہ اسکو واقعی محسوس کرتے ہیں بلکہ محض حسد کے بھڑکتے ہوئے شعلے کو فرو کرنے کے لیے لیکن یہ خیال اُنھیں لوگوں کے لیے موزوں اور مناسب ہے جن کو یہ خدمت سلطنت کی جانب سے انجام دینے کے لیے ودیعت کی جاتی ہے نہ اُن لوگوں کے لیے جو کہ جان بوجھکر ملکی امورات کا جُوا اپنے کندھوں پر لیتے ہیں۔ کوئی چیز حسد کی آگ کو زیادہ تیز نہیں کرتی، مگر بے ضرورت، خود غرضانہ اور نامناسب طور پر بہت سے کاموں کو اپنے ذمہ لینا جس سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اور کوئی چیز آتش حسد کو خاموش نہیں کرتی مگر اپنے ماتحت ملازموں اور افسروں کے حقوق کی حفاظت اور اُن کے منصب اور درجے کے موافق اُن سے سلوک کرنا جس سے حسد کے

عوض ہر دلعزیزی کا تمغہ حاصل ہوتا ہے اور ایسے نیک اور مشفقانہ برتاؤ سے حسد اور اُس شخص کے درمیان میں اک گہرا پردہ حائل ہو جاتا ہے۔

سب سے زیادہ حسد کے ہتھے وہ چڑھتے ہیں جو کہ اپنی دولت اور ثروت کی رفعت کو نخوت اور کبر، شوخی اور گستاخی سے ملوث کر دیتے ہیں، اور ایسے لوگ کبھی خوش و خرم نہیں معلوم ہوتے مگر اسوقت جبکہ وہ اپنے ارتفاع اور بزرگی کی رطب اللسانیاں کرتے ہیں، یا جبکہ وہ کسی اختلافی معاملے میں نصرت اور سرفرازی حاصل کرتے ہیں برخلاف اسکے بہت سے عاقل بعض اوقات جان بوجھ کر حسد کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور دیدہ و دانستہ ایسے کاموں میں آلام و مصائب، زجر و توبیخ برداشت کرتے ہیں جن سے اُن کو بہت کم تعلق ہوتا ہے، بہر حال اتنی بات تو اظہر من الشمس ہے کہ رفعت و اقتدار کی گاڑی سادہ اور پاک زندگی میں جو بدنفسی اور خباثت سے معرا ہے حسد کے ناقابل برداشت بار سے بالکل محفوظ رہتی ہے، لیکن اگر اسکی بنیاد مکر اور خدع، کبر اور غرور پر ہوتی ہے تو اسکے بوجھ کی سنبھال ذرا مشکل ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں بیان کیا ہے حسد کے کاموں میں کچھ جادو کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ اسلیے حسد کا عمدہ علاج اُس جادو کا اُتارا ہے۔ جسکا بہترین ذریعہ اپنے سر کے بوجھ کو دوسرے کے سر تھوپ دینا ہے اور اس مقصد کے لیے عقلمند آدمی اپنے ڈھب کے لوگوں کو انتخاب کر لیتے ہیں، اور حسد کی اُس آگ کو جو کہ ان کے خلاف بھڑک اُٹھتی اُن کندۂ ناتراشوں کی جانب مشتعل رکھتے ہیں، اور یہ نزلہ عموماً ناصحوں اور ملازموں اور کبھی ہم رتبوں اور آشناؤں پر گرتا ہے لیکن طرفہ مزہ تو یہ ہے کہ اس آگ کو سہنے کے لیے جیالے اور جوشیلے آدمیوں کی کمی نہیں جو کہ اسمیں خود اپنی شہرت کا راز مضمر خیال کر کے ہر عنوان آتشِ حسد کو

برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

اب میں ملکی حسد کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ ملکی حسد میں کچھ نہ کچھ خوبیاں ہیں مگر ذاتی یا خانگی حسد میں کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ ملکی حسد ایک قسم کا جادو ہے جو کہ بڑے بڑے سربرآوردہ لوگوں کی رفعت اور شہرت میں خرابی پیدا کردیتا ہے اگر وہ خودی اور انانیت کی طرف راغب ہوتے ہیں گویا یہ مقتدر لوگوں کے لیے اک لگام ہے تاکہ وہ اپنے حد اعتدال سے آگے قدم نہ بڑھانے پائیں۔

اس ملکی حسد کو "ناخوشی" سے تعبیر کرسکتے ہیں جسکو میں اچھی طرح سے ساوئل کے بیان میں عرض کروں گا، ملک اور سلطنت میں یہ مرض، مرض متعدی کے مانند ہے۔ کیونکہ جسطرح مرض متعدی اُس شے تک پھیل جاتا ہے جوکہ صحیح اور اپنے رنگ پر قائم ہے، اسی طرح جبکہ یہ حسد (ناخوشی) ملک میں جا گھستا ہے تو وہ عمدہ اور بہترین کاموں میں گھن لگادیتا ہے اور ملک کی خوشبودار چیزوں کو متعفن کردیتا ہے۔

ملکی حسد بادشاہوں اور سلطنتوں کے بہ نسبت وزیروں اور خاص خاص افسروں پر اپنا اثر زیادہ ڈالتا ہے لیکن یہ اک امر یقینی ہے کہ جبکہ حسد کی آگ، کسی خاص وزیر پر، جبکہ اسکی کوئی ذاتی غرض اور منفعت وابستہ نہیں ہوتی یا تمام وزراء سلطنت پر مشتعل ہوتی ہے تو اسکا پوشیدہ مگر گہرا اثر سلطنت کی بنیاد پر نہایت خوفناک طریقہ سے پڑتا ہے۔ ملکی حسد کے متعلق بیان پر اسی قدر کافی ہے۔

لیکن نفس حسد کے متعلق اتنا اور اضافہ کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تمام جذبات سفلی میں حسد ہی اک ایسا جذبہ ہے جو انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور سخت تکلیف پہنچاتا ہے، دوسرے جذبات شاذونادر وقوع میں

میں آتے ہیں۔ لیکن حسد ہمیشہ اک نہ اک پہ اپنا بخار نکالتا ہے یہ بات مشہور ہے کہ عشق اور حسد انسان کو گھلا ڈالتے ہیں جو کام دوسرے جذبات اتنی کامیابی سے سا تھ نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ اسقدر متواتر اور مسلسل نہیں ہوتے۔

حسد اسفل جذبات ہے، اسی وجہ سے یہ شیطان کی خاص صفت ہے۔ کیونکہ شیطان "وہ حاسد ذات ہے جو کہ رات کے وقت گیہوں میں جَو ملا دیتا ہے" اور چونکہ ہمیشہ ایسا ہی وقوع میں آتا ہے کہ حسد اپنا کام دغا بازی اور مکر سے تاریکی میں کرتا ہے، اور گندم جیسی اچھی چیز چونکہ اسکی آنکھوں میں خار سی کھٹکتی ہے اس لیے وہ اس میں جَو کی آمیزش کر دیتا ہے۔

نصیر بی۔ اے

نظم

"قلزم اوقات"

بحر زخار ترا جب امواج سے ہے سال
جوش طوفاں میں شب و روز ہیں تیرے ہی خیال

قلزم وقت ترے گہرے الم کا پانی
شور سے اشک کے قطروں کے ہوا ہے کھاری

سیل پر شور لگا لیتا ہے پانی کے تلے
جزر و مد تیرا ہر انساں کو جھک جھک کے گلے

ہیں اگرچہ ترے فتراک میں نخچیر بہت
تو بھی ترکش میں ہوس کے ہیں ترے تیر بہت

زہر اگلتا ہے تباہی کا جو اخگر بن کر
تو نگل جاتا ہے انسان کو اژدر بن کر

ہضم کر جاتا ہے بربادیوں کا اپنی بخار
تری گردن پہ سدا رہتا ہے اک بھوت سوار

امن کے وقت بتوں کی طرح دمساز ہے تو
موج طوفاں میں بھی اک آفت ناساز ہے تو

بحر زخار ترے کبر کو توڑے گا کون
پنجۂ ظلم و ستم کو ترے توڑے گا کون

"ترجمہ از شیلے"

نصیر بی۔ اے

قصیدۂ وداعی سر سید علی امام صاحب بہادر ممبر کونسل وسیرائے ہند بہنگام اتمام مدت ممبر کونسل بموقعۂ ڈنر حاذق الملک بہادر بتاریخ ۹ نومبر روز دوشنبہ ۱۹۱۵ء عرض نمود

ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی

مرتفع تھی جو نگاہوں سے نقاب دوری — شومئ بخت سے ہے آج حجاب دوری
ساقیا بزم میں لا جام شراب دوری — ہیں گزک کے لیے موجود کباب دوری
سرگراں دیکھیے احباب کو کب تک رکھے — ہے فرقت کا اثر بادۂ ناب دوری
ناطقہ کر کے ہوا بند سوال یا یوس — سامعہ کو جو ملا صاف جواب دوری
تیری فرقت میں جو آنکھوں سے بہینگے آنسو — اُنکے معنی ہیں لغت میں مرے آب دوری
کر نہ ہم کبھی سے جو تری ا سکی نہیں — اُنھیں آنکھوں کو نظر آتا ہے خواب دوری
خوگر لطف جو ہونگے تری نزدیکی سے — اُن سے کسطرح ہو برداشت عتاب دوری
گریہ دولت ہے تو محروم رہیں اس سے دوست — دشمنوں کو ملے یہ قند خوش آب دوری
جو نہ آتا تھا کبھی پیک نگہ کو بھی نظر — وہی منڈلانے لگا سر پہ عقاب دوری
تا بہ کے دیکھیے جلباب تبعد رہے وا — تا کجا کھنچتی ہے دیکھیں یہ طناب دوری
اس کڑی کو بھی خدا چاہے تو ہم جھیلینگے — دل میں ظاہر تو نہیں طاقت وتاب دوری
پاس والوں سے کہے دیتے ہیں گر کی یہ بات — جانستاں ہوتی ہے درگاہ جناب دوری
ہمنشینوں کے لیے بعد ہے سم قاتل — قطرۂ زہر کہو آب حباب دوری
میرے دل سے کوئی دوری کی حقیقت پوچھے — عنفوان دوری کا ہے عین شباب دوری
اور فکروں سے ملی تھی ہمیں کس روز نجات — کہ لگا جان کو یہ روگ عذاب دوری
چارہ گر یہ تو بتا دے عوض شربت وصل — لکھدیا نسخہ میں کیوں تو نے لعاب دوری

حاذق الملک کے گھر آج وداعی تھا ڈنر — پیش جو ڈش ہوئی تھی آج وہ قابِ دوری
سونپا اللہ کو لختِ دلِ امدادِ امام — تیری فرقت سے ہیں لب لبابِ دوری
ہے اقانیم سہ گانہ کی طرح نام ترا — جسنے دیکھی ہی نہیں کسرِ حسابِ دوری
ایک تو جز ہے علی اور امام و سید — ہر سہ ایسے ہیں ہم جیسے جوابِ دوری
کچھ گنہ بھی تو نہیں تھا تری نزدیکی میں — کہ نظر آئی ہمیں راہِ ثوابِ دوری
آج کل بہرِ ملاقات جو وا ہے ترا در — اصل میں نام اسی در کا ہے بابِ دوری
مجمعِ احباب کا دیتا ہے نظر کو دھوکا — اسی نزدیکی کا ہے عرف سرابِ دوری
آرزو یہ ہے کہ ہو زیست مساعد اتنی — دیکھیں ہم کو ملے شکلِ غیابِ دوری
ہے گذارش کہ ملیں ہمکو عرائض کے جواب — بھول جانا نہیں کچھ داخلِ دابِ دوری
گاہ گہ اپنی زیارت سے مشرف کیجو — اس سے بڑھتی نہ رہے فردِ حسابِ دوری
ریل پہنچا دیگی کل تجھکو یہاں سے پٹنہ — تیز تر اس سے نہیں کوئی دوابِ دوری
اپنے جانے کے ترانے نہ سنا تو ہم کو — نغمہ زن چھیڑ نہ تو تارِ ربابِ دوری
شرح و تفصیل کی حاجت نہیں ہمکو کچھ بھی — ہمکو معلوم ہیں سب خیر و صوابِ دوری
عارضی عزم ہے لندن کا وطن ہے پٹنہ — بیش و کم اتنا ہے معلوم نصابِ دوری
عزمِ لندن کا تو تھا تو ابھی رک گئے اور — جانتے ہیں سببِ وجہِ شتابِ دوری
تجھکو سیلون میں کر دینگے ترے چلکے سوار — ملکے تر کر دینگے آنکھوں سے رکابِ دوری

ختم کر جلد کہیں افسانۂ ہجران سائل
لوگ کب تک سنیں مضمونِ کتابِ دوری

ریویوز

زبان دانی

خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی پریسیڈنٹ انجمن چشمۂ سخن ندوہ و سکرٹری انجمن اصلاح سخن

لکھنؤ نے اس کتاب کو بہت محنت سے تصنیف کیا ہے۔ اسمیں اُردو زباندانی کے قواعد درج ہیں اور اُردو سیکھنے والے کے لیے بے انتہا مفید ہے یہ کتاب اس میں بطور کورس شامل ہونے کے قابل ہے مصنف سے احاطۂ خانساماں لکھنؤ کے پتہ پر ۴ روپیہ میں مل سکتی ہے۔ تقطیع ۲۲۔۱۸ حجم ۸۸ صفحہ

جذبات بھاشا

یہ وہ کتاب ہے جو حضرت نیاز فتحپوری کے سحر نگار قلم سے نکلی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس کتاب کو مرتب کر کے حضرت نیاز نے اُردو لٹریچر اور بخصوصیت کے ساتھ اردو اُردو شاعری کے لیے ایسا مصالحہ پیش کیا ہے جسکے لیے اُردو ہمیشہ حضرت نیاز کی شکر گذار رہے تو کچھ زیادہ نہیں۔ اس کتاب میں بھاشا کے چند مشہور شاعروں کے کلام کا اقتباس درج کیا ہے اور پھر اسکے معنی میں اپنے خاص انداز سے حضرت نیاز نے وہ لطافت بھر دی ہے کہ وہ شخص بھی جو بھاشا سے بالکل ناواقف ہو محض معنی پڑھ کر محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا دوہوں کے انتخاب میں بعض ایسے دوہے بھی آ گئے ہیں جو اخلاق کے معیار سے گرے ہوئے ہیں جن کا خود قابل مصنف نے اعتراف کیا ہے مگر ان کی وہ تشبیہات جو وسعت خیال کو صرف ہندوستان کے حدود تک کھینچتی ہیں قابل داد ہیں اور اسی وجہ سے وہ درج کتاب ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اسکے علاوہ بعض دوہوں نے صرف اسوجہ سے داد لی ہے کہ وہ بھاشا کے ہیں اگر وہ ہی دوہے شعر کی صورت میں زبان اردو میں ہوتے تو غالباً حضرت نیاز کا قلم اُنکی داد نہ دیتا۔

ناظم دائرۃ الادب بھی اُردو دان پبلک کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اس کتاب کو شائع کیا۔ کتاب کی لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ ہے حجم ۸۸ صفحہ ہے۔ قیمت ۱۲ر ناظم دائرۃ الادب دہلی سے مل سکتی ہے۔

شعراءِ عرب
اور
اُن کا سالانہ مشاعرہ

(بسلسلہ اشاعت سابق)

قبل اسکے کہ میں شعراءِ عرب کی فہرست مع ان کے نام پیش کروں اور اُنکے زمانۂ جاہلیت کے ادب کو تنقید کی روشنی میں لاؤں ضروری اور نہایت ضروری ہے کہ پہلے عربی زبان کی اجمالی حالت سے ناظرین کو آگاہ کردوں ہرچند کہ کسی علمی یا تاریخی خیال کو اردو کی ایسی محدود زبان میں مختصر طور پر ذکر کرنا پھر اس خیال کو بھی ساتھ ہی ساتھ لیے رہنا کہ مقدمات بھی مختصر رہیں اور اختصار میں مقدمات کا فائدہ اور غرض بھی نہ مفقود ہونے پائے ایک ذرا اہم امر ہے لیکن تا امکان اُسی قدر تمہید تحریر کروں گا کہ جسقدر میرے مضمون کی اثبات نوعیت کے لیے مفید اور آیندہ ناظرین کی اُس بصیرت کے لیے ضروری ہے جس پر مضمون کا مدار دلچسپی ہے

یوں تو دنیا میں ہزاروں زبانوں نے لباس وجود پہنا اور خوب خوب حیثیت پہنا عالم میں اپنی اپنی ہستیوں کو علمی اور غیر علمی ہر حیثیت سے برقرار رکھا اور بدلوں رکھا لیکن پھر ایک نہ ایک دن اُنھیں میں کی اکثر زبانیں مثل ژند ی - قبطی - کلدانی - زشوری - سریانی - فینقی - حمیری - یونانی - بربری وغیرہ وغیرہ کے خواہ جن قوموں میں وہ پیدا ہوی تھیں اور جن کی نشو و نما کے ساتھ اُنکی نشو و نما ہوی تھی اُنکی ترقی و تنزل کے رنگ میں ملی جلی ہوی یا تو بالکل دفتر عالم سے نیست و نابود ہوگئیں اور یا باقی بھی ہیں تو پیکر بیجان و جسد بے روح کی طرح ہیں میں اسوقت نہ سب زبانوں کی تفصیلی فہرست اور اُنکے تاریخی زندگی و مدارج

نشو و نما کو پیش کرنے پر تیار ہوں اور نہ میرے مشاغل تعلیم مجھکو اتنی فرصت دینے کو موجود ہیں لیکن ہاں صرف اُسیقدر جس سے ایک اجمالی بصیرت ناظرین "تمدن" کو حاصل ہوجائے۔ دنیا کی وہ تمام مختلف زبانیں جو ابتدائے آفرینش عالم سے پیدا ہوتی رہیں اور مٹتی رہیں اُن سب کی مکمل فہرست شاید اسوقت دنیاوی تاریخ کا کوئی ورق نہیں پیش کرسکتا لیکن ہاں اُسی قدر پیش کیا جاسکتا ہے جن کو بسیط تاریخوں نے اپنی آغوش میں امانت رکھ لیا ہے جیسا کہ بعض محققین حال کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام زبانیں دنیا میں اسوقت جتنی رائج ہیں یا انکے پہلے تھیں ان سب کا ماخذ اور السنہ قدیمہ و اصلیہ کہے جانے کی مستحق بلکہ مصداق صحیح یہ تین زبانیں ہیں آریانی۔ تورانی۔ سامی آریانی اور تورانی سے سنسکرت فارسی۔ انگریزی۔ فرنچ۔ لاطینی چینی۔ تاتاری۔ ترکی وغیرہ وغیرہ پیدا ہوئیں انمیں علمی اور غیر علمی دونوں شامل ہیں اگرچہ یہ امر بھی قابل ذکر تھا کہ ابکون کون زندہ ہیں اور کون مردہ ہوچکیں لیکن میرے مضمون سے اسکو کوئی خاص تعلق نہیں ہے اسوجہ سے ترک کرتا ہوں تیسری زبان اصلی زبانوں میں سے سامی ہے اسی سے عربی۔ حبشی۔ عبرانی۔ نبطی۔ تدمری۔ آرامی۔ کلدانی۔ سریانی وغیرہ وغیرہ پیدا ہوی ہیں۔ اور بعض مورخین کی راے ہے کہ زبان عربی اُس خاندان السنہ سے ہے جسکا نام سیماطیقی ہے اور اسے عبرانی سے بہت مشابہت ہے اگرچہ زبان عربی کے متعلق کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ موجودہ حالت میں کب سے آئی لیکن ہاں اسقدر شعراء جاہلیت کے کلام سے راے قائم ہوسکتی ہے کہ رسالتماب صلعم کے زمانہ سے ایک صدی قبل تک عربی زبان درجہ کمال کو پہنچ چکی تھی زندگی اور علمی زندگی وسعت اور غیر معمولی وسعت جس زبان کو حاصل ہوی وہ یہی عربی زبان ہے چنانچہ ابن سیدہ کے لغت جسکا سال وفات سنہ ۱۰۶۵ء ہے اُسوقت بھی مینٹ جلدیں تھیں

اگرچہ حال کی تحقیقات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس ڈیڑھ سو برس کے اندر عربی زبان نے بہت ترقی کی ہے اور تقریباً چار ہزار کے لغات دخیل و معرب اپنی ہمسایہ زبانوں سے اور نیز جو اس سے ہم مشرب ہوئے ہیں مثل جرمنی چینی روسی۔ سواحل و جزائر ہند حبشی۔ عبرانی۔ اسپینی۔ انگریزی قبطی بمصری۔ سنسکرت سریانی۔ لاطینی۔ فرنچ۔ ایتالین۔ ترکی۔ یونانی فارسی وغیرہ وغیرہ سے لیے ہیں لیکن زبان عربی ان سے قطع نظر کر کے بجائے خود ایک ایسی وسیع زبان ہے کہ جس نے بغیر کسی کی مدد کے ہزاروں علوم کو اپنی آغوش میں لے لیا بلکہ دوسری زبانیں اپنی علمی اور غیر علمی ضرورتوں میں اسی کی منت پذیر رہیں وہ زبان جس نے لاکھوں الفاظ سے دوسری زبانوں کو مدد دی اگر اس نے کچھ الفاظ اپنے فاتحانہ استحقاق سے دوسری زبانوں سے بطور خراج لے بھی لیے اپنی زندگی کو تازہ اور پرزور بنانے کے لیے تو یہ کوئی منقصت نہیں ہو سکتی۔ دیکھو دنیا کا مشہور سیاح برک ہارٹ جس سے زیادہ اس امر کو جانچنے والا کوئی شخص نہیں ہو سکتا وہ یوں لکھتا ہے اس سیاح کی رائے زبان عربی کی دلیل وسعت کے علاوہ اسکی فصاحت و بلاغت پر ایک زبردست بیّنہ ہے (البتہ عربی بول چال میں کثرت سے محاورے ہیں جو شاید اور کسی زبان میں نہیں پائے جاتے لیکن باوجود ان وسیع ممالک کے جنمیں زبان عربی بولی جاتی ہے یعنی موگاڈور سے مسقط تک جو کوئی انمیں سے ایک محاورے کو بھی سیکھے تو وہ دوسرے محاورے کو بخوبی سمجھ سکتا ہے)

موسیو سدیو لکھتا ہے کہ یہ امر نہایت قریں قیاس ہے کہ عربوں ہی کی زبان سے جو آٹھویں صدی عیسوی سے بحر متوسط پر قابض تھے فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں اکثر وہ الفاظ اخذ کیے گئے جو جہازرانی اور بحری انتظام سے متعلق تھے یہ بھی قرین قیاس ہے کہ جس وقت باقاعدہ اور مستقل فوجیں یورپ میں قائم

ہونے لگیں تو افسروں کے نام اور لڑائی میں نعرے کے الفاظ بھی عربوں سے لیے گئے۔ اور انتظام مملکت کے متعلق اصطلاحیں بھی بغداد و قرطبہ سے اخذ کی گئیں فرانس کے طبقۂ ثالث کے سلاطین پوری طرح عربوں کے مقلد تھے اور اسی وجہ سے شکار کے متعلق اکثر الفاظ عربی الاصل ہیں لیکن زیادہ ترجو الفاظ ہمیں عربوں سے ملے ہیں وہ علمی اصطلاحات ہیں ہمارا علم ہیئت ان اصطلاحوں سے معمور ہے اکثر ستاروں کے نام عربی ہی ہیں اور علم ریاضی کے اصطلاحات اور علم کیمیا کے اصطلاحات اور علم حیوانات کے اصطلاحات اور علم طب کے بہت سے اصطلاحات اور ادویہ کے نام عربی سے اخذ کیے گئے۔

بس مقدمات میں اس سے زائد مَیں کچھ نہیں لکھنا چاہتا اس زبان کی فصاحت و بلاغت کے متعلق صرف سکوت کے ساتھ کلام الٰہی کو پیش کرتا ہوں اس میں شک نہیں کہ عربوں کے زبردست متخیلہ کو اپنے جذبات صادقہ ادا کرنے کے لیے ایک ایسی وسیع و زبردست علمی زبان ملی جسکی آغوش میں فصاحت و بلاغت صرف اٹکھیلیاں کر کرکے بڑھی اور پروان ہی نہیں چڑھی بلکہ اُسمیں پیدا بھی ہوئی ہاں ہاں بیشک بیشک میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ عربوں کے زبردست تخیلات عربوں کے فطری جذبات شاعری عربوں کی حقائق قدرت کی مصوری اور مناظر فطرت کی واقعہ نگار طبیعتیں کبھی عالم میں حُسن قبول کی معراج الکمال نہیں حاصل کر سکتی تھیں اگر خود زبان عربی اپنی جامعیت و کمال کے چار چاند اُن میں نہ لگاتی اور عرب کی زمین میں حُسن و عشق کے جذبات مضمر نہ ہوتے

عرب کی سرزمین پر پہلا شخص امری القیس بن حجر بن حارث بن عمرو بن آکل المرار بن معاویہ بن ثور بن کندہ ہے جس نے قصبۂ عکاظ کے مشاعروں میں سب سے پہلے بالا جیتا ہے اور تمام فصحائے عرب کے دلوں پر اپنی فصاحت و بلاغت کا

سکہ بٹھا دیا۔ خانۂ کعبہ پر اسکے قصیدہ کا لٹک جانا اس بات کی دلیل تھا کہ تمام
فصحاے عرب کی گردنیں اسکے آگے جھک گئیں امری القیس اپنے عہد و قوم کے
شیخ قبیلہ کے رشتہ داروں میں تھا؟ ایک چھوٹی سی سلطنت جو ہر ہر قبیلہ کے لیے
اُس عہد میں علحدہ علحدہ حاصل ہوتی تھی اُسکا ایک کن بھی تھا یہ اپنے چچا
شرجیل کی بیٹی عنیزہ پر عاشق تھا افسوس کہ ہم مضمون کی طوالت کے خیال سے
اسکا تفصیلی کیرکٹر نہیں پیش کر سکتے اس زبردست شاعر میں صرف شاعری کا
متخیلہ ہی زبردست نہ تھا بلکہ عاشق مزاجی درجۂ کمال پر تھی بچپن طبیعت کے
ساتھ ہی ساتھ پہلو میں دل گداختہ اور دل گداختہ میں حسن و عشق کے سچے جذبات
لہریں مار رہے تھے طبیعت میں سوز و گداز تھا سوز و گداز میں جذب اور غضب کا
جذب تھا آنکھیں مناظر قدرت و فطرت کا جس سے زائد وحشی مزاج عربوں کے
لیے عالم میں کوئی چیز دلچسپ ہو ہی نہیں سکتی حس اور پورا حس کرتی تھیں
اسی سے توازن ہے اور قیاست کا اثر ہے اعراب جاہلیت کے کلام میں سوائے
واقعات و استعارات و کنایات کے کہیں بنوٹ کا پتہ بھی نہیں ہے لیکن یہ بات
اعراب جاہلیت ہی سے مخصوص ہے ۔ اُس زمانے کے بعد کی شاعری سے یہ بات
نسبتاً بہت کم ہوگئی جب سے اعراب نے درباری اور خوشامدی شاعری شروع کردی
عربی کلام کی تنقید کسی غیر زبان میں اسی طرح پر ہے کہ جیسے جواہرات اپنے معدن
سے علحدہ ہونے پر قوت میں کم اور بہت کم ہو جاتے ہیں ۔ نیز امری القیس کہتا ہے

قفا نبك من ذكرى حبيب ومنزل ۔ بسقط اللوى بين الدخول فحومل
فتوضح فالمقراة لم يعف رسمها ۔ لما نسجتها من جنوب وشمأل

عرب کا دہ کوسوں کا چٹیل میدان ہر طرف سوائے مناظر فطرت اور خدا ساز سادگی
کے کوئی غیر چیز نظر نہیں آتی ایسے مناظر عام قاعدہ ہے اسیران محبت اور سودائیان

عشق کے لیے بہت دلکش ودلچسپ ہوا کرتے ہیں خصوصاً ایسے مزاج والوں کے
لیے جنکے عشق ومحبت کی نشو ونما بھی ایسے ہی مقامات پر ہوئی ہو۔ امرء القیس اپنے ساتھیوں
کے ساتھ اسی وادی سے گذر رہا تھا جہاں اُن مکانات کے کچھ مٹے مٹے نشانات باقی رہگئے
ہیں جنمیں اسکے دل کی مالک عنیزہ کبھی مقیم تھی اور اب اُس مقام پر ہے جہاں امرء القیس کی
کبھی حسرت دیدار نکلتی تھی بھلا اسوقت کیونکر ممکن ہے کہ فطری طور پر امرء القیس اپنی معشوقہ
کی یاد پر مجبور نہو جائے اُن نشانات کا دیکھنا تھا کہ ہمارے عاشق مزاج کی طبیعت بگڑ گئی
دل پر ایک چوٹ لگی اور دبی ہوئی فرقت کی آگ بھڑکی اور خوب ہی بھڑکی ایک ہوک سی
اُٹھی اور امرء القیس تھرایا آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے نہ رونے والی طبیعت کو دم
کے لیے روکا ابھی پورے طور پر سنبھلنے نہیں پایا تھا کہ پھر ایک بجلی سی دل پر گری
اور یہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ٹھہرو ٹھہرو لے میرے ساتھیوں (قفا)
صیغۂ امر ہے تثنیہ کا یہ بات عادات عرب سے ہے کہ واحد کو تثنیہ سے اکثر خطاب کرتے
ہیں جیسا کہ پروردگار عالم نے خازن جہنم کو صیغۂ تثنیہ سے مخاطب کیا ہے القیا
جہنم میں اور بعضوں نے اسکی تصریح یوں کی ہے کہ اس محل پر تثنیہ تاکید کے
فائدہ کے لیے ہے گویا قفا محل پر قف قف کے ہے یعنی امرء القیس اپنے ساتھی سے
بیخودی کے عالم میں کہہ رہا ہے ارے اے میرے ساتھی ٹھہر ٹھہر میری رائے میں
محل نصرف بھی یہی کا ہے بنک صیغۂ متکلم ہے معنی اسکے رونے کے ہیں اور ساتھی کے
ساتھ رونے کے ہیں مصرعہ اول کے یعنی اب ہوے کہ ٹھہر ٹھہر اے میرے ساتھی
تاکہ ہم اور تو دونوں مل کر یاد معشوق اور منزل معشوق میں رولیں۔ دوسرے مصرع میں
واقعہ نگاری اور مصوری کا کمال دکھاتا ہے بسقط اللوی بین الدخول فحومل
جو لوگ رموز شاعری اور دقت شاعری سے واقف ہیں وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اہم ترین
شعبۂ شاعری میں واقعہ نگاری ہے دوسرے مصرع میں کہتا ہے اور اپنے ساتھی کو جگہ بتاتا ہے

...رنے کی کہ اس عظیم تودۂ ریگ کے پاس جو درمیان دخول و حومل (یہ دونوں نام ہیں مقاموں کے) کے واقع ہے اور

فتوضح فالمقراة لم یعف رسمها لما نسجتها من جنوب و شمأل

درمیان توضح و مقراۃ کے واقع ہے (یہ بھی نام ہیں مقامات کے) گویا دخول و حومل اور توضح اور مقراۃ منزل معشوق کے حدود اربعہ ہیں جنکو امرء القیس اپنے ساتھی کو بتا رہا ہے پھر اسی کے بعد یہ بھی بتا رہا ہے کہ ابھی تک وہ نشانیاں منزل معشوق کی باقی ہیں باد جنوبی و باد شمالی کے تیز جھونکے اُسے ابھی تک مٹانے نہیں پائے ہیں اس بیان سے بظاہر مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ افسوس کل جس پر عنیزہ کے حسن و جمال کا آفتاب چمک رہا تھا آج اسکا یہ نقشہ ہے کہ باد جنوبی کے جھونکے اسکے منزل کے اُجڑنے کے بعد جو نشانیاں باقی رہگئی ہیں اُسکے مٹانے کے لیے خاک اُڑا کے لاتے ہیں اور اُسپر ڈالتے ہیں تاکہ وہ نشانیاں مٹجائیں اور باد شمالی کے جھونکے اُس خاک کو اُڑا لیجاتے ہیں اور ممکن ہے کہ یہ مقصود ہو کہ افسوس کسقدر وقتی تھیں وہ لذتیں جو عنیزہ کے دیدار سے اس مقام پر نصیب ہوتی تھیں ریتلی زمین پر بنے ہوے نشانات کو باد جنوبی اور شمالی کے جھونکے ابھی ہٹا بھی نہ سکے اور وہ لذتیں فراق کے پہاڑوں کے نیچے دب کے نیست و نابود ہو گئیں قابل غور یہ امر ہے کہ امرء القیس اپنے جذبات واردات قلبی اور حسیات باطنی کا کیسا زبردست مفسر ہے تمام اصل واقعات کو کتنے پر سوز لہجے میں ادا کر رہا ہے اسکے انھیں دو شعروں میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں جنکو بلحاظ طول نظر انداز کرتا ہوں لیکن منجملہ اُنکے ایک جلیل تاریخی فائدہ جو ہم کو اس مقام پر حاصل ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ اُس زمانہ کے اعراب کی زندگی اور عنوان معاشرت اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے اکثر قبائل اپنی زندگی خانہ بدوشی کی بسر کرتے تھے آج اس وادی میں خیمے اور چھولداریاں ہیں تو کل اُس وادی میں ڈیرہ ہے کسی ایک مقام پر مستقل زندگی بسر نہیں کرسکتے تھے اسکی وجہ کیا تھی اسکی وجہ یہ تھی کہ مویشیوں پر اوقات گذرانی ہوتی تھی جہاں اچھی چراگاہیں ہوتی تھیں وہاں قیام ہوتا تھا اور جب چری ختم ہو جاتی تھی تو پھر دوسرا وادی تلاش کرنا پڑتا تھا انھیں اشعار پر غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ اور طرز معاشرت بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے ہر قبیلے میں رائج تھا۔ (باقی آئندہ)

سید علی آشفتہ لکھنوی

انوکھا جھانسا

ابھی کل کی بات ہے لکھنؤ کے راجہ اندر اودھ کے تخت حکومت پر براج رہے تھے سارا شہر پرستان بنا ہوا تھا دربار میں وہ چہل پہل تھی کہ دیکھنے والوں کی آئی بھوک بھاگتی تھی پچاس روپے کے تنخواہ والے تو امیر ہوتے تھے لیکن پانچ روپے کا نوکر بھی وہ ٹھاٹھ رکھتا تھا کہ آجکل کے لکھ پتی کو بھی یہ ساز و سامان ملنا مشکل ہے وجہ یہ تھی کہ ہر چیز سستی تھی غلہ بکثرت پیدا ہوتا تھا اودھ کی پیداوار باہر نہیں جاتی تھی لوگوں میں ہندوستانی دستکاریوں کی قدر تھی مزاجوں میں آرام طلبی کاہلی نہ تھی وضع میں سادگی تھی تکلفات نہ تھے ٹکے سیر سے زیادہ کوئی اناج نہ تھا غریب سے غریب گھر میں آئے دن مہمان بنے رہتے تھے فقیروں کے چہرے سے آسودگی اور بحالی ٹپکتی تھی گھر گھر شادیاں رچا کرتی تھیں گلی گلی جلسے ہوتے تھے قیصر باغ کے رہس کی دھوم تھی بادشاہ خود ہمہ داں اور قدر داں تھے جس فن کا کامل آتا تھا کھپ جاتا تھا اور یہ مادہ اودھ کے بادشاہوں میں ہمیشہ سے تھا ایک مثل مشہور ہے کہ دلی اجڑ کر لکھنؤ آباد ہوا یہ سچ ہے آج دہلی کے تمام مایۂ ناز شاعر تمام صناع تمام گویے تمام سلطنت کے تخت دل لکھنؤ کے دامن میں میٹھی نیند سو رہے ہیں ملک الشعرا میر تقی میر مرزا سودا میر سوز جرأت انشا صاحبقران جعفر زٹلی یہ سب اسی لکھنؤ میں خاک ہوئے

آخری شاہ اودھ کی بھی قدر دانی کا یہی حال تھا انکے زمانے میں دہلی کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ نے آوارہ وطن ہو کر لکھنؤ کا سفر کیا ریل تو تھی نہیں پیدل سفر کرتے ڈیڑھ مہینے میں لکھنؤ تک پہنچنا نصیب ہوا شہر کی آئینہ بندی دیکھکر ہکا بکا ہو گیا۔

ایک قدیم رشتہ دار کی وساطت سے دربار شاہی دیکھنا نصیب ہوا مرد ہے نے کمال ادب سے نصف قد خمیدہ کر کے سلام کرایا اور کہا نیچی نظر کیے ہوئے مودب کھڑے رہو منھ سے نہ بولنا نظر اُٹھا کر نہ دیکھنا ہاتھ پاؤں نہ ہلانا حرکت نہ کرنا ہنسی نہ آئے کھنکھارنا نہیں ہونٹ تک ہلانا اشارہ نہ کرنا ان تمام قیود نے ایسا متاثر کیا کہ غریب سارے جسم سے تھر تھر کانپنے لگے اور عرض بیگی نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا منشی قمر علی دہلوی حاضر ہے نگاہ روبرو۔

بادشاہ نے اشارہ ابرو سے سلام کیا اور منشی صاحب بیت الانشا کے منشیوں میں تیس روپیہ ماہوار کے ملازم ہو گئے اب حیثیت اور سے اور ہو گئی معالیجاں کی سرائے میں زمین مول لے کر مکان بنوایا اور اہل خانہ کو بھی لکھنؤ میں بلوا لیا منشی صاحب بہت نیک طینت اور خوش اخلاق آدمی تھے سارا عملہ خوش تھا خوشنویس بے بدل تھے ایک لڑکا تھا جو باپ کی طرح نیک اور خوش سلیقہ تھا ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھا اسکے بعد کوئی اولاد نہ ہوئی اس سبب سے بہت لاڈ پیار تھا اسپر بھی پندرہ برس کے سن میں اُردو فارسی کے علم سے کما حقہ فراغت کر کے تحصیل عربی کی طرف مشغول ہوا ابھی زیر تحصیل تھا کہ زمانے نے دوسری کروٹ لی اور غدر ہو گیا گھر لٹ گیا اور تمام شرفا تباہ اور برباد ہوئے منشی صاحب بیک بینی و دو گوش چھ مہینے کے بعد گھر واپس آئے۔

۲

مدت کے بعد لڑکے کی شادی ایک عزیز قریب کے یہاں جو انھیں کی طرح آوارہ وطن تھے اور کسی قدر آسودہ حال تھے ہو گئی لڑکی بھی اپنے ماں باپ کی اکلوتی تھی اور ناز دولت کی پلی ہوئی پھر امیر گھر کی بیٹی میاں بیوی میں کچھ اچھی طرح میزان نہ بیٹھی اور ان بن رہنے لگی میاں چاہتے تھے محنت مزدوری کر کے پیسا کماؤں اور بقدر ہمت ضعیف والدین کی خدمت کروں بیوی چاہتی تھی کہ میاں لباس پوشاک سے آراستہ رہیں اور سارے گھر پر حکومت کریں ورنہ دن رات گھر میں پڑے پڑے مکان کی اینٹیں گنیں۔

میاں مہترانی تک کو جھک جھک کر سو سو دفعہ سلام کرتے تھے بیوی نے عید بقرعید پر بھی
ساس سسرے کو ہاتھ اٹھا کر سلام نہیں کیا اور انکو حقیر سمجھ کر منھ نہ لگایا تو بھلا دوسرا کیا چیز تھا
سسرال کی ہر چیز کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی کوئی اچھے سے اچھا کپڑا خاطر میں
نہ آتا تھا ایک روز غریب شوہر نے عید کی تقریب پر بیوی کے لیے اودی گرنٹ کے
پائجامے کا کپڑا خرید کیا اور خیال تھا کہ بیوی دیکھکر شاد شاد ہو جاے گی بیوی نے دیکھکر کہا
اوئی یہ کس کام کی گرنٹ نگوڑی سے ہے کیسی بے روپ ہے اور اسپر رنگ ایسا گہرا ہے
کہ بالکل سیاہ معلوم ہوتی ہے۔

میری ماں نے بھی ایک دفعہ ایسا ہی پائجامہ بنایا تھا مجھے پھوٹے دیدوں بھی نہ بھایا
آخر بہشتی کو دیدیا میاں نے سنکر ایک آہ سرد بھری اور دل میں کہا اگر ایسے ہی دماغ ہیں
تو اس غریب گھر میں بسر ہونا مشکل ہے جان پر کھیل کے بیوی کے واسطے دوسرا کپڑا اسکی
پسند کا لایا اور بہت تکلف سے پائجامہ ماں نے سی سلا کر تیار کیا لیکن بیوی بہو کو عید کے
دن وہ بھی پہننا نصیب نہوا کہنے لگی برس برس کے دن میں تو ایسی سردی میں سویرے
سویرے نہیں نہا سکتی اگر پائجامہ دو چار دن پہلے سے تیار ہو گیا ہوتا تو ایکدن پہلے
نہا کر بدل لیتی اسکے علاوہ مجھے کچھ عید پر نئے کپڑے بدلنے کی خوشی نہیں ہے اور نہ ترسی بلکی ہوں
کہ اچھے اچھے کپڑے دیکھکر رال ٹپک پڑے وہ نگوڑا پائجامہ ہے کیا میں نے اس سے
اچھے اچھے کپڑے پہن کر پھاڑ ڈالے ہیں۔

ماں باپ کے خوف سے غریب مہر علی یہ سب نکتوڑے اٹھایا کیا اور ایسی ایسی
باتوں پر خاک ڈالتا رہا لیکن وہ سمجھتا تھا یہ سب نخرے مجھ سے نہ اٹھیں گے شادی کو
دس برس ہو گئے ماں باپ نے انتقال کیا۔ اور میاں مہر علی یکہ و تنہا بیک بینی و دوگوش
ہیں اور وہی بدمزاج بیوی ہے۔ بیوی کے سر سب کام آ پڑے اسکی امید مہر علی کو
نہ تھی اس لیے اس نے ایک ماما نوکر رکھی جو اسکو وقت پر کھانا پکا دیا کرے مگر اسپر بھی

کوئی دن کمبخت ایسا نہ ہوتا تھا جس میں میاں بی بی میں دو چار مرتبہ ٹھائیں ٹھائیں نہ ہوتی ہو اور بیوی لڑ جھگڑ کر میکے نہ چلی جاتی ہوں اسپر خرچ کی وہ زیادتی کہ توبہ ہی بھلی تھی آخر مکان رہن ہو گیا اور جب وہ روپیہ بھی صرف ہو گیا تو میاں بیوی میں جوتی پیزار بٹنے لگی بیوی اُٹھکر اپنے میکے چلی گئیں اور میاں بھی کچھ ایسے عاجز آگئے تھے کہ گھر کی ماما کو جواب دے کر اور اپنا اسباب خانگی فروخت کرکے ؎

نہ سنڈ بد کی لی اور نہ منگل کی لی   نکل گھر سے پھر راہ جنگل کی لی

(۳)

حیدرآباد کی ریاست میں میاں مہر علی وکالت کر رہے ہیں اور تقدیر کچھ ایسی موافق ہے کہ لاکھوں کے وارے نیارے ہو رہے ہیں شام کو امیرانہ دربار ہوتا ہے مگر بندۂ خدا نے وطن میں بھول کر بھی کسی کو خط تک نہ لکھا اور نہ اپنی موت زندگی کی خبر دی بیوی بھی صبر شکر کرکے بیٹھ رہی اور برس دو برس میکے میں رہ کر اسے تجربہ ہو گیا کہ میاں کے سوکھے ٹکڑے میکے کے خوان نعمت سے کہیں بہتر تھے لیکن اب پچھتائے کیا ہوتا ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

کچھ دنوں کے بعد میاں مہر علی نے اپنی دوسری شادی ایک غریب گھر میں کر لی بیوی بہت نیک بخت اور سعید ملی گویا تلافی مافات ہو گئی اور دونوں عیش و عشرت میں بسر کرنے لگے۔

(۴)

موسٰی ندی میں ایک یوروپین لڑکا نہایت حسین گر پڑا اور ڈبکیاں کھا رہا ہے جم غفیر ہے لیکن کسی کی یہ ہمت نہیں ہوتی کہ کود کر نوجوان کی جان بچائے اتفاق سے ایک رئیس عمدہ لباس میں جا رہے تھے بھیڑ دیکھکر وہ بھی اسطرف آنکلے اور لڑکے کو ڈوبتا دیکھکر انسانی ہمدردی کے لحاظ سے آپ بھی دھڑام سے کود پڑے ڈوبتے کو

ٹھنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے لڑکے نے ایک رفیق پایا تو وہ ایسا بدحواس ہو کر لپٹ گیا کہ
قریب قریب دونوں آدمی ڈوبنے لگے مگر رئیس پیراک تھا اس نے اپنے حواس قائم رکھے
سارے تماشائی دعا مانگ رہے تھے خدا نے قبول کر لی لڑکا کمر سے لپٹا ہوا ہے اور وہ
مرد آدمی آہستہ آہستہ کنارے کی طرف آ رہا ہے خدا خدا کر کے دونوں نے نجات
پائی اور تمام لوگ خوش ہوئے - ایک روزنامہ اخبار کے ایڈیٹر صاحب بھی اسی بھیڑ میں
تماشا دیکھ رہے تھے لوگوں سے حضرت کا نام نامی دریافت کیا ایک صاحب نے کہا
آپ انکو نہیں جانتے منشی مہر علی صاحب وکیل دہلوی ہیں آج ہندوستان میں کافی
شہرت رکھتے ہیں بہت نیک اور شریف آدمی ہیں ایڈیٹر خاص یوروپین تھا اسکی غیرت نے
یہ تقاضا نہ کیا کہ ایک محسن قوم کے احسانات پر پردہ پڑا رہے فوراً انکا فوٹو لیا
اور دوسرے دن کچھ مزید حالات دریافت کر کے نہایت چٹپٹی عبارت کے ساتھ اس
خبر کو شائع کیا اور منشی مہر علی کی تصویر بھی شائع کر دی اخبار ہاتھوں ہاتھ فروخت
ہوا منشی مہر علی نے بھی دیکھا جامے سے باہر ہو گئے اور بہت غصہ کیا منہ میں کف بھر لائے
ایڈیٹر کو ہزاروں گالیاں دیں اپنا منہ نوچا - کیا بری ساعت سے میں نکلا تھا کہ
اس آفت کا سامنا ہوا خدا اپنا رحم کرے دیکھیے اب کیا ہوتا ہے افسوس ہزار افسوس
میں تو کہیں کا نہ رہا اور اسی بدحواسی میں اُٹھے ہوئے اپنے ایک دوست ڈپٹی صاحب
کے پاس گئے اور اُن سے کہنے لگے خدا کے واسطے میری مدد کرو میں ایک بلا میں
گرفتار ہو گیا ہوں اب کیا ہوگا بات یہ ہے کہ کل کا اخبار تو آپ نے ملاحظہ فرمایا
ہوگا اس کمبخت نے میری تصویر بھی چھاپ دی اور میرے خاندانی حالات لکھ دیے
لکھنؤ میں میرے خاندان کی ایک بیوی تھی نہایت بدمزاج بدبخت فسادن فتنہ انگیز
بلا سے بدتر میں اسکے ہاتھ سے بہت نالاں تھا آخر اس کمبخت کے ہاتھ سے لکھنؤ چھوڑ کر
حیدرآباد چلا آیا اور آج تک کسی دوست آشنا کو کوئی خط نہ لکھا - پہلے میرے خسر نے

ایک اعلان شائع کیا تھا کہ ہمارا عزیز اس صورت کا گم ہوگیا ہے جو کوئی پتہ لگادیگا پانچسو روپیہ انعام دیے جائیں گے میں نے کچھ دنوں کے بعد یہ چالاکی کی کہ ایک دوست کی معرفت انکو خط بھیجدیا کہ اس آدمی کا انتقال ہوگیا وہ لوگ رو پیٹ کر خاموش ہو رہے اب اس خبر کے شائع ہونے سے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میری پہلی عورت آتی نہو تو میری عزت خاک میں مل جاے اور گھر بھی برباد ہو اس میں کوئی صلاح بتائیے ڈپٹی صاحب نے کہا اچھا آپ کی اس امر میں مدد کروں گا اسٹیشن ماسٹر میرا دوست ہے میں اُس سے کہدوں گا کہ اگر لکھنؤ سے کوئی مسافر زنانی سواری کے ساتھ آئے تو مجھے اطلاع دے منشی صاحب نے کہا لیکن میرا نام نہ بتائیے گا ڈپٹی صاحب بولے استغفر اللہ کیا آپ نے مجھے نرا بیوقوف سمجھ لیا ہے

(۵)

سہ پہر کا وقت ہے ڈپٹی صاحب کی گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہے اور ڈپٹی صاحب اسٹیشن ماسٹر سے کچھ سرگوشی کر رہے ہیں اور اسٹیشن ماسٹر سُن سُن کر گردن ہلا رہے ہیں جب سب سُن چکے تو کہنے لگے اسمیں کچھ دال میں کالا معلوم ہوتا ہے مجھ سے صاف صاف حال کہو تو رہائی ممکن ہے ورنہ ادھوری باتسے میری تشفی نہیں ہوتی اور مجبور ہو کر مجھے آپ کے بیان کی پولیس میں رپورٹ کرنا ہوگی -
ڈپٹی صاحب نے جب اسٹیشن ماسٹر کے تیور بدلے ہوے دیکھے تو کہا معاذ اللہ میں تمھیں ایسا بد باطن نہیں سمجھتا تھا تم نے آج برسوں کی ملاقات کو خاک میں ملادیا لو سُن لو خیر میرے ایک دوست کا راز ہے تم جانتے ہو کہ منشی مہر علی صاحب وکیل میرے ایک دوست ہیں وہ اپنے گھر سے روپوش ہو کر یہاں چلے آئے اسکو ایک مدت دراز ہوی اور آج تک لوگوں کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ زندہ ہیں لیکن ایک ڈوبتے ہوے یوروپین لڑکے کی جان بچانے کے صلے میں ایک انگریزی اخبار

بغیر اطلاع اُنکا فوٹو شائع کر دیا جس سے اُن کو یہ خوف ہے کہ کہیں اُنکی پہلی بیوی صاحبہ انکی جان پہ نازل نہ ہو جائیں اس خوف سے اُنھوں نے مجھ سے مدد چاہی تھی میرا خاص کوئی معاملہ ہے نہ یہ کوئی جرم کی بات تھی مگر تم اتنے بدگمان ہو گئے کہ مجھے یہ راز کھولنا پڑا اسٹیشن ماسٹر صاحب نے فرمایا اچھا آپ اطمینان رکھیں میں آپ کا حکم بجالاؤں گا اور جب ایسا موقع ہوگا براہ راست منشی صاحب کو اطلاع دوں گا۔

(۶)

ایک دن نو بجے دن کو اسٹیشن ماسٹر نے ایک خط میں لکھا۔ ڈیر آج ایک عورت لکھنؤ کے فلاں محلہ سے آئی ہے اور تمھارا مکان دریافت کر رہی ہے ذرا ہوشیار رہو جاؤ۔

منشی صاحب دیکھتے ہی سکتے کے عالم میں ہو گئے اور فوراً اُٹھکر اپنی بیوی سے سارا قصہ گڑگڑا کر بیان کیا اور کہا میں چادر اوڑھ کر چار پائی پر دراز ہوتا ہوں تم کہنا میں ان کی دور کی عزیز ہوں وہ تو آج مر گئے صرف تجہیز و تکفین کے لیے آئی ہوں کچھ دیر کے بعد ایک بگھی آئی اور ایک جوان عورت گھر میں اُتری اور پوچھنے لگی منشی مہر علی صاحب کہاں ہیں بیوی نے نہایت آبدیدہ ہو کر کہا وہ آج رات کو خدا کے پاس سدھار گئے ان کا یہاں کوئی عزیز نہ تھا مجھ سے دور کی عزیز داری تھی اسلیے تجہیز و تکفین کی غرض سے آئی ہوں عورت نے کہا ہے ہے یہ کیا غضب ہو گیا لوگوں ذرا مجھے لاش تو دکھاؤ ایک بند کمرے میں لاش رکھی تھی عورت کو لیگئے اور اندھیرے کے سبب سے اس نے ایک چراغ جلا کر میاں کا مُنھ دیکھا اور خوب رو لی پیٹی اس کے بعد اس نے آنسو پوچھکر اور صرف زیور کا صندوقچہ کر باقی اسباب میں قفل لگا کر کہا اچھا مٹھرو

رہے دو چار عزیز بھی آئے ہوئے ہیں جو ایک مکان میں رہتے ہیں یہ اسباب دکھلا بھی آتی ہوں اور میں خود انکی تجہیز و تکفین کروں گی یہ کہکر وہ صندوقچہ لے کر رفو چکر ہوگئی۔

میاں کو کچھ شک گذرا کہا تم نے یہ کیا غضب کیا میں تو کمرے میں تھا مجھے اسکی کیا خبر تھی کہ وہ اسباب بھی سمیٹ رہی ہے تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی یہ میری بیوی ہرگز نہیں تھی کوئی بدمعاش عورت تھی مجھے اسکی آواز پر شک ہوا تھا مگر جب تم مردہ کہہ چکی تھیں تو کیونکر شک کی حالت میں بول سکتا تھا جب دن بھر دوبارہ وہ عورت واپس نہ آئی تو منشی صاحب کو یقین ہوگیا کہ واقعی وہ میری بیوی نہ تھی اور اسٹیشن ماسٹر نے فریب سے میرا سارا گھر مسوا لیا دو تین روز تک میاں بیوی میں چخ چلا کی ایک کو ایک بیوقوف بناتا تھا منشی صاحب اور ڈپٹی صاحب نے سارا شہر چھان مارا عورت کا کہیں پتہ نہ لگا ایک ٹکٹ کلکٹر سے معلوم ہوا کہ اُس دن لکھنؤ سے کوئی آدمی نہیں آیا تھا ہو نہ ہو یہ اسٹیشن ماسٹر کی بدمعاشی ہے وہ ہمیشہ اپنے دوستوں کو زک دیا کرتا ہے اور اس دغابازی سے اسکی معقول آمدنی ہے آخر منشی صاحب صبر شکر کرکے بیٹھ رہے۔

عشرت لکھنوی

یادِ رفتگان

جیتے جی موت ہے یہ آرزو دل مجھ کو اگلے لوگوں میں کیے دیتی ہے شامل مجھکو
یاد آتے ہیں جو گذرے ہوے احباب مجھے اب کہاں چین مجھے ہائے کہاں خواب مجھے
کیا ستاتی ہے بڑانوں کی محبت دلکو کھینچتی ہے وہ اخوت وہ مروت دل کو
کہیں بیٹھے ہوئے پاؤں تو پکڑ لاؤں میں وہ کہاں ہونگے اب اللہ کہاں جاؤں میں

رکھ کے بھول آیا ہوں یں بھول کے رکھ آیا ہوں
انکو روتا ہوں جنھیں گاڑھ کے پچھتایا ہوں

چھوڑ جانے کے ہیں اپنوں سے مجھے شکوے آج یوں سمجھیے کہ اُکھڑتے ہیں گڑے مردے آج
زہر اگلوانے لگی تلخیِ ایام فراق لب پہ ہے تذکرۂ حسرت و آلام فراق
ہو کے خود زندۂ جاوید مرے یار گئے دل وہ مظلوم ہے سب ملکے جسے مار گئے

سانس باقی ہے تو آہوں کے سہارے ہوں میں
زندہ درگور رہوں ہوں گور کنارے ہوں میں

فکر رہتی ہے اُن ارواح اُن اجساد میں گم عقل گم کیوں نہوں ہوں عدم آباد میں گم
جان مردوں میں ہے جسکی وہی زندہ ہوں میں بنے اک بھول بھلیاں کا تماشا ہوں میں
فکر اجسام میں میں زیر زمیں رہتا ہوں یاد ارواح میں افلاک نشیں رہتا ہوں

محویت شوق کی دیتی ہے مرے دلکو سکون
غم فرقت سے رہائی ہو تو اچھا ہے جنوں

سید ابو الحسن ناطق

تخیّلاتِ رجالی

یہ تو نہیں کہ "رجالی" کوئی پاگل، مجنوں، مخبوط الحواس شخص ہو۔ البتہ اُسکی بعض بعض باتیں مخالفین کی نگاہ سے، جنون کی سرحد سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نظر نہیں آتی تھیں! وہ دن بھر میں کم و بیش چار دفعہ کھاتا تھا، تمام رات پاؤں پھیلا کر سوتا تھا اور کسی مشہور سوز خوان کی آواز پر روتا بھی تھا؛ لیکن اسمیں صنف نازک سے نفرت کرنے کی عادت، معمولی حدود سے بہت وسیع نظر آتی تھی! خدا جانے وہ گریجوبیٹ تھا یا نہ تھا مگر بی۔ اے کا دُم چھلا جا و بیجا تحریر میں استعمال کرنے کا عادی نہ تھا اسکے والد ایک معزز شخص تھے جنھوں نے۔ "رجالی" کا بیان ہے کہ۔ دو دفعہ لاہور کا سفر ایک مرتبہ بھوپال کی سیاحی اور تین مرتبہ بمبئی کا حج کیا تھا! جو کچھ بھی ہو "رجالی" شریف خاندان شخص تھا اور سوائے چند خاص عادات کے بھلا مانس بھی تھا!

ان ہی خاص عادات میں سے اُسکا وہ تنفر بھی تھا جو اُسکو طبقۂ نسواں، حقوق نسواں، تعلیم نسواں، اور ہر ایک نسوانی چیز سے تھا! نسائیت کا وہ پُرجوش مخالف بھی تھا اور اس مخالفت کو حق بجانب بھی سمجھتا تھا! جسطرح نسائی گروہ نسائیت میں شعریت، معصومیت، مظلومیت، اور خدا جانے کیا کیا پا لینے کا عادی ہے، اسیطرح رجالی صنف نازک میں تریا ہٹ، فضول خرچی، تنک مزاجی، چڑچڑا پن، خود سری، تکبر، اور تباہ کن مذاق، بدلائل ثابت کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا! انسانی آبادی کو مقید افکار بنانے کا تنہا ذمہ دار۔ وہ۔ طبقۂ نسواں کو بتاتا تھا! وہ کہتا تھا کہ "عورت فطرتاً ناقابل قدر اور کم قیمت سی چیز ہے۔ وہ اپنے پاؤں پر تمام عمر میں سے کسی وقت بھی

کھڑی نہیں ہو سکتی! اوّل اوّل تو اپنی بھولی باتوں سے باپ کو اپنا کفیل بناتی ہے پھر متاعِ حُسن کی گرم بازاری کے بل پر شوہر کے سر پر اپنی زندگی کا بوجھ ڈالدیتی ہے، اور جب نظروں میں دلفریبی کی چمک زائل ہو جاتی ہے تو بیٹے سے کہتی ہے کہ وہ جنت کو اُسی کی پاپوش کے نیچے سمجھے! وہ تمام عمر اپنی زندگی کا بوجھ۔ مرد پر کسی نہ کسی رنگ میں ڈالے رہتی ہے اور اسی کے بل پر جیتی ہے! پھر غضب یہ کہ "ظالم مارے اور رونے نہ دے" کی طرح بیچارے گھن چکر بن جانے والے مرد کو ظالم بتاتی ہے! خود تو اُسکی بیش بہا آزاد زندگی کو پابندی کے جال میں پھانس کر "زن تیل لکڑی" کے نذر کر دیتی ہے اور خود ہی اسکی چیخ پکار ڈالتی ہے کہ مرد نے اسکی زندگی کو وبالِ جان بنا دیا! مرد فی الحقیقت نہ عورت کو قید کرنا چاہتا ہے اور نہ خود مقید ہونا چاہتا ہے وہ بلوغ کی حد میں داخل ہوتے ہی اپنے سہارے پر کھڑا ہو سکتا ہے اس لیے قید و پابندی اُسکی نظر میں سوائے طوقِ لعنت کے اور کچھ نہیں جچتی! عورت باپ کو فانی چیز سمجھتے ہی اپنا کفیل تلاش کرنے کی فکر میں سرگرم ہوتی ہے۔ پہلے اپنی آزادی کو اپنے مقصدِ حصولِ رزق کے نذر کر دیتی ہے اور پھر نہایت بے پروائی کے ساتھ شوہر کی آزادی و انسانیت کو بھینٹ چڑھا دیتی ہے! طوقِ لعنت کی معاون عورت! پابندی کی موید عورت! مرد کی قربانی چڑھانے کی ذمہ دار عورت!!"

"رجالی" کے تخیلات پر اپنی رائے کی جھول ڈالنا میری عادت نہیں اسلیے ہر دعوے کی سچائی اور کذب کا ذمہ دار "رجالی" ہی سمجھا جا سکتا ہے نہ میں! میں اُسکے خیالات عُریان کو پبلک کے سامنے بلا کسی رنگ چڑھانے کے پیش کر دینے کا مرتکب ضرور ہوتا ہوں! بذاتِ خود مجھے نہ "رجالی" کی تعریف کی ضرورت۔ نہ نسائی کی ہجو کی: میں نسائیت و رجولیت کی باہمی غرض سے جس پر باوجود نقص امن داعی کے

کوئی دفعہ تعزیراتِ ہند عائد نہیں ہوتی۔ بیحد متنفر ہوں! اسقدر ضرور سمجھتا ہوں کہ "رجالی" کی بعض بعض باتیں کسی قدر صحیح مانے جانے کے لائق نظر آتی ہیں! مثلاً خواہشِ نسل کی فکر جسقدر تیز اور پُرجوش عورت میں ہوتی ہے، مرد میں کبھی ہرگز نہیں ہوتی! عورت مرد کو اپنی تنہا ملکیت بنانے کا رجحان ہمیشہ سے رکھتی ہے، خود پیدا کرنیوالے کی آنکھوں میں ایک مرد۔ بشرط انصاف۔ چار عورتوں کا کفیل بننے کے لائق ہے! لیکن عورت سوکن کا نام سُنتے ہی ایسی چراغ پا ہوتی ہے کہ خدا اور رسول کے الفاظ بھی اُسکی تنگ نظری اور خود غرضی کو بجھا نہیں سکتے، وہ کسی طرح فراخدلی کے ساتھ مرد کو چار عورتوں کا کفیل بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی، اور مساوات کے رنگ میں اپنے وجود کو۔ نئی روشنی کے بدولت۔ وحدت الوجود کے حد تک پہنچانا چاہتی ہے!

"رجالی" مساوات سے یکقلم متنفر تھا، وہ کہتا تھا کہ "نسائیت و رجولیت کو مساوات کے رنگ میں۔ برابر مقدار میں ہونے سے کوئی کارآمد مرکب نہیں بن سکتا"! خدا جانے اسکا مذاق آمیز دعویٰ کس حد تک قابلِ تسلیم ہے!

رجالی کی خاص عادات میں سے ان کے دماغ کی بلند پروازی بھی سمجھنی چاہئیے جاڑے کی طویل راتوں میں جب وہ سرِ شام سے خوابِ خرگوش کے استقبال میں بدقسمتی سے تنہا۔ لیٹ کر انتظار کرتا تھا تو اسکا دماغ سبک بالِ تخیلات کی فضائے اثیر میں ایروپلین بنا ہوا نسائیت کی پُرامن راجدھانی پر خدا جانے کیسے کیسے حملے کیا کرتا تھا! ان ہی راتوں میں سے ایک رات کو "رجالی" نے سوچا

"اگر میں عورت ہوتا"

تو کیا کرتا؟ سب سے پہلے تو خیال آتے ہی نسائیت نے آدبوچا اور ننھا سا کلیجہ دھک سے ہو کر بانسوں اُچھلنے لگا۔ مگر رفتہ رفتہ مُنہ زور اشہبِ خیال قبضہ میں آچلا اور "رجالی" نے اپنے مخالفتِ نسائیت کے لحاظ سے ایک خیالی عجائب خانہ کی بنیاد

ڈالنی شروع کردی! "رُجالی" کے دماغ نے عجائب خانۂ نسائی کی تقسیم ذیل کے ٹکڑوں، درجوں، یا پنجروں میں کی تھی:-

درجۂ اوّل:-

اس درجہ میں نمونہ کے طور پر ایسی چند فیشن کی پوجنے والی نوعمر لڑکیاں ہوتیں جو شوہر کی گاڑھی کمائی کو بلا کسی پروا کے ریشمی ساریوں، خوشنما کپڑوں، اور قیمتی زیور کے نذر کر دینا حق بجانب سمجھتی ہیں! جو گھر سے لے کر باہر تک ہر چیز کو مغربی سانچے میں ڈھالنا فخر، اور مغرب کا پس خوردہ چاٹنا عزت سمجھتی ہیں! شوہر قرض دار ہو جائے ایمان فروشی اختیار کرے، چوری کرے یا ڈاکہ ڈالے، مگر اُن کے معیار تہذیب کو نئی پوشاک اور نئی چیزوں سے برابر اُجالتا رہے! سینا، پکانا، بچوں کی تربیت گھر کا حساب کتاب: یہ سب اُنکی اونچی شخصیت کے لیے ناموزوں حرکات ہیں! البتہ وہ کھانا چاہتی ہیں تو عمدہ اور میز پر؛ پہننا چاہتی ہیں تو بہترین درزی کا سلا ہوا، بچوں کو دیکھنا چاہتی ہیں تو سرتا پا "بابا لوگ"؛ سیر کرنی چاہتی ہیں تو لینڈو میں؛ وقت گذارنا چاہتی ہیں تو کلب میں: اور یہ سب کچھ اُسی غریب شوہر کے بل پر جو اخراجات کے بوجھ کے مارے وقت سے پہلے دُہرا اور رشک خُرما سوکھا چھوارہ بنجاتا ہے! ایسی عورتیں اپنی ذات کو قابلیت و لفریبی اور حُسن صبر کا مجموعہ سمجھتی ہیں اگویا اُنکا وجود دلربا بیچارے بدقسمت مرد کے لیے نزولِ رحمت ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اُنکی اطمینانِ رعنائی و دلربائی پر قربان کر دے! ایسی بیوی کرنا اخراجات کے لحاظ سے۔ایک کلنا ہاتھی پال لینے کے برابر قرار پائے گی!

درجۂ دوم:-

اس حجرہ میں ایسی تعلیم یافتہ خاتونیں ہوتیں جو اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو کی لیاقت اور فارسی کی شُدبُد پر ایک ڈگری یافتہ مرد کو اپنے سے کچھ بھی زیادہ لائق سمجھنے کے

کبھی تیار نظر نہیں آتیں! "عصمت" سے لیکر "مخاتون" تک ہر پرچہ انکی نظر سے گذرتا ہے، بعض بعض رشحات قلمی سے سرفراز بھی کیے جاتے ہیں، اور دو چار تصانیف مستقل ان کی دماغی کارپردازی کے ثبوت میں طبع بھی ہو چکی ہیں! اگر کسی نے انگریزی میں بھی ٹانگ لڑائی تو ماں باپ اور شوہر پر ایسا ناقابل برداشت احسان کیا جسکا معاوضہ سوائے ان کا فرشِ راہ بن جانے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا! انکی شخصیت علمیت کی ایسی شمعِ شب افروز ہے کہ شوہر و متعلقین کے پروانے ہر وقت "اسیر بھینٹ" چڑھائے جائیں تو بجا ہے! شہر کی کوئی مجلس نسوانی۔ یا جلسۂ قومی اُنکے قدوم میمنت لزوم سے بچ نہیں سکتا! وہ لکچر بھی دے سکتی ہیں، وعظ بھی کہہ سکتی ہیں، اصلاح قوم پر صفحہ کے صفحہ سیاہ بھی کر سکتی ہیں! گھر کے مصارف جنمیں شوہر کے آرام و آسایش کے اخراجات بھی شامل ہیں۔ اصلاح قوم کے شکنجہ میں کھینچکر صفر کی حد تک پہنچائے جاتے ہیں، اور اس طرح تمام اخبار، رسائلِ نسوان، اور نسائی چندوں کی پوری ڈالی جاتی ہے! یہ عورتیں انگریزی مذاق سے متنفر سہی، مگر اسلامی کٹھ مُلّا پن انپر اس درجہ مسلط ہوتا ہے کہ ہر چیز فضول خرچی کے معیار سے جانچے جانے پر وبالِ جان ہو جاتی ہے! شوہر کو مولویت کا زندہ نمونہ بنانا انکا مقصد عظیم ہوتا ہے! افسوس ہے کہ ڈاڑھی سے وہ خود محروم رکھی گئیں، تاہم شوہر کی ڈاڑھی ان کے قلب قومی کے لیے باعث اطمینان بنجاتی ہے! سنت پر وہ ہمیشہ چلتی ہیں اور فرض پر شوہر کو چلانا چاہتی ہیں! خدانخواستہ آل انڈیا لیگ کانفرنس میں ہو آئیں تو گویا حریت کے سانچے میں ڈھل گئیں؛ گویا بیوی کا وجود گھر میں ایک ایسی زندہ مجلد کتاب کا وجود ہو گیا جو دلائل الخیرات بھی ہے اور امام غزالی کی کوئی مشہور تصنیف بھی۔

درجۂ سوم :-

اس درجہ میں وہ چند متلاشی شہر عورتیں رکھی جاتیں جو اپنی شخصیت کی ہمہ دانی دنظر خیرہ کرنے والی قابلیت کا اعلان نئے نئے رنگ میں کرنا جانتی ہیں! انکے دنیا سے نرالے نام ہی اپنے انوکھے پن کی وجہ سے سُننے والے کو محوِ تجسّس بنانے کے لیے کافی ہیں! یہ اپنی ذات کا ایڈورٹائز۔ علمی رنگ میں اس خوبی کے ساتھ کرنے کی قابلیت رکھتی ہیں کہ اچھے اچھے تعلیم یافتہ حضرات انکے پھندے سے نہیں نکل سکتے بلکہ پھندے میں آجانے کے بعد انھیں علم ہوتا ہے کہ مضموں نگار مس صاحبہ کی قابلیت کا اندازہ جو کچھ ان کے دماغ نے کیا تھا اسکو حقیقت سے وہی نسبت ہے جو ایک عدد کو اپنے جذرالمکعب سے ہوتی ہے! ایسی خاتونیں اپنی ہر صفت کو "ڈیچیمز پلیز" یا "وِنولیا سوپ" کے ایڈورٹزمنٹ کے اصولوں پر مشتہر کرتی ہیں۔ اور اور واقعہ یہ ہے کہ ایڈورٹائز کرنا ان کا حصہ ہے!

درجہ چہارم :-

اس میں ہر قوم وملت، ہر ملک وزمانے کی لاتعداد عورتیں ہوتیں جو ضرورت سے زیادہ بناؤ سنگھار کو زندگی کا مقصد اعلےٰ سمجھتی ہیں۔ پُرانے زمانے میں عطر و تیل ومِسّی سرمہ کی بھرمار تھی تو اب لیونڈر اور پوڈر کا پالش کیا جاتا ہے! یہ طبقہ نہایت بڑا۔ بلکہ کل نسوانی آبادی کا ۹۰ فیصدی حصہ۔ ہوتا! کیونکہ دلربائی کا پیشہ صنف نازک کا ہر جگہ، ہر زمانہ اور ہر آب وہوا میں دلچسپ مشغلہ رہا ہے! مرد کا دل ایک ایسا لوہا سمجھا جاتا ہے جو کبھی ان کے بالوں کے مقناطیس سے تو کبھی ان کی تبسم دنداں نما کے مقناطیس میں گزوں کے فاصلے سے اُڑ کر چپک جاتا ہے ماننا پڑتا ہے کہ، بلاکسی استثنا کے، ہر عورت چاہے وہ کیسی ہی نفرت انگیز چشم ابرو رکھتی ہو۔ اپنے آپ کو مرد کے مائل کرنے کا اہل سمجھتی ہے۔ بدصورتی ایک ایسی چیز ہے جسکو یہ طبقہ محض مرد کے لیے مخصوص کرتا ہے! کسی کے محض عورت

ہوتے کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ وہ بدصورت نہیں ہوسکتی - اور بدصورت بھی ہو تو، مرد کے لیے پھر بھی قابلِ پرستش قرار پاتی ہے! کسی کو محض اپنی سیاہی زلف پر ناز ہے، تو کسی کو سرخ سفید رنگ پر: کسی کو ایک جوڑی چلتی ہوی آنکھوں پر فخر ہے، تو کسی کو صراحی دار گردن پر! غرض تمام بدنمائی کے باوجود کوئی نہ کوئی چیز ایسی ضرور ہے جس کے بدولت وہ ہر مرد کو اپنا شکار ہو جانے کا ایمان کامل رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے صنفِ نازک کا نوّے فی صدی حصہ وہ قرار پاتا ہے جو مرد کو اپنا شکار جائز سمجھتا ہے اور تیرِ نظر کے استعمال میں اپنے آپ کو قادر انداز مانتا ہے!

رات زیادہ آچکی تھی! رجالی کا دماغ عجائب خانہ کی تکمیل میں مصروف ہوتے ہوتے، شہر خموشاں کی سرحد میں داخل ہوگیا اور "رجالی" خراٹے لینے لگے!

امید کی جاتی ہے کہ - بشرط بیداری - آیندہ کسی وقت "رجالی" کے خواب کی بسیط داستان سُننے میں آسکے!!

"جُان بُل"

غزلیات

حضرت مولانا ثاقب قزلباش لکھنوی

چمن کا ذکر کیا اب تو خدا کو یاد کرتے ہیں — خوشی صیاد کو ہوتی ہے جب فریاد کرتے ہیں
خدا آباد رکھے ہمصفیرانِ گلستاں کو — جو کوئی پھول کھلتا ہے تو ہمکو یاد کرتے ہیں
ہماری داستانِ غم رولاتی ہے زمانے کو — وہ ہم ہیں جو زبانِ غیر سے فریاد کرتے ہیں
اسیرانِ قفس خود بھی بہت کچھ کہہ گزرتے ہیں — چمن کے تذکرے آپس میں جب صیاد کرتے ہیں
نہیں معلوم میں کس حال میں ہوں باغِ عالم میں — قفس والے بھی مجھکو دیکھکر فریاد کرتے ہیں
عدو صیاد و گلچیں کیوں ہوے میرے نشیمن کے — یہ تنکے بھی ہیں اس قابل جنھیں برباد کرتے ہیں
خود اُنکا حسن میری دادخواہی اُنسے کرتا ہے — وہ آئینہ لیے ہیں اور مجھکو یاد کرتے ہیں
لحد پر چلنے والے تھم کہ ہم کچھ کہہ نہیں سکتے — زمیں رکھتی ہے منھ پر ہاتھ جب فریاد کرتے ہیں

سرِ گورِ غریباں کچھ نہ پوچھو حالِ دل ثاقب
زمانہ جن کو بھولا ہے ہم اُن کو یاد کرتے ہیں

حضرت مولانا عشقی لکھنوی

تنِ بیجاں میں جان آتی ہے لیکن دم نکلتا ہے — مسیحا بن کے کوئی قاتلِ عالم نکلتا ہے
وہ عالم ہے کہ منھ پھیرے ہوے عالم نکلتا ہے — شبِ فرقت کے غم جھیلے ہوؤں کا دم نکلتا ہے
وہاں بالوں میں کنگھی ہو رہی ہے خم نکلتا ہے — یہاں رگ رگ سے کھنچ کھنچ کر ہمارا دم نکلتا ہے
الٰہی خیر ہو اُلجھن پہ اُلجھن بڑھتی جاتی ہے — نہ میرا دم نہ اُنکے گیسوؤں کا خم نکلتا ہے
ٹھہر اے دل ابھی احوالِ محشر پوچھے دیتے ہیں — کوئی رازِ محبت کا اگر محرم نکلتا ہے
نہیں چھوٹے بھی اُسکو امتحاں گاہِ محبت میں — جو دامن زخم کا آلودۂ مرہم نکلتا ہے

نا ہو جا کہا تنگ گریہ طاقت گداز آخر　　بخار دل کہیں رونے سے اے شبنم نکلتا ہے
گ دل کوئی شاید کھل چلی ہے نشتر غم سے　　لہو بھی آنسوؤں کے ساتھ اب کم کم نکلتا ہے
یامت ہی ہو جائے جو پردہ سے نکل آؤ　　تمہارے منھ چھپانے میں تو یہ عالم نکلتا ہے
بظاہر کر دیا تھا بند جن کو چارہ گر تو نے　　پھر ان زخموں سے رس رس کر لہو ہر دم نکلتا ہے ۲
شکستِ رنگ رخ آئینۂ بیتابیِ دل ہے　　ذرا دیکھو تو یونہی کر غمزدوں کا دم نکلتا ہے
غرض پینے سے ہے ساقی وہ چلو سے بھی ممکن ہے　　تکلف برطرف بیکار جام جم نکلتا ہے
نگاہ التفات مہر اور اندازِ دل جوئی　　مگر اک پہلو سے بیتابیِ شبنم نکلتا ہے
کھلے گا جب کھلے گا منھ کسی کے دادخواہ کا　　ترا اے صور محشر کیوں ابھی سے دم نکلتا ہے

صفی کشتہ ہوں ناپرسانیوں کا اہل عالم کی
یہ دیکھوں کون میرا صاحبِ ماتم نکلتا ہے

حضرت مولانا عزیز لکھنوی

بڑھتی نہ احتیاط دلِ ناصبور کی　　یہ آگ ہے لگائی ہوئی برق طور کی
حسرت تھی قلب نور میں تیرے ظہور کی　　تقدیر جگی برق تجلائے طور کی
جنبش میں ہے حجاب دلوں میں ہے اضطراب　　یہ سب علامتیں ہیں کسی کے ظہور کی
دیکھے بغور کوئی وسیع النظر اگر　　صحرا ہے اعتبار ہے خاک ان قبور کی
آخر حجاب ناز میں وہ مسکرا دیے　　کیسی ضدیں تھیں یہ ارنی گوئے طور کی
گئے ہیں وہ تو پاس بلائے انھیں کوئی　　اب سوجھتی نہیں ہے کوئی چیز دور کی
اس نے اپنے رنگ میں بدلا ہے نام حسن　　اک وہم دلفریب ہے تخئیل حور کی
جس سے بنا ہوئی ہے ہیولائے عشق کی　　کچھ خاک تھی وہ میرے دل ناصبور کی
بہکے بزم وعظ میں اک جام پی لیا　　کب تک رکھیں امید شراب طہور کی
رہتا نہیں ہے کوئی زمانے میں کیا جواں　　اللہ کوئی حد ہے تمہارے غرور کی

جس نے سُنا کبھی مرے مرنے کا واقعہ
ہمدردوں کے اُنسے شکایت ضرور کی

بیمارِ غم ہے منتظرِ حکم آخری
اب چاہیے ہے صرف اجازت حضور کی

ذرات میں فضا کے تموج ہے قہر کا
آشوب گستر آہ کسی نے ضرور کی

بیمارِ غم پر آپ نے احسان تو کیا
اتنا مگر کہوں گا کہ غفلت ضرور کی

واعظ برا نہ جان محبت وہ روح ہے
جو دُردِ تہ نشیں ہے شراب طہور کی

کانٹے زبان حضرت واعظ میں پڑ گئے
تعریف کرتے کرتے شراب طہور کی

دریا مہیب رات اندھیری کنارہ دور
کس کو بھلا امید یہاں سے عبور کی

شاید کہ مرگیا ہے اس انداز پر کوئی
ایجاد ہو رہی ہیں ادائیں غرور کی

شکوہ ہے مجکو فطرت ہستی فریب سے
اُسکو تو اطلاع تھی ان سب امور کی

مدت سے جذب ہو رہی تھی اک نگاہ شوق
آخر کو شکل بن ہی گئی برق طور کی

دل تابعِ کشش تھا کشش تابعِ جمال
ہاں ہاں محبت آپ سے کی اور ضرور کی

اک بات تھی کہ چبھ گئی دل میں مرے عزیز
بھولوں گا میں ہنسی نہ شکستہ قبور کی

حضرت مولانا حسرت موہانی

تجھکو پاس وفا ذرا نہ ہوا
ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

جان عاشق نثار دوست ہوئی
شادیٔ مرگ کا بہانہ ہوا

کٹ گئی احتیاط عشق میں عمر
ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا

تیرے اس التفات کا ہوں غلام
جو ہوا بھی تو برملا نہ ہوا

حسن کی شان سادگی سے بڑھی
طرۂ زلف گردوتا نہ ہوا

کچھ عجب چیز ہے وہ چشم سیاہ
تیر جس کا کبھی خطا نہ ہوا

رو برو اُن کے کچھ نہیں معلوم — کیا ہوا بے خودی میں کیا نہ ہوا
خُم کے خُم غیر پی گئے ساقی — ہمکو اک جام بھی عطا نہ ہوا
حیف ہے اُس کی بادشاہی پر — تیرے کوچے کا جو گدا نہ ہوا
مر گئے ہم تو مٹ گئے سب رنج — یہ بھی اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
ڈر گیا اُس نگاہ بر ہم سے — دل کو یارائے التجا نہ ہوا
جب تلک میرے دل میں جان رہی — دردِ مایوسی مرحبا نہ ہوا
مل گئی مجھکو صبر عشق کی داد — وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہوا

قانعِ رنجِ عشق تھا حسرت
عیش دنیا سے آشنا نہ ہوا

حضرت آشفتہ لکھنوی

وہ ہمدردی سے سُننے آئے ہیں پھر داستاں میری — خداوندا مرے قابو میں رہیو یا زباں میری
زمیں تنگ ہو رہی ہے دشمن نام و نشاں میری — بنائینگے میرے احباب اب تربت کہاں میری
دل زخمی میں ٹانکے دے دیے یہ کیا قیامت کی — مٹا دی بخیہ گر کیوں لذت دردِ نہاں میری
ملا ہے مدتوں کے بعد اب فرمانِ آزادی — نکالی جا رہی ہیں بیڑیوں سے ہڈیاں میری
بٹھاتی ہے مجھے ہر ہر قدم پر دوری منزل — دل بیتاب وہ اگلی سی طاقت اب کہاں میری
سُنا ہے جا بچنے آتے ہیں وہ اپنے اسیروں کو — سمیٹی جا رہی ہیں جا بجا سے ہڈیاں میری
سر محشر شکایت میں کسی کا نام جب آیا — بڑی مشکل سے آئی میرے قابو میں زباں میری
فلک جلاد تم بے مہر اور تقدیر برگشتہ — خدا جانے کہاں سے خاک پہنچیگی کہاں میری

الٰہی خیر کرنا رنگ بیڈھب ہے زمانے کا
سُنا کرتا ہے اکثر جھک کے باتیں آسماں میری

جناب عبدالباری صاحب آسی

وہ بت نا آشنا ہے اُسکو کیونکر آشنا کروں　　تو ہی انصاف سے کہہ اے دلِ مضطر میں کیا کروں
تمھارے غم گذراں صبر کوئے موت تھوڑا سا　　وہ مجھپر کچھ جفا کرے میں اس سے کچھ وفا کروں
زباں ہی کا ٹنا اچھا مرا سر ہی قلم کرنا　　بس اتنی سی اجازت دو کہ عرضِ مدعا کروں
دل ایسا پس گیا موجِ خرامِ نازِ دلبر سے　　جواب چاہوں تو دل میں بھی نشانِ نقشِ پا کروں
کہا کرتے ہیں مرنا ہے حیاتِ عاشقِ مضطر　　مرا مرنا جو جینا ہے تو میں خود کو فنا کروں
سنا ہے یہ کہ کعبے میں کبھی رہتے تھے بت پہلے　　وہاں بھی اُسکو ڈھونڈھوں فرض یہ بھی ادا کروں

خدا میری دعا میں دے اگر تاثیر اے آسیؔ
تو سب سے پہلے آہِ نارسا کو میں رسا کروں

حضرت رضاؔ صدیقی الہ آبادی

نامرادی میں ترا نام وہ کر جاتے ہیں　　رشکِ دشمن میں جو بےموت ہی مر جاتے ہیں
دشتِ وحشت کی بڑھی آبلۂ پا سے بہار　　یہ وہ موتی ہیں جو کانٹوں پہ بکھر جاتے ہیں
سحر آمیز ہیں کس درجہ تمھارے انداز　　آنکھوں ہی آنکھوں میں تو دل میں اُتر جاتے ہیں
رشکِ دشمن نہ سہی آپ ہی کا جور سہی　　مرنے والے تو کسی طرح سے مر جاتے ہیں
ابھی کچھ دیر بھی تو آپ کو آئے نہ ہوئی　　پھر یہ جلدی ہے کہ چھوڑو ہمیں گھر جاتے ہیں
غیر کے ساتھ کبھی اور کبھی تیغ بہ کف　　اپنے بیمار کی پرسش بھی وہ کر جاتے ہیں
روز ہو جاتے ہیں دو چار شہیدِ ابرو　　روز صدقے ترے خنجر کے اُتر جاتے ہیں
لطف دیتا ہے اُن آنکھوں کا حیا سے جھکنا　　جب وہ پہلو سے مرے وقتِ سحر جاتے ہیں
تیغ و شمشیر کی حاجت نہیں کچھ اُنکے لیے　　بانکے تیور کی اداؤں سے جو مر جاتے ہیں
اک یہ قسمت ہے جو بن بن کے بگڑتی ہی رہی　　اک وہ گیسو ہیں بگڑ کر جو سنور جاتے ہیں
کوستے ہیں وہ مجھے منہ پہ مرے یہ کہہ کر　　ہم دعائیں جنھیں دیتے ہیں وہ مر جاتے ہیں
اپنی جلتی تو بہت کرتے ہیں نالے میرے　　شبِ غم آکے تسلی مری کر جاتے ہیں

اے رضا ہے وہ غضب وقت قیامت کی گھڑی
میرے گھر ہو کے جو وہ غیر کے گھر جاتے ہیں

حضرت باسط بسوانی

ہوتی ہے بلبلِ نالاں کی صدا بھی اچھی — تم جو سن لو تو مری آہ رسا بھی اچھی
غیر کے کہنے سے کرتے ہو وفا کیا حاصل — اپنی خاطر سے کرو تم تو جفا بھی اچھی
لطف شوخی کا نہیں جان کے شوخی کرنا — ہو بناوٹ سے جو خالی تو حیا بھی اچھی
مژدۂ وصل بنے کاش اجل کا پیغام — شادیٔ مرگ کی صورت میں قضا بھی اچھی
ہو مبارک تجھے گلگشتِ چمن اے لیلےٰ — تیرے مجنوں کو تو جنگل کی ہوا بھی اچھی
دشمنی شیخ سے مجھکو نہ برہمن سے ہے بیر — دیر بھی خوب ہے کعبہ کی فضا بھی اچھی

خون ناحق کا مرے کون ہے پرساں باسط
ضد ہے قاتل کو کہ ہے اس سے حنا بھی اچھی

جناب امین احسن صاحب بسمل

ہے فسونِ نگہِ شوق جو نادانوں پر — یہ ڈوپٹے نہیں ٹھہرینگے کبھی شانوں پر
بل ہے ابرو پہ نگاہوں میں چمک تیغ بہ ہاتھ — آج جوبن ہے ترے حسن کے دربانوں پر
یہ جو دیکھا ہے کہ بلبل ہے قفس تک میں بھی شاد — بجلیاں گرتی ہیں صیاد کے ارمانوں پر
تو جفا ترک نہ کر یہ بھی مسیحائی ہے — اے ستمگر یہی احسان ہو دیوانوں پر
عبرت انگیز ہے محفل سے پشیماں اٹھنا — رحم آتا ہے مجھے آپ کے مہمانوں پر

شکر قاتل کا ادا ہو نہیں سکتا بسمل
ایک احسان یہ بھاری ہے سب احسانوں پر

[illegible]

اور ایک خوبصورت [illegible]

[illegible] ہی [illegible]

چھائیاں صاف [illegible] کیا ہے

[illegible] کے [illegible] طبیب کی [illegible] ہے

چہرہ کو خوبصورت بنانے والا احسن و خوبصورتی پیدا کرے [illegible] داغ دور [illegible]

کالا رنگ گورا ہو جاتا چہرہ [illegible] کے مانند خوبصورت اور [illegible] کے [illegible]

[illegible] چہرے کے [illegible] ہے [illegible] صاف [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہو جاتا ہے [illegible]

[illegible] کے [illegible] حال میں عجیب [illegible]

[illegible] کے [illegible] ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کی یادگار



سنہ ۱۹۱۶ء کی کالاری جنتری نہایت خوبصورت اعلےٰ درجہ کے چکنے کاغذ پر چھپی ہے اور بلاقیمت (محصولڈاک) قدردانوں کے پاس بھیجی جاتی ہے اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ایک کارڈ پر دس متفرق جگہ کے شریف لکھے پڑھے اشخاص کے نام اور پورا پتہ لکھ کر بھیجدیجئے۔ جنتری بذریعہ ڈاک آپکی خدمت میں روانہ کردی جاے گی۔

تندرستی کی گفتگو

اپنی اپنی صحت کو درست رکھنے کے لیے امیر سے غریب تک فکر میں رہتے ہیں اور اپنی من مانی جسکو جو سوجھتی ہے ویسا ہی کرتے ہیں۔ دولتمند۔ گھی۔ دودھ۔ میوہ وغیرہ کھاتے ہیں اور قیمتی دوا کی تلاش کرتے ہیں۔ غریب گرم مرچ تیزی۔ بوٹی۔ اور چھلکے کے کھیچ میں رہتے ہیں۔ اس جاڑے کے موسم میں ایسے مقویات کا کھانا بھی نہایت مفید ہوتا ہے کیونکہ اس موسم میں ہر چیز مریض کے موافق ہوتی ہے اس فکر او دقت کو دور کرنے کی نہایت ہی آسان ترکیب ہے جسمیں نہ تو زیادہ پریشانی ہوتی ہے اور نہ اسقدر لیاقت سے باہر خرچ ہے وہ ڈاکٹر ایس کے برمن کی مقوی [illegible] کی گولیاں ہیں۔ آپ بھی آزمائش کرکے دیکھیے۔ یہ بھوک کو بڑھاتی ہیں۔ اور خون کو نیا پیدا کرتی ہیں۔ جوانی میں بے احتیاطیوں کی وجہ سے جو خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جوانی میں بڑھاپے کی سی حالت ہو جاتی ہے۔ یہ سب شکایتیں دور کرکے نیا خون اور صفا جوش پیدا کرتی ہیں۔

لال شربت　　　لال شربت　　　لال شربت

[illegible] لال شربت [illegible] لال شربت [illegible]

[illegible]

ڈاکٹر [illegible] کلکتہ

معاشرتی، تمدنی، علمی، ادبی [illegible]

[illegible]

ایڈیٹر [illegible] بیگ [illegible]

محمد [illegible] صاحب بیگ [illegible]

[illegible]

قواعد

(۱) "تمدن" ہر ماہ کی ۱۷ تاریخ کو لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے

(۲) ایسے مضامین جن سے اخلاق پر بُرا اثر پڑے یا ذاتیات سے بحث ہو یا سیاسی پہلو لیے ہوئے ہوں درج "تمدن" نہیں ہوتے۔

(۳) مضامین نظم و نثر ہر ماہ کی ۳۰ تاریخ تک آجانے چاہئیں۔

(۴) جو مضمون کسی دوسرے رسالے میں شائع ہو چکا ہو اُسکو "تمدن" کے لیے ارسال نہ کرنا چاہیے۔

(۵) اگر کسی صاحب کے پاس ڈاکخانہ کی غفلت سے اتفاقاً کوئی نمبر نہ پہنچے تو اُسی ماہ کی ۳۰ تاریخ تک طلب کریں ورنہ بعوض چار آنے کے ٹکٹ آنے پر روانہ ہوگا۔

(۶) ناتمام مضامین درج "تمدن" نہیں ہو سکتے۔

شعلہ

وہ جو کوہ طور پر بھڑکا تھا۔ وہ جو فاران کی چوٹیوں پر جلوہ گر ہوا تھا اب کاغذی لباس پہن کر ایک رسالہ کی شکل میں نمودار ہے۔ ادبی روح پھونکے گا۔ اخلاقی وعظ سنائے گا۔ نورانی شعلوں کی تابش سے نفسانی ظلمتوں کو نیست و نابود بنائے گا۔ وہ سینے جو آتش محبت سے سوختہ نہیں۔ وہ قلوب جو سوز دروں سے خالی ہیں اسطرف متوجہ ہوں عشق الٰہی کی لپٹیں گداز طبیعتوں سے لپٹنا چاہتی ہیں شاہد حسن بے نقاب ہو کر مشتاق آنکھوں کو فرحت پہنچانے کے لیے حاضر ہے۔ پس شعلہ کی خریداری کے لیے جو ہر مہینے آپکی وابستگی کا بہترین مجموعہ ہے۔ درخواستیں روانہ کیجیے لکھائی چھپائی بہت عمدہ قیمت سالانہ درجہ عام دو روپیہ آٹھ آنے (عہ) مع محصول۔ نمونہ چار آنے کے ٹکٹ پر بھیجا جاتا ہے۔

المشتہر

منصرم رسالہ دفتر شعلہ محلہ چوڑی گران دہلی

تمدن

جذبات الاقوام

(گذشتہ سے پیوستہ)

ہر انسانی کائنات جو اسوقت مختلف اقوام کے اندر تقسیم شدہ ہے اور جو تقسیم دن بدن ایک مستقل حدود میں آتی جاتی ہے اس کائنات میں ایک مضبوط حق اور مضبوط دعویٰ رکھتی ہے اور ہر انسانی کائنات یا ہر ہر قوم کو شخصیت کی طرح ایک کشش اور ایک جذب حاصل ہے اگر ہم جذبات شخصیتوں کا احساس رکھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جذبات الاقوام سے ہم نابلد رہیں وہی قوم بحیثیت ایک قوم کے دائرۂ حیات میں رہ سکتی ہے جو دوسری اقوام کے جذبات سے واقف ہے اور جو ایسی حس رکھتی ہے جو قوم اپنی ہمسایہ اقوام کے احساسات اور تصرفات و جذبات سے واقفیت نہیں رکھتی وہ دوسرے الفاظ میں اپنی [illegible] اور اپنی ہستی کے احساسات و جذبات سے بھی واقفیت نہیں رکھتی وہ ان جذبات سے ناواقف ہے جو دوسری اقوام کو اپنے اندر جذب کر سکتے ہیں طبعاً

ہر ہستی کی یہ آرزو رہتی ہے کہ اُسے کوئی دوسرا جذب نہ کرسکے دوسرے اُسمیں وقتاً فوقتاً جذب ہوتے رہیں۔ حسین ہمیشہ چاہتا ہے کہ اُس کی شمع حسن کے سب پروانہ ہوں حسن کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ اُسکی مدح وتعریف سے کوئی زبان خالی نہ رہے ہر کوچہ میں اُسکا اثر ہو اور ہر منزل میں اُسکی آو بھگت کی جائے بدصورتی بھی گو بجائے خود ایک طاقت اور ایک کشش رکھتی ہے مگر وہ محض ایک ہوس ہوتی ہے اور بہت کم لوگ طبعاً اس طرف مجذب ہوتے ہیں یہی حالت اُس شخصیت اُس کنبہ اور اُس قوم کی ہوتی ہے جو دوسری شخصیتوں کنبوں اور قوموں کے مقابلہ میں کوئی حسن اقبال۔ حسن تدبر حسن تمدن اور حسن طریق عمل رکھتی ہے وہ ہمیشہ اس خواہش میں رہتی ہے کہ دوسری قومیتیں اُس میں رفتہ رفتہ مجذب ہوتی جائیں یہاں تک کہ سر سے پاؤں تک اُن میں رنگی جائیں اور اُسکا روپ اختیار کریں اور اُسی کا کلمہ پڑہیں۔

بوے تو ز بوے گل شناسد
آن را کہ دماغ بوشناس است

اگر کہا جائے کہ کسی قوم کی ایسی خواہش اور ایسا ارادہ اور ایسا طریق عمل عدل و انصاف یا ضابطہ قدرت کے خلاف ہے تو یہ ایک ایسی غلطی ہے جو صرف اس وجہ سے عاید ہوتی ہے کہ ہم ضابطہ قدرت اور اسکے عدل وانصاف سے واقفیت نہیں رکھتے۔ ہر کھلے میدان میں جو قدرت کی جانب سے کل کائنات کے حصہ بخرے میں رکھا گیا ہے۔ اور جو شرا لگا سے آزاد ہے ہر شخص اور ہر قوم دوڑ دھوپ کی کامل آزادی رکھتی ہے اور ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی بساط کے مطابق اُس سے اپنا حصہ لے اور اپنی آسائش کے حاصل کرنے میں زور لگائے۔

کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ قدرتی فیضان کے حاصل کرنے سے کسی دوسری

قوم کو روکے اور مزاحمت کرے ہر شخص اور ہر قوم قدرت کی جانب سے وافر وسائل سعی اپنے قبضہ میں رکھتی ہے کوئی وجہ نہیں کہ اُن سے کام نہ لیا جائے اور قسمت آزمائی نہ کی جائے۔ بمصداق۔

لیس للانسان الا ما سعٰی

جب قدرت مفت بخشتی ہے تو ہمیں بھی اپنی مساعی کے ماتحت مفت ہی لینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ گو ہماری کوششیں بھی بجائے خود بہت کچھ قیمت رکھتی ہیں لیکن بعض سوا اس کا لحاظ میں ہمیں ایک بڑی حد تک مفت ہی ملتے ہیں کوئی قوم قوت جاذبہ سے خالی نہیں بعض اقوام کا جاذبہ رفتہ رفتہ بعض ناقص بواعث کے ماتحت کمزور پڑ گیا ہے اور بعض کا ترقی پا چکا ہے ہر جاذبہ کی یہ طبعی خواہش ہے کہ

(الف) وہ دوسرے جاذبہ پر غالب آئے۔

(ب) دوسرے اُس میں جذب ہو جائیں۔

(ج) اگر وہ اوروں کو جذب نہیں کر سکتا تو خود کسی میں جذب نہ ہو

(د) یا کم سے کم یہ کہ اُسکا جاذبہ بجائے خود ثابت اور قائم رہے۔

(ہ) اُس کا جاذبہ گویا اُسکی ہستی ہے۔

ہر جاذبہ دوسرے جاذبہ کے مقابلہ میں بایں مدعا لگا رہتا ہے کہ اُس کے ہند سے اُس کی قوت اور اُسکے دوٹ بڑہیں وہ بہ نسبت اوروں کے ممتاز اور ایک جداگانہ ہستی ثابت ہو اور قائم بھی رہے اور اگر کوئی دوسری ہستی اُسکے متمتعات تمدنی و اقتصادی پر قابض ہونا چاہے تو اُس کے پاس اُنکی حفاظت کا سامان اسقدر ہو کہ اُسے کسی قسم کی مایوسی کا سامنا نہ ہو نہیں کہ وہ دوسری قوم یا دوسری قومیں اُسکی موجودگی میں اُسکی طرح اپنے متمتعات کی

نگراں نہ رہیں بلکہ یہ کہ اُنکی ہستی مقابلتاً محفوظ ہے جس طرح ایک ہوشیار کسان اور کسانوں کے مقابلہ میں اپنی کھیتی باڑی کی حفاظت کرتا اور اسکی ترقی میں کوشاں رہتا ہے اور اپنے فوائد کو ہاتھ سے نہیں دیتا اور ہر مناسب موقع کی تلاش میں لگا رہنا ایک فرض سمجھتا ہے اور اسی طرح اسکے مقابلہ میں دوسرے کسان بھی اپنی اپنی جگہ پر کوشاں رہتے ہیں ایسے ہی اقوام کا بھی حال ہے۔

قوموں کے ہی نہیں بلکہ شخصیتوں کے جاذبات یہی ہوتے ہیں جن پر اُنکی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے جاذبات کے کم ہونے یا نہ رہنے سے قومیں برباد ہوجاتی ہیں اور رفتہ رفتہ اُنکی ہستیاں مٹ جاتی ہیں مٹ جانے اور نہ رہنے سے یہ مطلب ہے کہ

(۱) یا تو وہ بالکل ہی مٹ جاتی ہیں۔

(۲) یا ایسی کمزور ہوجاتی ہیں کہ اُن کا عدم وجود برابر ہوجاتا ہے۔

قوموں کے جاذبات وہی جاذبات ہوتے ہیں جو شخصیتوں کے ہیں شخصیتیں جس قدر جذبات جداگانہ رکھتی ہیں وہ قومی رنگ میں بصورت اجتماعی قومی جذبات کی صورت اختیار کرتے ہیں شخصی جذبات انفرادی ہیں اور قومی جذبات اجتماعی قومی یا اجتماعی جذبات کی اقسام حسب ذیل ہوسکتی ہیں۔

(الف) مذہبی جاذبہ۔

(ب) [illegible]قی جاذبہ۔

(ج) تمدنی جاذبہ۔

(د) اقتصادی جاذبہ۔

ان چاروں جذبات کے سوائے ایک پانچواں جاذبہ سیاسی بھی ہے جو ہماری بحث سے خارج ہے۔ ہر قوم کا یہ فرض اعلےٰ ہے کہ وہ اپنے جاذبات کے قائم رکھنے کی

کوشش میں رہے نہ صرف قائم رکھنے میں ہی بلکہ اس میں بھی کہ اُسکے جاذبات مترقی ہوں اور بہ خوش اسلوبی اُن سے کام لیا جا سکے اور دوسری قومیں رفتہ رفتہ اُن کی متمنی رہیں اور انہیں شامل ہوکر اُن کی تعداد اور مجموعہ میں اضافہ کریں اُنکا مذہب۔ اُن کے اخلاق اُن کا تمدن اُن کے اقتصادیات اس عمدگی اور اس خوش اسلوبی سے موثر ہوں کہ دوسری شخصیتوں اور قوموں کے دل و دماغ اُنکی طرف رفتہ رفتہ متوجہ ہوتے جائیں۔

کسی قوم کے جاذبات قومی اُس صورت میں مترقی اور پاکیزہ رہ سکتے ہیں جب کسی قوم کی قومی حسیات قومی ادراکات قومی تصرفات اور مترقی جذبات کی رفتار میں سبکی۔ تیزی تمکنت۔ استقلال پیدا ہوتا جائے اور خود قوم کو یہ اعتماد ہو کہ اسکی قومی قوتیں اس درجہ پر پہنچ چکی ہیں کہ جلب منافع اور سلب مضار کے اعتبار سے صحیح قوتیں خیال کی جا سکتی ہیں موثر بھی ہو سکتی ہیں اور متاثر بھی۔

جب تک قومی قوتوں قومی جذبات پر اعتماد نہ ہو تب تک کوئی قوم دنیا میں برقرار اور قائم نہیں رہ سکتی قوموں کو باصول خودداری ایسی اعتمادی قوتیں پیدا کرنی چاہئیں جو خود تو کسی میں جذب نہوں لیکن دوسروں کو خود میں جذب کرنے کی طاقت موثرہ رکھتی ہوں۔ یہ بات اُسوقت تک نہیں ہو سکتی کہ جب تک قوموں میں خودداری کا مواد پیدا نہ ہو۔ پیدا ہی نہ ہو بلکہ مستقل طور پر رہے بھی اور اُس سے کام بھی لیا جائے جو قوم دوسروں کو خود میں جذب کرنے کی طاقت نہیں رکھتی وہ ایک ایسا جمود رکھتی ہے جو بمنزلہ سکرات یا بیہوشی کے ہے

دنیا میں ہر چیز خصوص زندہ اشیاء کی زندگی حرکت ہے جو جمود کے خلاف ہو حرکت کا اثر یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی اور استقامت پذیر ہوتی جاتی ہے اور اُسکا دائرہ بڑھ کر خارجی اشیاء کا محیط ہوتا ہے جس سے اُسکی طاقت موثرہ

اور متاثرہ دونوں رنگوں میں مترقی ہوتی ہے دیکھو جو مذہب اپنے اندر یہ طاقت نہیں رکھتا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اس میں منتقل ہوسکیں اُسکا جاذبہ یا ہاضمہ قوی تیار نہیں ہوتا اور وہ رفتہ رفتہ یا تو کمزور پڑجاتا ہے یا اُسکا دائرہ کم ہوتے ہوتے بالکل ایک نقطہ رہ جاتا ہے یہی مثال قوموں کی بھی ہے وہی قوم ترقی پذیر ہوگی جس کا جاذبہ اور ہاضمہ قوی ہو جاذبہ اور ہاضمہ اُس صورت میں قوی ہوسکتا اور بڑھ سکتا ہے کہ جب اُسکے وسائل صحیح حاصل اور موجود ہوں ایسے وسائل حسب ذیل ہوسکتے ہیں یا ہونے چاہییں۔

(۱) حسن و قوت مذہب۔

(۲) حسن تمدن۔

(۳) حسن اخلاق۔

(۴) حسن اقتصادیات۔

(۵) حسن اتفاق و خلوص۔

یہی خمسہ ضروریہ ہے جو قوموں کو عروج اور اقبال کی راہیں دکھاتا ہے اسی کی برکات قوموں کو اپنے مرکز پر قائم رکھتی ہیں وہ قوم جو بدقسمتی سے گرچکی ہے غور کرے اور دیکھے کہ کیا اُس میں یہ خمسہ ضروریہ پایا جاتا ہے اور کیا اُس کی اُسے ضرورت ہے اور کیا اس کمی کی وجہ سے اُسکی حالت اور اُسکا رشتہ کمزور پڑتا جاتا ہے اگر غور کرنے کے بعد واقعی یہ کمی پائی جاتی ہے تو اُسکا فرض ہے کہ وہ غور کر دیکھے کہ کس قدر فاصلہ پر اُسکا ابتدائی مرکز رہ گیا ہے۔ ہر قوم کا مرکز اور کرہ جداگانہ ہوتا ہے یہ کہنا کہ کل قومیں ایک ہی مرکز اور ایک ہی کرہ پر ترقی کرسکتی ہیں غلط ہے ہر قوم مشہور کرہ کا مرکز ترقی کرہ عروج جداگانہ ہوتا ہے اُسی پر آن کر وہ ترقی اور عروج حاصل کرسکتی ہے۔

اگر کسی قوم نے مذہبی راہوں سے ترقی کی منزل پائی ہے تو وہی راہیں اُسکے واسطے موجب عزت و احترام ہوسکتی ہیں دوسری راہوں کا لینا اُس کے واسطے اگرچہ بادی النظر میں یا چندروزہ خوشنما اور خوش آیند معلوم دیتا ہے لیکن درحال وہ سماں ایک فریب وہ تخیل ہے جو قوم دوسری اقوام کے اصولی جذبات یا مرکزی جذبات کی مقلد ہے اور اپنے اصولی یا مرکزی جذبات سے رفتہ رفتہ دور ہٹتی جاتی ہے وہ اپنے ادبار اور تنزل کے قریب تر ہوتی جاتی ہے۔

کائنات انسانی ایک دوڑ رکھتی ہے۔ وہی قوم اس دوڑ میں قائم رہ سکتی ہے جو اپنا مرکز نہ چھوڑے اور دوسرے کے جذبات میں خود منجذب نہ ہو جائے کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دوسری طاقتیں اسکے حسن جذبات حسن تصرفات کو دیکھکر اُسمیں جذب ہو جائیں جو چشمہ پانی لیتا نہیں بلکہ ہمیشہ پانی دیتا ہی رہتا ہے وہ اخیر پر خشک ہو جاتا ہے اور لوگوں کے واسطے اُسکا وجود مفید نہیں رہتا اگر ایک قوم دوسری قوم کے جذبات میں منجذب ہونا بُرا اور نقصان رساں خیال نہیں کرتی تو کیا بایں حالات یہ کہا جاوے گا کہ وہ اپنے قومی جذبات قومی مرکز کی عزت کرتی ہے یا اُس سے اُسکو کوئی محبت اور تعلق ہے۔

جو شخص اپنا گھر چھوڑ کر ہمیشہ دوسروں کے گھروں میں رہتا اور انھیں رسوم کا پابند اور خوگیر ہوتا ہے اُسکا گھر کبھی آباد نہیں رہ سکتا وہ ایک ویرانہ شمار ہوگا اُسے گھر کون کہہ سکتا ہے۔ قومی تحفظ کا بڑا اصول یہی ہے کہ قومیں پیچھے ہٹ کر اپنا پُرانہ مرکز بھی دیکھیں کہ وہ کیا شان و شوکت رکھتا تھا اگر تم ترقی کرنا چاہتے ہو تو ذرا پیچھے ہٹو بے شک آگے جانا ایک ترقی ہے لیکن اپنے مرکز سے ہٹ جاتا اور اُسکی خبر نہ لینا ایک تنزل بھی ہے اگر ایک شے زمین پر سے اوپر پھینکی جائے اور وہ زمین کا مرکز چھوڑ چکے تو اُس کا حشر

کیا ہوگا یا تو وہ معلق ہوگی اور یا جو نا خلا میں ہمیشہ کے واسطے پڑا ں رہے گی کیا یہ ترقی ہوگی اصل ترقی مرکز کا قائم رہنا ہے جو ترقی کوئی مرکز ہی نہیں رکھتی وہ ترقی نہیں بلکہ ایک تنزل اور ایک ایسی سبیل جو کبھی منزل مقصود پر پہنچا نہیں سکتی۔

ہر قوم جذبہ اور کشش رکھتی ہے جذبہ اور کشش کا یہ کام نہیں ہونا چاہیے کہ دوسروں کو دوڑتا دیکھکر چابک یا قمچی مار کر دوڑے اور یہ چاہے کہ اُسکو روک کر خود بڑھے بلکہ یہ کہ خود تیزی سے بڑھے اور آگے نکلے اور اپنے حسن جذبات سے دوسروں کو گرویدہ بنائے اور یہ کوشش کرے کہ دوسری شخصیتیں اور دوسری قومیں اُسمیں منجذب ہوں یہ اُس وقت تک نہیں ہوسکتا کہ جب تک کوئی قوم اپنے جذبات سے آگاہ نہ ہو اور یہ نہ جانے کہ اُن کی حشمت اور پیمانہ کسقدر ہے اور اُن میں کس قدر طاقت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اور اُن سے کہاں تک کام لیا جاسکتا ہے۔

جو قوم یہ جانتی ہی نہیں کہ اُسکے جذبات کیسے ہیں اور اُن کی کیفیت کیا ہے اور کس طرح شخصی جذبات قومی جذبات کا رنگ اختیار کرتے ہیں اور کس طرح اُنھیں مجموعی حالت میں مفید بنایا جاسکتا ہے اور کس طرح دوسری قومیں اور دوسری شخصیتیں اُن میں شامل ہوسکتی ہیں وہ اس کش مکش کی دنیا میں بمشکل قائم اور ثابت رہ سکتی ہے لوگ عموماً انفرادی رنگ دیکھنے کے عادی ہیں اجتماعی رنگ میں دیکھنے کے عادی نہیں ہیں حالانکہ قومی رنگ میں بھی دیکھنا لازمی ہے۔

در عشق نہ تسبیح نہ زنار ضرورست
تارے بکف از طرۂ دلدار ضرورست

سلطان احمد

کحل الجواہر

حضرت ثاقب قزلباش لکھنوی

جان خوش ہے باغ ہستی میں دل مسرور ہے
کیا بہار زندگی جب آنکھ ہی بے نور ہے

صورت رحمت کہاں دنیا ہے آنکھوں میں سیاہ
جل رہا ہے دل کہ ٹھنڈا کیوں چراغِ طور ہے

دید کے قابل تماشا گاہ عالم ہے مگر
وائے محرومی اگر آنکھوں سے تو معذور ہے

وہ طلسمی لوح سب کہتے ہیں جسکو مردمک
سات پردوں میں یہ رازِ تجلی مستور ہے

ایک نقطہ ہے جو ہے صورت کشِ ارض و سما
ایک تِل ہے جسمیں عالم کی فضا محصور ہے

صنعتیں ہیں کلکِ قدرت کا مرقع دیکھیے
انطباعِ شکل کا حیرت نما دستور ہے

کب چھپی تصویر کب آنکھوں سے غائب ہوگئی
نقشِ اول کیا ہوا جب دوسرا منظور ہے

منطبع ہوتی ہیں لاکھوں رنگ کی شکلیں مگر
کوئی دھبا لوح پر رہ جائے کیا مقدور ہے

دیدۂ بینا بڑی نعمت ہے دیکھو غور سے
لطف ہستی ہے جو آنکھوں میں ضیا [illegible] ہے

کور ہونا ہے گوارا یا بصارت سے عزیز
نے مریض چشم بتلا کیا تجھے منظور ہے

کیوں ہے یہ آشوب کیوں جاری ہے پانی آنکھ سے
آ گیا ہے کچھ ورم پردوں میں یا ناسور ہے

خیرگی کی نہیں آنکھوں میں دانے ہیں اگر
پتلیاں دھندلی ہوئیں تو روشنی کافور ہے

ابتدائے ہر مرض میں چاہیے فکرِ علاج
حد سے گذرا درد تو لقمان بھی مجبور ہے

دو قدم زحمت اٹھا آنکھوں کی صحت کے لیے
تو ہے ناواقف نہ دار الطب کچھ ایسا دور ہے

اس مطب میں خاص آنکھوں ہی کا ہوتا ہے علاج
یہ مکاں آلاتِ نو ایجاد سے معمور ہے

ہیں اطبا حاذقِ فن جامع فضل و کمال
علم کا مخزن ہے یہ دار الشفا مشہور ہے

اس توجہ کا جو ہے ثاقب کے حال زار پر
زیر بار منت و احسان دلِ رنجور ہے

[illegible]

نئے دولہا کے خیالات

میرے ایک دوست کی حال ہی میں شادی ہوی ہے۔ میاں تعلیم یافتہ ہیں۔ امیر ہیں خوبصورت ہیں توانا و تندرست ہیں۔ نیک خیال و نیک اعمال ہیں۔ بیوی ہر طرح سے میاں کے حسب دلخواہ ہیں۔ کبھی کبھی غریب خانہ پر بھی تشریف لے آتے ہیں کل اُن سے اس جدید تعلق کے متعلق گفتگو ہوی۔ جو کچھ یاد رہا تحریر کی نذر کرتا ہوں

میں۔ سید صاحب (یہ صاحب سید ہیں)۔ آپ کی تاہل کی نسبت کیا رائے ہے۔

سید صاحب۔ آپ رائے دریافت کرتے ہیں یا میرا تجربہ پوچھتے ہیں۔

میں۔ جی ہاں یہی سمجھیے۔ آپ کو اس نئی زندگی کا اب تجربہ ہوا ہے۔ آپ نے اسکے متعلق کیا رائے قائم فرمائی۔

سید صاحب۔ رائے کے لفظ کو تو آپ چھوڑ ہی دیں۔ یوں فرمائیے کہ شادی کرنے کے بعد تمھاری زندگی میں کیا انقلاب ہوا۔

میں۔ بہت اچھا یوں ہی سہی۔

سید صاحب۔ یا اس سوال کو اس طرح پیش کیا جائے کہ بیوی کیسی ملیں اور گھر کی کیا حالت ہے۔

میں۔ بہت اچھا۔ یوں ہی سہی۔

سید صاحب۔ یعنی میں اس بات کا جواب دوں کہ بیوی کیسی ملیں یا اس سوال کا کہ گھر کی کیا حالت ہے؟

میں۔ میں تو بیوی اور گھر اور رہتا ہلانہ زندگی سب کے ایک ہی معنی سمجھتا ہوں۔

سید صاحب۔ مگر میں نہیں سمجھتا۔ بیوی تو بیوی ہے۔ گھر گھر ہے۔ زندگی زندگی ہے۔

میں - فرداً فرداً تو درست اور بجا لیکن جب یہ تینوں چیزیں آپ سے ایک وقت میں مدت العمر کے واسطے متعلق ہو جائیں تو اُسکا نام آپ کیا رکھیں گے -

سید صاحب - گھونسلا -

میں - بہت خوب - وہ کیوں ؟

سید صاحب - وہ یوں کہ اول تو مشابہت تامہ انسان اور چڑیا کی بود و باش میں ہے - دوسرے یہ کہ میں فطرتی تعلقات کے متعلق فطرت کی اصطلاحات سے گفتگو کیا کرتا ہوں -

میں - بہت اچھا گھونسلا ہی صحیح سہی - مگر سوال یہ ہے کہ یہ گھونسلا کیسے درخت پر کس شاخ پر ہے - کیسے تنکوں کا ہے - یا چھت کی کڑی میں بنا ہے یا کمرہ کی کانس پر - یا کسی جھاڑی میں ہے - دن کی دھوپ اور رات کی سردی کا کیا علاج کیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ -

سید صاحب - جناب یہ گھونسلا بنا ہے گلاب کے درخت میں - پھولوں کے سایہ میں - سبز پتوں کی اوٹ میں - خوشبودار تنکوں کا - باغ کی روش کے پاس بہار کے موسم میں - ٹھنڈی ہوا میں - دائیں طرف چنبیلی کھلی ہوئی ہے بائیں طرف مولسری کا درخت ہے جس میں بہت سے گانے والے پرند رہتے ہیں جو صبح سے شام تک وقت وقت کی راگنی راگ الاپتے رہتے ہیں جنکے سریلے نغموں نے باغ کو ایسا دلکش بنا دیا ہے کہ کسی وقت باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا -

میں - پھر آپ نے گھونسلے کے بدلے بارہ دری کیوں دلپسند فرمائی - اسی کو باغ میں اُٹھا کر رکھ لیتے - چار طرف پھولدار درخت بھی لگ جاتے - سامنے روشوں کے کناروں سے اٹھکیلیاں کرتا ہوا پانی بھی جاری ہو جاتا - ایک سنگ مرمر کا حوض بھی اُس میں لگ جاتا اُسمیں ایک فوارہ لگوا لیتے [illegible]

ہوائیں بھی چلتیں خوشنوا پرند بھی چہچہاتے۔ بارہ دری میں ایک آرام چوکی پر آپ بیٹھ جاتے۔ سامنے بیگم صاحبہ رونق افروز ہوتیں۔ فوارہ جاری ہو جاتا۔ سورج کی کرنیں فوارہ کی اچھلکر گرتی ہوئی دھاروں کے مسلسل قطروں پر پڑتیں اور آپ اُس کے رنگوں کو دکھا کر بیگم صاحبہ سے پوچھتے کہ بتاؤ کتنے رنگ ہیں۔

سید صاحب۔ بس یہی مابہ الاختلاف ہے۔ کہاں گھونسلا۔ کہاں بارہ دری فطرت اپنے اصلی رنگ میں جسطرح گھونسلے میں نظر آتی ہے۔ بارہ دری۔ کوٹھی۔ محل۔ شیش محل۔ کسی جگہ نظر نہیں آتی۔

مَیں۔ میری رائے ناقص میں تو فطرت کا رنگ ہر جگہ نظر آ سکتا ہے۔ ہاروں رشید کے محلات اور برمنگھم پیلس سے لے کر صحرائے افریقہ کے جنگلی حبشیوں کے جھونپڑوں اور غاروں تک۔ سب جگہ فطرت ہی فطرت نظر آ سکتی ہے۔

سید صاحب۔ غار اور جھونپڑے کی حد تک تو مَیں آپ کا کسی قدر ہم خیال رہ سکتا ہوں مگر اس سے آگے چل کر میرے نزدیک فطرت صحیحہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسانی تہذیب کی قلعی شاہ و گدا پر ایسی چڑھتی ہے کہ اصلیت حجاب در حجاب ہو جاتی ہے۔

مَیں۔ معاف کیجیے گا مَیں ذرا موٹی عقل کا آدمی ہوں۔ ذرا سمجھا کر بات کیجیے۔ کیا آپ تہذیب انسانی کو قلعی اور خارج از فطرت خیال کرتے ہیں۔ میرے نزدیک تو تہذیب حُسن فطرت کا نام ہے۔

سید صاحب۔ بشرطیکہ .... (چپ ہو گئے)

مَیں۔ بشرطیکہ؟ آگے بھی تو کچھ فرمائیے۔

سید صاحب۔ جناب گھونسلا گھونسلا ہے۔ بارہ دری بارہ دری ہے۔

مَیں۔ تسلیم کیا۔ مگر آپ کو کونسی چیز پسند ہے۔ بارہ دری یا گھونسلا۔

سید صاحب۔ گھونسلا!

میں۔ تشریح و توضیح؟

سید صاحب۔ بس نہ پوچھیے۔

میں۔ ضرور پوچھوں گا اور آپ ضرور بتائیں گے۔

سید صاحب۔ اچھا تو سنیے۔ تھوڑی سی دیر کے واسطے منطق و فلسفہ و تہذیب سے قطع نظر کر لیجیے۔ اور ذرا میرے ساتھ وہاں چلیے

میں۔ چلیے اوس وادیِ پُرفضا۔ رشک زمرد سبزہ زار۔ لہراتے ہوئے پانی۔ عنبر بیز و جاں بخش نسیم۔ دلربا چھاؤں اور جاں فزا دھوپ کی سیر آج سے بیس پچیس برس پہلے میں نے بھی کی ہے۔ اب فرمائیے میں وہیں پہنچ گیا۔

سید صاحب۔ ذرا آپ ہی غور کیجیے۔ آپ نے بجائے ایک قدرت کی سینری کے اُس زندگی کی تشبیہ کسی اور چیز سے کیوں نہ دی جیسے ونڈسر پیلس یا تاج محل یا کوئی نمایش گاہ۔

میں۔ کچھ قائل ہو کر، اسلیے کہ گھونسلے کی خوبیوں پر آپ کے خیالات سے مستفید ہونا منظور ہے۔

سید صاحب۔ جب آپ کے دماغ سے تہذیب و ایجاد کا کھیڑا نکل گیا تو اب آپ میرا مطلب سمجھ لیں گے۔ اور وہ یہ ہے۔

عورت کو ایک گانے والے پرندے سے بہت مشابہت ہے۔ اتنی کہ دنیا کی کسی اور چیز سے نہیں ہے۔ عورت کی فطرت پر اگر غور کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی گانے والی چڑیا پر (جیسے کہ اگن۔ شاما۔ چنڈول۔ شکر خورہ۔ یا کلاری وغیرہ ہیں) کچھ ہڈیاں کچھ گوشت و پوست چڑھا کر کچھ زنانے کپڑے پہنا کر اُس کا نام عورت رکھ دیا ہے۔

میں۔ تشبیہ تو واقعی نئی ہے اور آپ کے علم الحیوانات کے ساتھ مذاق سخن

ظاہر کر رہی ہے مگر میں ذرا اسکی اور بھی تشریح سننی چاہتا ہوں۔
سید صاحب۔ جی ہاں۔ لیجیے۔ میں عرض کرتا ہوں۔ پہلے صورت ظاہری کچھ تو اس کے بیشک نہیں ہیں لیکن کپڑوں کی تراش خراش میں کچھ اضافہ کر کے انکا قائم مقام خاصہ پیدا کر لیا ہے۔ کسی ملک میں کچھ ہے کسی میں کچھ ہے مگر ہے سب جگہ کچھ نہ کچھ یوروپ میں جاکٹ ہے میلی کوٹ ہے فروک ہے۔ گون ہے اور خدا جانے کیا کیا اپنے ملک میں دو پٹے ہیں چادریں ہیں برقع ہے۔ انگرا ہے تہبوشنی ہے وغیرہ وغیرہ اسی طرح یکرنگی سے بھی اسکو بالطبع نفور ہے۔ جیسے پرندوں میں سوا کالے کوے اور سفید کبوتر کے کوئی یکرنگ پرندہ نظر نہیں آئے گا اسی طرح عورتوں میں بھی سوا رانڈ بیوہ بڑھیوں کے کسی کو آپ یک رنگ لباس میں نہ دیکھیں گے۔

آواز کو لیجیے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ بولنے سے کام۔ پرندہ اپنی منقار کو چگنے کے وقت کے علاوہ ہر وقت نغمہ سرائی میں مصروف رکھتا ہے۔ اسی طرح یہ خدا کی بندی بھی فقط اس یقین پر کہ اسکی آواز میں سننے والے کو موسیقی کا لطف آتا ہے۔ بولے جاتی ہے سدھائی ہوئی شاما یا سبز گیہوں کے کھیت کا چنڈول کیا بولے گا جو یہ بے پر کی چڑیا بولتی ہے۔ اسی طرح نقل و حرکت کا مقابلہ کیجیے۔ آپ نے خوبصورت چڑیوں کو اپنے گھونسلے کے آس پاس بلاوجہ و بے مطلب اڑتے پھرتے دیکھا ہوگا؟
میں۔ آپ کا ہی دیکھنا کافی ہے۔
سید صاحب۔ میرا ہی کیوں؟ آپ نے بھی ضرور دیکھا ہوگا کہ کبھی گھونسلے سے باہر نکل بیٹھیں۔ کچھ چونچ سے پر کھجاتے۔ ادھر ادھر دیکھکر اس شاخ سے اس شاخ پر پہنچ گئیں۔ کبھی اس ببول پر جا پہنچیں۔ اور ابھی ببول کی ٹہنی اسکے بوجھ سے جھولنے بھی نہ پائی تھی کہ وہاں سے اڑکر پھر اپنے گھونسلے کے

پاس آبیٹھیں۔ پھر کچھ بولیں۔ پھر زمین پر اُتر آئیں۔ ذرا ادھر اُدھر پھُدک کر چلیں پھر اوڑ گئیں۔ اور کسی بڑے درخت کے سایہ دار پتّوں میں غائب ہوگئیں۔ اور جب وہاں تر کی نظروں سے اوجھل ہونے کا احساس ہوا تو بولنے لگیں۔ غرض یہ کہ دن بھر نقل و حرکت سے کام۔

یہی حالت عورت کی ہے۔ اتنا معلوم ہو جائے کہ میرا چلنا پھرنا اُٹھنا بیٹھنا بولنا چالنا۔ گنگنا نا کسی کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ پھر دیکھیے۔ اس کمرے سے اُس کمرے میں۔ اس کمرے سے صحن میں۔ صحن سے پلنگ پر۔ پلنگ سے اُتر کر آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔ پھر سنگھار میز پاس آبیٹھیں کچھ کنگھی چوٹی کی۔ کچھ اپنے لمبے بالوں کی تعریف کی کہ کمبخت خواہ مخواہ اُلجھ جاتے ہیں۔ پھر کچھ پان کا شغل کیا جب کوئی کام پیش نظر نہیں ہوا تو بولنا شروع کر دیا "لے آج آپ دفتر نہیں گئے" یا "پان بنا دوں" یا "ڈاک آگئی؟" وغیرہ وغیرہ۔ جواب میں اگر ایک سکنڈ کی دیر لگ گئی تو خفا ہوگئیں۔ پھر کیا تھا۔ سمند ناز کو ایک اور تازیانہ ہوا۔ "اللہ اللہ بات کا جواب ملنا بھی مشکل ہے۔ اگر قدردان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں عفو تقصیر چاہا تو کہہ دیا کہ "ہم نہیں بولتے" پھر کوئی آکر خود بولتا ہے اور بلواتا ہے میں۔ ظاہری حالت کے واسطے تو اتنا ہی لکچر کافی ہے۔ اب کچھ طبیعت کے متعلق بھی کہہ ڈالیے۔ مگر اس سے زیادہ خاکہ نہ اُڑائیے گا ورنہ دنیا کا نصف حصّہ آپ سے ناراض ہو جائے۔ جسکو بالطبع نرمی اور تعریف پسند ہو۔

سید صاحب۔ ناراضگی کے وجوہات مجکو معلوم نہیں کہ کیا ہو سکتے ہیں۔ میں تو عورت کی تصویر کو قدرت کے نگار خانہ میں بہترین جگہ دے رہا ہوں۔

میں۔ مجھے خوف ہے کہ وہ شاید اس جگہ کو پسند نہ کرے۔ مگر میں آپکی بابت وعدہ کروں گا کہ آپ کا نام اس مضمون کے پڑھنے والوں پر ظاہر نہیں کروں گا

سید صاحب - تو کیا آپ ان باتوں کو پبلک میں شائع کریں گے -
میں - آپ جانتے ہیں کہ جو چیز دلچسپ ہے اُسکی مالک پبلک ہوتی ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ آپ کے خیالات دلچسپی سے خالی نہیں ہیں اس لیے پبلک کی تواضع کیوں نہ کی جائے -
سید صاحب - اچھا منظور ہے مگر میرا نام ظاہر نہو -
میں - اس کا میں وعدہ کرتا ہوں -
سید صاحب - اس شرط پر مجھے بھی انکار نہیں - طبیعت بھی اُسکی پرند کی طبیعت سے مشابہ ہے - مرد میں تصنع - تکلف - تہذیب - بوجہ بیرونی زندگی کے تجربہ کے زیادہ ہوتی ہے اور بالخصوص تعلیم یافتہ اشخاص میں - تہذیب سے مراد میری وہی تہذیب ہے جسکو میں تہذیب کہتا ہوں - جس کا اصل اصول دفع الوقتی اور رفع شر ہے - نہ وہ جسکو آپ حُسن فطرت فرماتے ہیں پرند کا ہر فعل عین فطرت ہے - اسی طرح عورت کے افعال و جذبات تاوقتیکہ اُسکو حالات و صحبت متاثر نہ کریں بالکل فطرت کے مطابق ہوتے ہیں اُسکی طبیعت ابتدا ہی سے آغوش فطرت میں پرورش پاتی ہے - اُس کی جسمانی ہستی محض ایک غلاف اُسکی فطرتی اور روحانی روشنی کا ہوتا ہے جس طرح سے کہ لیمپ کی تیز روشنی کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے اُن پر شیشہ کی چمنی لگائی جاتی ہے اسی طرح اُس کی روحانی روشنی کو اُسکی جسمانی فطرت کے غلاف سے چھپایا گیا ہے - گویا عورت کے اندر ایک اور عورت ہوتی ہے اور وہی اصل عورت ہے - وہی اُسکی فطرت ہے جس میں روح کی تجلیات چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں - مرد میں اور عورت میں یہ فرق ہے کہ مرد کی روحانیت اور جدید تہذیب کی دنیا میں بہت جلدی زائل ہو جاتی ہے اور عصمت کی

روحانیت اگر مخالف حالات کا اثر اس پر نہ پڑے تو تمام عمر رہ سکتی ہے - وہ جیسی پیدا ہوئی تھی ویسی ہی قبر تک جاسکتی ہے جس طرح پرند جب سے اس نے اپنے پروں سے کام لینا شروع کیا اسوقت تک کہ جب وہ موت کا شکار ہو یکساں رہتا ہے - آپ کا یہ آئیڈیل اتنا بلند ہے کہ اسکے لیے میں پرند کی تشبیہ کو ناکافی سمجھتا ہوں -

سید صاحب - تو پھر کیا آپ اسکو پھول سے تشبیہ دیں گے - یا نسیم سحری سے یا بوئے گل سے یا بجلی کی چمک سے یا ابر سے یا بارش سے یا سورج کی کرن سے یا موتی سے ؟ میری رائے میں اس سے بہتر کوئی تشبیہ نہیں ہے - ان میں سے کسی میں اتنا حسن نہیں ہے جتنا ایک خوبصورت گانے والے پرند میں ہوتا ہے

میں - کچھ پر - چونچ - پنجہ سے آپ کو خاص رغبت بھی معلوم ہوتی ہے -

سید صاحب - نہیں میں پرند کو ایک نہایت مرغوب دل چیز سمجھتا ہوں - چمن کی بہار پرند کے نغمہ سے ہے - گل کا سنگھار بلبل کے ولولۂ محبت سے ہے - نیچر کا موسیقی پرند کے گلوئے خوش نوا میں رکھا گیا ہے خود انسان اپنے دلکش موسیقی میں اسی کا شاگرد ہے - اسکے علاوہ حسن قدرت کا بہت سا حصہ پھول اور پرند میں تقسیم ہو گیا ہے اور بہت تھوڑا سا برفستان و سمندر و ابر و بارش و دریا و بجلی و آفتاب و مہتاب و ستارے و فضائے آسمانی و صبح و شام وغیرہ کو ملا گیا ہے - ان میں رعب قدرت دیا ہے حسن قدرت کم ہے - کسی میں قدرت کی وسعت - کسی میں طاقت کسی میں انتظام - کسی میں فیض کسی میں ضابطہ نظر آتے ہیں - بیشک یہ آیات وحدت ہیں - اور وحدۃ الوجود کی جھلک ان میں زیادہ نظر آتی ہے مگر اللہ جمیل ویحب الجمال کی تشریح پھولوں اور پرندوں کے مشاہدے سے سمجھ میں آتی ہے ان میں سے پھولوں میں وہ جلوہ دکھا دیا جس سے اسکی ہستی قدرت کے جا نشین ہیں فقط اس چیز کی

ہو جاتی اور دکھائی جاتی ہے اور اتنا ہی اسکا فرض ہے۔ مگر پرند کی خوبصورت ہستی اپنی نقل و حرکت سے کارخانۂ قدرت میں حصہ لینے والی معلوم ہوتی ہے جو تمام زندگی اوائے فرض فطرتی میں صرف کرتی ہے۔

پھول حسن ساکن ہے۔ پرند حسن متحرک ہے۔ عورت میں اور پرند میں صرف یہ فرق ہے کہ وہ بھی حسن متحرک۔ مگر بوجہ ہم جنسی کے مرد کے سکون قلب و راحت جسمانی کے لیے پرندے سے زیادہ مفید و ضروری ہے۔ اور ایک اعلےٰ درجہ کا اخلاقی و روحانی نمونہ ہونے کی وجہ سے ازبس ضروری ہے۔ قدرت نے تبسم کیا تو پھول پیدا ہوا۔ جب اپنی تعریف میں کچھ گانے لگی تو پرند پیدا ہوا۔ جب اس تبسم نغمہ سرائی سے دل میں تفریح کا اثر اور روحانیت کا نشہ پیدا ہوا تو عورت پیدا ہوئی۔ یہ قدرت کی آخر اور مقتدم پیدائش ہے۔ اب آپ مجھے معافی دیں گے اگر میں گھر کو گھونسلے سے اور بیوی کو ایک خوشنما گانے والے پرندے سے تشبیہ دوں۔

میں۔ تو یوں کہیے کہ "چوں چوں کرتی آئیں بی چڑیا"

سید صاحب۔ پان کھا کر رخصت ہوئے اور یہ فرماتے گئے کہ "مرزا صاحب اب آپ بڑھے ہو گئے ہیں"

محمد اشرف

کنڈیاں لگواتی ہوں"۔

حاضرین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور چلنے کی تیاری کی۔ میں نے بھی دروکا۔ مگر رسالدار صاحب نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگے "چل یار ہمارے ہاں چل کر سو رہ یہاں گنڈی لگ جانے دے اور ایک مہینہ بھر وہیں رہ کنڈی آپ ہی کھل جائے گی اور آیندہ پھر کبھی نہ لگے گی" میں کھسیانی ہنسی ہنسا اور میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر دستک ہوئی۔ آخر رسالدار صاحب کے بھی پیر گھر گھر جا کر جو نہ ہونی تھی وہ ہوئی۔ اور بول چال بند ہو گئی۔ مگر غور کیا تو قصور اپنا ہی پایا۔

....

۲۵۔ دسمبر۔ آج رات کو رسالدار صاحب کے ہاں دعوت تھی۔ بلاوا صبح ہی آ چکا تھا۔ نہ جاتا تو مشکل رسالدار جمّا خان جیسا شخص میری سات پیڑھی پُن ڈالتا جانے میں بیگم صاحب کی خفگی کا ڈر کیونکہ اُنکا حکم تھا کہ رسالدار صاحب کے ہاں نہ جایا کرو۔ آخر بیگم صاحب سے بہانہ کیا کہ سرکاری کام ہے اور ہم دعوت میں پہنچے کھانا کھا کے ہی اُٹھا کہ دیر ہونے سے شبہ نہ ہو جائے اور ٹھیک ۹ بجے گھر پہنچ گیا تھا مگر اندر گھر کے سب دروازے بند تھے۔ بہت کھٹکھٹایا مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ نوکر نے تجویز بتائی کہ دیوار کودی جائے مگر چوروں کو راستہ بتانا اور اندر پہنچ کر چوروں کی بھول میں جوتے کھانا کس نے بتایا ہے۔ آخر اتنی جلدی دروازے کیوں بند ہو گئے باہر مردانے کے کمرے میں قمرالدین داروغہ سے بستر مانگ کر سو رہا۔

۲۶۔ دسمبر۔ صبح گھر میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولا بخش کی گواہی ہو رہی ہے بیگم صاحب کواڑ کے پیچھے کھڑی ہیں۔ ماما عظمت بیچ میں دروازے میں کھڑی ہے اور مولا بخش باہر سے جواب دے رہا ہے۔ بیگم صاحب کے سوال ماما عظمت دہراتی ہے۔ مولا بخش کو بتانا تھا [illegible] ہے کہ سوال وہ بیگم صاحب کی زبانی سن رہا ہے

اور اتنے ما عظمت دُہرائے اتنے وہ جواب گرہ لیتا ہے۔ چند سوالات جو میں نے
بچپن سے سُنے وہ یہ تھے "تو ایمان سے کہتا ہے کہ تجھکو خبر نہیں"۔ "رسالدار صاحب کا
ہوتی تو صبح نہیں آیا تھا"۔ "رات گھر میں نہ سوئے تو بستر کہاں سے آیا"۔ "اچھا تو
کوچوان کو بلا لا اُس سے پوچھوں کہ گاڑی کہاں کہاں لے گیا تھا" میں ڈرا کہ اب
بھید کُھلا۔ میں نے زور سے گڑگڑا کر دعا کی کہ مقدمہ بند ہو۔ مگر میری موجودگی میں بھی پیشی
ختم ہوتی میں پریشان تھا کہ کیا کروں۔ مگر مولا بخش بڑا ہوشیار آدمی ہے۔ اُسنے
جواب لا کر دیا کہ کوچوان باہر گیا ہوا ہے۔ یہ سُنتے ہی میں باہر نکل آیا کسی نے
رات کی کیفیت رسالدار صاحب سے بیان کر دی وہ آ گئے بیگم صاحب کی
خفگی سے ڈر کر باہر آیا تھا کہ رسالدار صاحب کا سامنا ہوا۔ اُلٹا مجھکو ہی ڈانٹنا
شروع کیا۔ جب مجھے تمام بزدلی کے القاب دے چکے اور میں اپنے [illegible]
بیان کر چکا اور بیگم صاحب کے مزاج کا حال سنا چکا تو آخر میں رسالدار صاحب نے
[illegible] دی اور بہت سیدھے الفاظ میں کہ "مارتا کیوں نہیں"! مجھے ایک بچپنے
سبق یاد آ گیا اور میں نے فوراً جواب دیدیا "تا با یا میرے دل کی پیاری"۔
اسی دن سے میرا نام ٹالم ٹولا پڑ گیا۔

. . . .

۲۳ فروری - ۲۰ اگست - ۲۵ دسمبر کے واقعہ الگ سے میرا گھر سے نکلنا
بند ہو گیا۔ کوئی ملنے آتا ہے تو مجھے خبر نہیں کی جاتی بلکہ پہلے بیگم صاحب کو اطلاع
کی جاتی ہے۔ اگر کوئی نامناسب شخص ملنے آئے تو وہ کہلا بھیجتی ہیں کہ صاحب
گھر میں نہیں ہیں۔ اور میں چپ بیٹھا سنا کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ خاطر نے مرد
[illegible] کیوں باندھا زندہ بدست مردہ تو اس سے بھی بہتر ہے۔ مگر نہیں
نہیں یہی میرا فائدہ ہے جب تک آدمی تارک الاسباب ہو کر نہ بیٹھے کا

نہیں کر سکتا۔ آج رسالدار صاحب پھر آنکلے۔ نوکر نے حسب دستور جواب دیدیا کہ گھر میں نہیں ہیں۔ شاید رسالدار صاحب کو میری قید محض کا حال معلوم ہوگیا ہوگا وہ گھر میں گھسنے لگے کہ بہن سے کہنا وہ پردہ کرلیں بھائی کو ہم خود ڈھونڈھ لیں گے اُدھر بیگم صاحب کی خفگی۔ اور میری طرف قہر کی نظریں۔ رسالدار صاحب نے زیادہ لحاظ نہیں کیا اور گھر میں گھس آئے میں بیٹھا تماشا دیکھتا رہا۔ بیگم صاحب بھاگیں تھیں چھپنے کو تھا کہ فوراً میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹا۔ چوکی پر سے میں گرنے ہی والا تھا کہ رسالدار صاحب آنکھوں پر ہاتھ رکھے سامنے کھڑے کیا کہتے ہیں کہ چور پکڑ لیا ہے۔ بہن آپ اب پردے میں چلی جائیں۔ میں ان گھر گھسنے دوست سے بھگت لوں گا حریت و مساوات اچھی چیزیں ہیں۔

. . . .

۵۔ مارچ۔ تعلیم نسواں بھی اچھی چیز ہے۔ جب تک پردہ ہے تب تک تعلیم نسواں کی بہت ضرورت ہے۔ یہ پردہ دار کے لیے شغل بیکاری ہے۔ بیگم صاحب شب و روز اخبار بینی و مضمون نویسی میں لگی رہتی ہیں۔ آج ایک بڑے مزے کا لطیفہ ہوا بیگم صاحب کفایت شعاری اور خانہ داری پر مضمون لکھ رہی تھیں۔ چاء کا وقت آگیا ملازمہ نے پاس میز پر چاء کے برتن لا رکھے۔ بیگم صاحب کا انہماک اسقدر تھا کہ ان کو خبر نہوئی کہ کب چاء کے برتن رکھے گئے۔ مرغی ادھر اُدھر تاک میں پھر رہی تھی۔ تو بس یہ ٹھونگ مارنے کے لیے اس طرح چاء کے برتنوں پر آئی کہ کشتی برتن سمیت نیچے آئی۔ چاء کا سارا سٹ ٹوٹ گیا مگر کاغذی کفایت شعاری اور خانہ داری جاری رہی۔ عملی کفایت شعاری اور خانہ داری تو گھر یلو پرانے فیشن کی چیز ہے سٹ تو گھر میں ٹوٹا کسی کو کیا خبر۔ دس بارہ روپیہ کی بات ہے مگر مضمون تو دنیا بھر میں پڑھا جائے گا۔ سب کو خیال ہوگا کہ مضمون نگار خود بڑی ہی بندوبست منتظم ہوگی

صاحب کمال ہونا اتنی مفید بات نہیں ہے جتنی صاحب کمال مشہور ہونا۔

. . . .

یکم یکم اپریل۔ کسی نے غضب کا اپریل فول کیا۔ آج کے "رسالہ حقوق نسواں" میں میرے نام سے ایک مضمون شائع کرایا ہے جس کی سرخی "جنگجو بیوی" رکھی ہے۔ بیگم صاحب کو شبہ ہے کہ میں نے اس رسالے میں اُن کے لیے ایک آئینہ رکھدیا ہے۔ مجھے شبہ ہونے پر تعجب نہیں ہے شبہ کی تو گنجائش ہی نہیں جب میرا نام موجود ہے مگر تعجب اس امر پر ہے کہ وہ تو جنگجو نہیں پھر کیوں شبہ کرتی ہیں کہ "جنگجو بیوی" اُن کا اپنا مرقع ہے۔ میں نے لاکھ کہا کہ نہ میں نے یہ مضمون لکھا نہ تم مخاطب ہو نہ یہ تمھاری تصویر ہے ممکن ہے کسی نے میرے نام سے مضمون لکھا ہو۔ ممکن ہے مضمون نگار میرا ہمنام ہو مگر شام تک جنگ جاری رہی۔ آخر جب میں عاجز آگیا اور سونے لگا تو میں نے کہا کہ تم جیتیں اور میں ہارا۔ واقعی میری غلطی یہ تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ تم جنگجو نہیں ہو۔

راقم جنگجو بیوی کا صلح پسند خاوند

اسلام بائی قاری

یعنے

قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی (علیگ) سیاح جاپان وانگلستان کے انگریزی زبان میں متصوفانہ مضامین کا مجموعہ۔ یہ مضامین بڑی قدر کے ساتھ امریکہ کے مشہور رسالوں میں چھپے تھے اب دوبارہ چھاپ کر نہایت خوبصورت جلد میں ہدیۂ شائقین کیے جاتے ہیں۔ قیمت میں بھی تخفیف کردی گئی ہے اور اب تا اطلاع ثانی اسکی قیمت مع محصول الڈاک ۱۲؍ ہے

پتہ دفتر رسالہ "تمدّن" پل جھاؤ لال لکھنؤ

عورت کے جذبات

پردو سہیلیون کے خیالات

(ا)

میں حیران ہوں کہ خدا نے یہ بدبخت بے بس و ناچار مخلوق (عورت) بھی کیوں بنائی؟ میرے خیال میں اس سے کچھ بھی فائدہ نہیں پیدائش نسل انسانی کا کوئی اور ذریعہ بھی ہو سکتا تھا صرف اتنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں مصیبت میں پھنسایا تو یہ تو جب گھر میں بیٹی پیدا ہو جائے ایک نحوست سمجھی جاتی ہے اور تو اور وہی جس نے نو ماہ پیٹ میں رکھکر طرح طرح کے مصائب و تکالیف جھیل کر یہ دن حاصل کیا کہ اپنی ایک ہمجنس کو دنیا میں لاسکی) دایہ سے یہ سن کر کہ "لڑکی ہے" مغموم و رنجیدہ ہو جاتی ہے۔ آہ آہ اے ناچیز عورت تو کیوں بنائی گئی۔ سنی سنائی تو خیر سب سے پہلے میں آپ بیتی سناتی ہوں۔

میں جب اپنے والدین کے گھر پیدا ہوئی تو کوئی چھ لڑکیوں پر ساتویں بیٹی تھی کہ مصیبت و بار خیال کی جاتی بلکہ مجھ سے پیشتر بفضل خدا تین بیٹے گھر کی رونق و دولت ماں باپ کی راحت ذریعہ بخشش و نجات آخرت کنبہ و خاندان بھر کی عزت موجود تھے لیکن پھر بھی مجھے پتھر کنکر سے بدتر سمجھا گیا۔ سب کے دل جل گئے ایسے کہ گویا خدا کے گھر ان لوگوں نے بیٹے کی قیمت ہی بھیجی تھی اور خیر تو تھی ان کو بیٹی دی گئی۔ خیر جیسے تیسے ماں نے دل پر صبر کی سل رکھی اور مجھے پرورش کیا جب میں پیدا ہوئی میرا بھائی صرف سال بھر کا تھا اسکا دودھ چھڑایا گیا کہ ابھی بچہ کمزور ہے بلکہ آدھا اسکو آدھا مجھے پلایا۔ اسپر بھی وہ بیمار ہو گیا تو میری

دادی صاحبہ نے یہ حکم دیا کہ "دیکھو بہو بیگم ہمارا نور دیدہ لخت جگر لاڈلے میاں" (لڑکے کا نام) بیمار ہو گیا ہے تم اسکا دودھ کم نہ کرو لڑکی اب چار ماہ کی ہے اسکو گائے کے دودھ پر لگا دو" ہائے میری بدنصیبی کہ جو حق خدا کی طرف سے بیٹے بیٹی کو برابر ملا ہے دنیا والوں نے اسے بھی غصب کیا محض اس لیے کہ میں بیٹی تھی۔ بیٹے صاحب تو سوا سال کے ہو کر بھی ماں کا ہی دودھ پئیں اور میں غریب چار ماہ کی گائے پر لگائی جاؤں۔ خیر یہ بھی ہوا میں نے اُسی پر پرورش پائی بجھتے جیتے مجھے کھانا (کھچڑی ساگو دانہ وغیرہ) چٹائی جانے لگی اور میں اسی غذا پر تین سال کی ہو گئی۔

اب میرا بھائی چار اور میں تین برس کی تھی دونوں سب کے ساتھ بیٹھکر ہر طرح کا کھانا کھاتے تھے۔ مگر اس میں بھی بہت امتیاز تھا اچھا بُرا سرد گرم باسی تازہ ثقیل و دیر ہضم ان باتوں کا خاص لحاظ رکھا جاتا۔ ماں کی تو نہیں کہہ سکتی مگر دادی صاحبہ خاص نگرانی کر کے مجھے اناپ شناپ کھلا دیتیں یا اصیل سے کھلوا دیتیں تھیں اور لاڈلے صاحب کو اپنے ہاتھ سے تیار کر کے خود کھلاتی تھیں اسپر بھی اُنکو روز د کام کبھی بخار کبھی سوء ہضمی ہو جاتی تھی۔ جس سے گھر بھر بے چین ہوتا تھا۔ تو لے انصاف والو کیا میرا معدہ ہی پتھر تھا کسی حکیم کسی ڈاکٹر سے پوچھ کر دیکھا کیا بہ نسبت لڑکے کے لڑکی کی قوت ہاضمہ زیادہ مضبوط و اچھی ہوتی ہے جیسے عورت بوجھ سے کر رہا ہے۔ ہم کو جب تازہ کھانا تیار ہونے میں دیر ہوتی تھی اور ہم دونوں کو بھوک لگتی تو کوئی ماما باسی روٹی دال سے یا شکر وغیرہ سے مجھے ملا کر کھلا دیتی اور لخت جگر کے لیے نماز مغرب میں دیر کر کے خود دادی اماں ارا روٹ [illegible] یا [illegible] وغیرہ بنا کر جلدی سے کھلا دیتیں۔ سچ ہے میرا جگر پھٹتا ہے وہ اوقات یاد کر کے جب کہ کوئی اچھی چیز میرے بھائی کھاتے ہوتے اور وہ کم ہوتی یا مجھے نہ دی [illegible] تو اُن کو تو کوئی کچھ نہ کہتا مگر مانگتے

کرتے دیکھکر گھرکیاں دے کر سب ہٹا دیتے یا کوئی خراب ہی چیز دے کر
بہلانا چاہتے۔ یہ حالت دیکھ دیکھکر میں نے بھی اچھی طرح سمجھ لیا کہ درحقیقت میں کم
وقعت و ناچیز جنس ہوں اور وہ تینوں عرش کے تارے ہوں جوں جوں سمجھ آتی گئی مثل
گھر کے لوگوں کے میں بھی اُنھیں تینوں کی پرستش میں مصروف ہوتی گئی۔ اگر
کوئی شے اچھی پاتی بھی تو دن بھر بچا بچا کر رکھتی کہ شام کو بھیّے مدرسے سے آئینگے
تو دوں گی۔ وہ مجھے دق کرتے میری دوپٹیا (دوپٹہ) کھینچ بھاگتے میری
گڑیا کی ٹانگیں چیر کر کیچڑ میں پھینکدیتے مگر میں تھی کہ اُنھیں کے نثار رہتی۔ نہایت
منت سے کہتی "اچھے بھیا میں صدقے جاؤں میری گڑیا دیدو"۔ جب اور بڑی
ہوئی تو یہ بھی دیکھا کہ میرا لباس کیسا ہوتا تھا اور ان کا کیسا۔ اکثر اماں جان
اپنے پرانے پاجاموں کو کاٹ کر میری انگیا بنا دیتی تھیں۔ معمولی ڈوریے نینسکھ
کی ڈوپٹیا بنائی اور رنگ دی تب اُنھیں کو خوش خوش پہنتی تھی۔ ان کے لیے
نئے قیمتی کپڑے آتے وہ ولایتی بوٹ پہنتے میں چھ آنے (۶؍) والی نری پاپوش
جو چلنے میں پیر سے نکل نکل جاتی تھی۔ ہاں جب کبھی عید بقرعید کے موقع پر
اُن کے اچھے کپڑے دیکھکر ضد کرتی کہ میرے بھی ایسے ہوں تو دادی جان
ڈانٹتیں کہ چل دور ہو مردار نظر نہ لگا اللہ میرے بچوں کو پھاڑنا نصیب کرے
وہ باہر اندر جانے والے ہیں پھر وہ گھر کے مالک ہیں تیری اُنکی کیا برابری
میں صبر کرکے رہ جاتی اور وہی جوڑا پہنتی جو دادی اماں کے جہیز کے لٹھے
کے پاجامے کو کاٹکر بنا تھا اور بھائی کی مخمل کی پرانی قمیص کی کاٹکر
اماں جان نے صدری سی دی تھی اور اپنے پھٹے کریب کے دوپٹے میں گوٹ
مبر کی اوڑھنی نکال کر جھوٹا گوٹا ٹانک دیا تھا۔ پھر اگر وہ مجھے جلدی چھوٹا ہوتا
تو یہ خفگی کہ لونڈیا کے جسم میں کاٹنے ہیں کیا جلدی جلدی کپڑے پھاڑتی ہے

میں کیا نمک بیوں" اور یہ کسی کو خیال نہ آتا کہ لڑکوں کے کپڑوں پر کسقدر روپیہ
لگا ہے اور پھر وہ درزی نے سیے ہیں اُن کی تو سلائی ہی اِسقدر لگتی ہے کہ جتنی لاگت
میرے جوڑے پر بھی نہیں لگی۔ خیر خدا نے وہ زمانہ بھی گذارا۔ اب میں ۱۳ - ۱۴
سال کی جوان بیٹی گھر سنبھالنے کے قابل تھی اپنے کپڑے سیتی کھانا پکواتا گھر
کی صفائی چھوٹے بچوں کا رکھنا یہ تمام فرائض جو اماں جان کے متعلق تھے مجھ پر
عائد ہو چکے تھے۔ اگر ان میں سے کسی کام میں ذرا بھی کوتاہی ہو جاتی (صرف نماز
قرآن وغیرہ میں لگ کر) تو پھر قیامت ٹوٹتی سب کے طعنے کہ "نوج ایسی بیٹی پیدا ہو
جس گھر میں جوان بیٹی ہوتی ہے کسی کو ہاتھ نہیں ہلانا پڑتا یہ باتیں یہاں تو
نبھ جائینگی مگر پرائے گھر جا کر قدر کھل جائے گی۔" غرض کہ میں سہم سہم کر ۲۴ گھنٹے
دن اور ۲۴ گھنٹے رات کام ہی میں گذارتی۔ اور دیکھو میرے پڑھانے کا
کسی کو خیال بھی نہ آتا تھا۔ ملانی کی تلاش ہوتی تھی قرآن شریف پڑھانے
کے لیے مگر دو تین روپیہ ماہوار مانگتی تھی۔ کوئی کھانا کپڑا بھی ساتھ چاہتی تھی
اس لیے وہ بھی مقرر نہ ہوئی۔ جب اور ہوش آیا تو دادی جان سے پوچھ پوچھ کر
خود ہی قرآن شریف ختم کر لیا۔ برخلاف اسکے لڑکوں کے لیے پانچواں سال
لگتے ہی مولوی ماسٹر مقرر ہو گئے پھر ان کو اسکولوں میں داخل کیا گیا اسکے بعد
بڑے بھائی جان کو ولایت بھیجنے کے خیال سے پیسہ پیسہ کر کے ابا جان نے
سخت تکلیف اُٹھا کر دس یا ۱۲ ہزار روپیہ جمع کیا۔ اور اُن نور بصر کو بغرض تعلیم
روانہ انگلینڈ کیا جنھوں نے بجائے دس کے بیس ہزار خرچ کر دکھایا اور ابا جان
کو قرض لیکر بھیجنا پڑا۔ اور وہاں سے آئے تو ایک میم صاحب ساتھ لائے
جنکو لے کر علحدہ کوٹھی میں رہے۔ پہلی بیوی بیچاری کو ابا جان نے بھروا لگی
کمائی سب میم صاحبہ پر صرف ہوتی تھی اور بڑا بار قرض ہوتا تھا جو مجبور ہو کر ایک

گاؤں فروخت کرکے ادا کیا گیا۔ یہ راحت و مسرت و دولت و عزت ان والدین سے
حاصل ہوئی جنکو خون پانی ایک کرکے پرورش کیا گیا۔ میں غریب گھر کی انمول
ند مشکل اور بیماروں کی تیماردار ہمدرد جاں نثار بنی تھی بڑی۔ پندرھویں سال
میری شادی کردی گئی ظاہرا اچھا گھر دیکھکر دیدیا گیا جو کچھ قسمت کا تھا وہ بھی لگئی
مگر پھرے وہی نصیب میرے ساتھ تھے۔ اب سنو مختصر سا سسرال کا حال
اوّل اوّل چند روز تو دلہن پن کی خاطر ہوئی پھر وہی دن آئے جو آنے تھے
کوئی خدا نہ کرے شوہر میرا دشمن نہ تھا بلکہ مساوات زمانہ کے موافق مجھ سے محبت
کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میری حالت سنو۔ اب میں سسرال سے الگ اپنے
شوہر کی جائے ملازمت پہ تھی اور پانچ بچوں کی ماں۔

جاڑوں میں صبح پانچ بجے اٹھتی۔ گو ایک اصیل بھی تھی مگر شوہر کے حکم کے
مطابق خود ہی آگ جلا کر پانی گرم کرتی چائے بناتی۔ جب وہ منہ ہاتھ دھو کر چائے
پی کر باہر کے کمرہ دفتر میں چلے جاتے تو بچوں کو اٹھا کر منہ دھلاتی ایک نہ دو کے
پانچ۔ دو گھنٹے ان کے کپڑے بدلانے ناشتہ کرانے میں صرف ہو جاتے۔ ماما گھر میں
جھاڑو دیتی برتن مانجھتی۔ میری نمازیں صبح کی کسی نہ کسی دن قضا ہوتی تھی
کیونکہ بچے جاگ پڑتے اور رونے لگتے تھے تو وہ کہتے کہ جلدی چپ کراؤ گھر دوزخ
ہو گیا میں یہاں آنا بند کروں گا" اس لیے بہت ہی احتیاط کرنا پڑتی تھی
گو میرا شوہر کچھ برا نہ تھا لیکن فضول خرچ اور بہت سا وقت دوستوں مجلسیوں
میں گذرانے والا ضرور تھا اکثر راتوں کو باہر رہتا تھا۔ اور جب بچے پیدا ہو گئے
انھوں نے راتوں میں جاگنا رونا شروع کیا تو یہی عذر کرکے کہ نیند آتی حرام ہے
نیند کا سونا چھوڑ دیا۔ اب یہ حالت تھی کہ مہینہ میں اگر آٹھ راتیں باہر کے کمرہ میں
سوتے تو بائیس راتیں غائب۔ مجھے سب پتہ چل جاتا تھا مگر اُف کرنے کی اجازت

دو تھی۔ ستر روپیہ ماہوار تنخواہ تھی جسمیں پچاس کل اخراجات خانگی کے لیے مجھے ملتے تھے اور پچاس اُنکا جیب خرچ تھا۔ میں اسپر بھی شاکر تھی کیونکہ میری پرورش اسی طرح ہوئی تھی۔ اور اب مجھے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ میرے والدین نے جس طریق سے مجھے پرورش کیا ایک ہندوستانی عورت کے لیے یہی ضروری ہے کیونکہ نازونعم کی پلی لڑکی آیندہ زندگی کی سختیاں صبر و تحمل کے ساتھ کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔

ہو ہو میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی سُنانا تھا اپنا روزنامچۂ زندگی۔ ہاں تو میں بچوں کے کام سے فارغ ہوتی اتنے ماما کھانے کا حکم لینے کو آجاتی۔ گودام میں جا کر جنس تول کر دیتی۔ پھر ننھے بچوں میں گرفتار۔ ان کا کوئی کپڑا سیتی۔ اس میں وقت گذرتا بارہ بجے یا تو وہ خود کھانا کھانے آجاتے یا دفتر منگا بھیجتے اگر کھانا دفتر جاتا تو جو کچھ تھا باہر کے خیال سے بھیجدیتی خود چٹنی سے کھا لیتی۔ اور آجاتے تو خیر کچھ مجھے بھی بچ رہتا اسکے بعد نماز ظہر کا وقت تھا پھر شام کے پکنے کو جنس دینی بچوں کو ناشتہ کرانا۔ بستر لگانا۔ سب خود کرنا ہوتا تھا کپڑے تک ان کے گھر میں دھوتی تھی۔ مگر اسقدر محنت پر بھی وہ (شوہر) اپنی خوشی ظاہر نہ کرتے تھے ہر وقت بیہودگی میری ناقابلیت کی شکایت ہی رہتی تھی۔ سہ پہر سے جو نکلتے تھے تو رات کے گیارہ بارہ بجے تک آتے تھے اور حکم تھا کہ روٹی تازی تازی گرم توے سے اترتی جائے۔ اب ایک روپیہ ماہوار کی ملازمہ ماما کو بارہ بجے تک جاگنے اور یہاں بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ نہ میں زور ہی کرسکتی تھی شام سے فراغت پائی روٹی پکی اور گھر چلی گئی۔ اب میرا یہ نقشہ ہے کہ باورچیخانہ میں آٹا گندھا پیڑے بنے رکھے آگ جلائے توا چڑھائے بیٹھی ہوں کہ جیسے ہی بوٹ کی آواز آئے جھٹ چپاتی ڈالوں ایک بچہ جو شیر خوار ہے گود میں ہے دوسرا ضد کر رہا ہے کہ اماں پلنگ پر لیٹیں بڑے تینوں یہ کہتے ہیں کہ ہم اکیلے تو دالان میں نہیں سوتے

ڈر لگتا ہے تم بھی چل کر بیٹھو تو سوئیں" پانچوں مجھے لپٹے ضد کر رہے ہیں اور میرے آگے آٹے کی لگن خشکی کا طباق دھرا ہے اُنکی تکلیف و ضد اُٹھا رہی ہوں مگر اُن کے باپ کے لیے گرم روٹی کا انتظام نہیں چھوڑ سکتی آخر نیند سے مجبور ہو کر بڑے تینوں تو وہیں پلنگ پر (باورچی خانہ میں ایک پلنگ پر میں نے دری بچھا رکھی تھی) لیٹ کر سو گئے چوتھا وہیں میرے قریب پیڑھی پر پاؤں لٹکائے اونگھ گیا پانچواں تو گود میں تھا ہی جو میرا دودھ نہیں خون چوس رہا تھا - روزانہ اسی حالت میں کسی دن گیارہ - کسی دن بارہ بجتے جب وہ آتے فوراً ہی چپاتی بنا کر توے پر ڈالتی اب سنو اس ناخدا ترس کی بجائے خوش ہونے و افسوس کرنے کے یہ کہتا کہ "اُف تم بھی کسقدر نادان ہو پرورش اولاد کے بالکل ناقابل ہو تعلیم جو نہیں کیا کرو دھوئیں میں بچوں کو ڈالا ہوا ہے اس بیچارے کے پیر زمین میں لٹک رہے ہیں - ان کو سلا کر یہاں آنا تھا لاؤ جلدی کھانا" اور ایک آواز میں یہ سب کچھ ادا کیا اور اُلٹے پیروں باہر بیٹھک میں چلے گئے میں نے جلدی جلدی کھانا نکالا بڑے لڑکے کو (جس کی عمر آٹھ سال کی تھی) جگا کر باہر بھیجا کہ کھانا تیار ہے اور خود بچوں کو سمیٹ کر دالان میں چلی گئی تب باہر سے نوکر آیا اور سینی اُٹھا لے گیا بچوں کو سُلایا جلدی جلدی پان بنائے - باہر بھیجے کہیں ایک بجے برتن آجانے پر پلنگ پر پڑی اور صبح ہی ۵ بجے پھر اُٹھنا - کسی دن وہ گھنٹے بھر کو کھانا کھا کر اندر آجاتے تھے ورنہ وہیں سو رہتے تھے - صبح چار چنے آتے پندرہ منٹ رہے پھر باہر - اب آجکل یہ ہے میری عین بہار زندگی جس کی تمنائیں کنواری لڑکیوں کو ہوتی ہوں گی - دنیا کی نظروں میں کچھ بھی بُرا نہیں خدا کے فضل سے تنو مند لائق پانچ بچوں کی ماں گھر بار سب کچھ حاصل ہے - شوہر بھی سمجھتا ہے کہ جیسا جس نے جوڑی کو رکھا ہے دوسرا کم رکھے گا - اور میں صبر و تحمل سے سب

برداشت کر رہی ہوں۔ یہ ایک میرا ہی حال نہیں بلکہ قریب قریب سب مسلمان مستورات ہند کی یہی حالت ہے۔ جس کی ان کو کچھ شکایت نہیں۔ اپنے سہاگ قائم رہنے کی دعائیں کرتی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اُنھیں میں مَیں بھی ایک ہوں۔

لیکن اے انصاف والو! خدائے عادل و رحیم کے بندوں اتنا سمجھ رکھو کہ ایک دن تم کو بھی کسی طاقت کے سامنے جواب دینا ہوگا۔ یہ خودمختاری خود فعلی چند روزہ ہے جب بیکسوں کی فریاد سُنی جائے گی تم سے بھی پرسش ہوگی۔ ہماری تو اچھی یا بُری گذر رہی ہے گذر جائے گی۔

ایک ہندوستانی مسلمان عورت

شکریہ اس امر کے اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ "تمدّن" کی موجودہ حالت کیا ہے کیونکہ انصاف پسند ناظرینِ "تمدّن" نے گذشتہ چھ ماہ میں بخوبی اندازہ کرلیا ہوگا۔ ناظرینِ "تمدّن" کی خدمت میں اسقدر عرض کردینا ناموزوں نہوگا کہ وہ اگر "تمدن" کو اس سے بہتر حالت میں دیکھنے کے خواہشمند ہیں تو انکو "تمدّن" کی توسیع اشاعت کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر "تمدّن" کے ناظرین میں سے صرف سَو حضرات نے بھی ہم کو ایک ایک خریدار عنایت کیا تو ہم یقیناً اس قابل ہوجائیں گے کہ سابق کی طرح "تمدّن" میں تصویریں بھی شائع کرنے لگیں گو اس زمانے میں جبکہ کاغذ کی گرانی ناقابل برداشت ہے کسی رسالے کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ اپنی ظاہری آب و تاب قائم رکھ سکے مگر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر ہم کو سَو خریدار اور مل گئے تو ہم تصویریں بھی شائع کرنی شروع کردینگے۔ جن حضرات نے اسوقت تک توسیع اشاعت میں کوشش فرمائی ہے انکے نام نامی شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں:-

جناب چودھری شفیق الرحمان صاحب رئیس۔ جناب چودھری حامد حسین خانصاحب رئیس۔ جناب قاضی عبدالصمد صاحب عزیز۔ جناب ڈاکٹر مشرف الحق صاحب ایل۔ ایم ڈی۔ جناب مولانا حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی۔

میرا خیال ہے کہ

ہم گلستان جہاں کے پھول ہیں

(دوسری سہیلی کے خیالات)

کیسی ہی پُر بہار جگہ کتنا ہی پُر فضا چمن کسقدر دلچسپ مقام کیوں نہو اگر وہاں یہ گلِ وفا (یعنی عورت) موجود نہیں ہے تو اُس کی دل کشی و دلفریبی میں اک کمی ہے۔ میں تو یہی سمجھتی ہوں شاید اس لیے کہ ابتدا ء عمر سے اپنے پیارے باپ اپنے عزیز بھائیوں ماموؤں چچاؤں وغیرہ سے ایسا ہی سُنا ہے جسکا یہ نتیجہ ہے کہ میرے دل میں عورت ذات کی بہت ہی قدر ہے اور نہ میرے اپنے ہی دل میں بلکہ یہ سمجھتی ہوں کہ کل مردوں کے دل میں اس صنفِ نازک کی قدر ہے اور بغیر اسکے وہ اپنے زندگی کو پُر لطف نہیں بنا سکتے۔ اوروں کو تو جانتی نہیں اپنا کچھ حال سُناتی ہوں شروع سے آج تک کا مختصر مختصر قصۂ زندگی یہ ہے اماں جان کی شادی کے دس سال بعد میں پیدا ہوی میری پیدایش کی وہ دھوم وہ خوشی ہوی کہ کسی کے بیٹے کی نہوئی ہوگی۔ تمام گھر والے مسرت و انبساط سے پھولے نہ سماتے تھے۔ خوش قسمتی سے میرے دادا جان بھی زندہ تھے۔ چھوٹے چچا تہد و قمیں چھوڑ کے پھرتے تھے۔ پھر تمام گھر دادا جان کو انعام کے لیے لپٹ گیا اُنھوں نے بھی بہت خوشی سے اپنے روپیوں کی تھیلی کا مُنہ کھول کر خوب انعام دیا۔ اُسی وقت سے شادیانے بجنے لگے بڑے ہی سامان سے چھٹی و عقیقہ ہوا بہت روپیہ صرف کیا گیا۔ اب میں دادا جان کی گود کی رونق دل کا چین آنکھوں کی ضیا رہتی۔ گھر بھر مجھپر قربان ہوتا تھا میری پرورش و تربیت کا بہت انتظام

ایک بچی کے دودھ پلانے کو دُودُوا انائیں مقرر تھیں تین کھلائیاں۔ غرض کہ جوں جوں بڑھتی گئی میرے چاؤ چونچلے بڑھتے ہی گئے۔ گو میرے بعد خدا نے میری اماں جان کو بیٹے بھی دیئے مگر جو میری قدر تھی اُن کی نہ تھی۔ پانچواں سال لگا تو بڑی دھوم دھام سے بسم اللہ کی گئی۔ ابا جان بھی دادا جان کے برابر ہی مجھے چاہتے تھے۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ "کہتے بیٹوں کی ماں تم ہو اور بیٹی میری ہے" چنانچہ ایسا ہی ثابت کیا لڑکوں کو اماں جان نے پرورش کیا اور میں باپ کی گود میں پلی۔ جب وہ زمانہ نزدیک آیا کہ مجھے علیٰحدہ کرنے کی فکر کی جائے تو اماں جان نے اس کام پر زور دیا مگر ابا جان نے جہاں تک ہو سکا ٹالا۔ وہ کہتے تھے کہ "میں بغیر اپنی ننھی کے گھر میں کس طرح رہوں گا میں اس کی شادی نہ کروں گا" لوگ بہت ہی ٹوکنے لگے میری بھی عمر چندرہ سال سے اوپر نکل گئی بیسیوں جگہ سے پیام آئے جو صرف علیٰحدگی کے خیال سے ابا جان نے نامنظور کر دیئے۔ لیکن تا بہ کے؟ آخر مجھے جدا کرنا ہی پڑا۔ کیا دل پر صبر کی سل رکھ کر ایک رشتہ تجویز ہوا۔ اللہ کی بھی بہت ہی مہربانی میرے حال پر ہوئی کہ میرا آیندہ زندگی کا ساتھی کچھ کم چاہنے والا نہ تھا۔ وہ ایسا ملا جس نے عاشق باپ کی جدائی میں مجھے سنبھالا خوش کیا اور خوش رکھا۔ تمام سسرال مجھے آنکھوں پر بٹھاتی اور کیوں نہ بٹھاتی جب کہ میرا نازبردار میرا قدر دان شوہر مجھ پر دل سے فدا ہوتا تھا۔ دُلہناپے کے چند دن بہت ہی عیش و آرام سے کٹے۔

اسکے بعد مجھے اپنا گھر کرنا پڑا۔ میرا عزیز شوہر مجھے اپنی نوکری پر لے گیا۔ جہاں ایک چھوٹے سے مختصر خوشنما گھر کو میں نے اپنے لیے آغوش محبت پھیلائے پایا میں یہ جانتی تھی کہ میرے ہر چہار طرف محبت ہی محبت برس رہی ہے۔ اُس

پیارے جان سے پیارے مکان کی ہر در و دیوار سے میرے لیے پیار ٹپک رہا ہے اسکے چھوٹے باغیچے سرسبز گملے معطر گلدستے مجھے چاہتے اور اپنی محبت بھری خوشبو سے اظہار الفت کر رہے ہیں۔ اور کیا بتاؤں اس مکان عزیز کے سب سے زیادہ عزیز دو گوشوں کی بابت جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہو گئے تھے ایک تو میرا کمرہ دوسری وہ جگہ جہاں پائیں باغ میں روش پہ ایک چھوٹا سا بنچ پڑا تھا جس پر میرے آرام کے خیال سے میرے راحت رسان حقیقی (بعد خدا میرے مالک مجازی) نے ایک سبز مخملی گدا (کشن) ڈال رکھا تھا اس بنچ پر ہم روزانہ صبح صبح طلوع آفتاب سے پیشتر نسیم سحر کا لطف اٹھانے جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ اُسوقت کی بہار اسوقت کی دلچسپی و دلفریبی کوئی میرے دل سے پوچھے۔

پوچھے تو مگر میں شاید بیان نہ کر سکوں۔ اُن جذبات پُر لطف کا دل سے زبان تک لانا محال ہے۔ تاہم جس قدر سُنا سکتی ہوں سنو میرا شوہر اس وقت سونے سے اُٹھکر لباس شب خوابی میں ہی ادھر چلا آتا تھا اُسکا سفید دھاری دار سلیپنگ سُوٹ سر کے پریشان بکھرے ہوے بال چمکیلی کشادہ پیشانی پہ کچھ عجیب مدہوش کرنے والے ثابت ہوتے تھے۔ چونکہ اسوقت ذرا سردی ہوتی تھی میں چاہتی کہ وہ اپنا رگ لپیٹ کر باہر چلیں مگر نہیں مانتے تھے ہمیشہ میری ہی گرم شال لے کر آتے اور یہ کہتے کہ "اس میں جو خوشبو و دلپسند ہے وہ میرے موٹے کمبل میں کہاں۔ اسکو تو میں سالوں سے اوڑھ رہا ہوں کچھ لطف نہیں پایا سوا بوجھ ناگوار کے۔ مگر اس چادر محبت میں جو آرام ملتا ہے اسکو میں ہی جانتا ہوں" چنانچہ میری کسی ہلکے رنگ کی شال اُنپر ہوتی تھی اور اُن کے اوورکوٹ کا بالائی "شولڈر کیپ" میرے سر پہ پڑا ہوتا

سالی کا اُبٹنا وہ استعمال تھا اُس میں وہی خوشبو بسی تھی جو اُن کے جسم میں تھی۔ بس ہم دونوں کمرہ سے نکل کر اس گوشۂ الفت میں آکر اُس بنچ پر بیٹھ جاتے۔ مجھے کچھ خبر نہ رہتی کہ کہاں ہوں۔

اک عجیب حالت محویت میں وہ دھندلا وقت گذرتا جب زرد زرد سفیدی سحر نمودار ہونے لگتی تو میں بہت خوش ہوتی کہ اب اُن کا چہرا مجھے نظر آنے لگے گا۔ پو پھوٹتے ہی وہاں اور چند جاندار بھی آکر ہمارے شریک حال ہوتے اور پُرمسرت گانوں سے ہمارے بیہوش و بے فکر دلوں کو ہوشیار کرنا چاہتے یعنی کچھ خوبصورت چڑیاں ننھے غنچوں پر بیٹھکر چہچہانا شروع کرتیں جن کی خوشگوار و بیدار کرنے والی شیریں آوازوں سے ہم چونکتے ہشیار ہوتے اور اپنے اُس مالک حقیقی کی بندگی کا خیال آتا جس نے وہ نعمت مجھے بخشی تھی۔ بس وہیں وضو کرکے دو رکعت فریضہ ادا کرتے۔ پھر تھوڑا ٹہلتے کھیلتے ہوئے پھولوں سے دل بہلاتے جن پر شبنم کے قطرے مثل ننھے موتیوں کے چمکتے ہوتے تھے۔ جو سورج کی کرنوں سے آدھے سفید آدھے سنہری نظر آتے تھے۔ اور اکثر مذاق سے وہ اس پر ہاتھ رکھکر کہتے کہ لاؤ یہ چھوٹے موتی یہاں سے اُٹھا کر تمہارے بالوں میں پرو دوں پھر چند چھوٹے خوبصورت پھول توڑ کر میرے سر پر لگا دیتے اب سورج اچھی طرح نکل آتا نوکر لوگ کمرے صاف کر چکتے اور ہم واپس اندر جاتے۔ منہ ہاتھ دھو کر بال بناتے کپڑے بدلتے کہ چاء تیار ہونے کی اطلاع ملتی بعض بعض دن ہم اپنے ہاتھ سے وہیں چاء بنا کر پی لیتے۔ میرے ہاتھ کی بنی ہر ایک چیز کو وہ بہت پسند کرکے شوق سے کھاتے۔ اسکے بعد اپنے کمرے دفتر میں جا بیٹھتے اور میں گھر کے کاموں کی طرف متوجہ ہوتی۔ نوکروں کی صفائی جھاڑ پونچھ سے مجھے اطمینان نہ ہوتا تھا ایک ایک پھر ہر ایک چیز کو اپنے ہاتھ سے صاف کرتی کھانا پکوانے کو جنس تلوا کر بھیجتی اور

اس سے فراغت پاکر کچھ لکھنے پڑھنے یا سینے لگ جاتی۔ ۹ بجے وہ دفتر جاتے لیکن اس اثنا میں بھی چند بار کئی کئی منٹوں کو میرے کمرے میں کھڑے ہوجاتے تھے قریب بارہ ۱۲ کبھی ایک بجے کے دفتر سے واپس آکر کھانا کھاتے وہ وقت بھی بہت اچھا گذرتا پھر تھوڑی دیر آرام کرکے سہ پہر کے کاموں میں مشغول ہوتے میں نماز ظہر سے فارغ ہوکر باورچی خانے کا سامان دلواتی۔ اور بعد عصر اکثر ہم دونوں کسی ایک جگہ شام کی ہوا خوری کو چلے جاتے کبھی وہ الگ اپنے دوستوں میں اور میں الگ بھی ٹہلنے جاتے لیکن اسوقت کا بیقراری سے انتظار ہوتا تھا کہ کب گھر پہنچیں اور وہی راحت میسر ہو کہ ہم ایک جگہ ہوں بعد مغرب کبھی قریب عشا گھر واپس ہوتے اکثر میں گھر ہی ہوتی تھی اُن کے بوٹ کی آہٹ سُن کر خوشی سے دل اُچھل پڑتا وہ کمرے میں داخل ہونے کی جلدی کرتے اور میں دروازہ میں جا کر لینے کی۔ غرضکہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہوکر ایک منٹ بھی پوری خوشی حاصل نہ کرسکتے تھے۔

کچھ دن تو اسی طرح تنہائی و بیفکری میں گذرے پھر بفضل خدا وہ زمانہ آیا جو اگر نہ آتا تو میں دنیا کی بدنصیب بے اولاد و ناشگفتہ مراد عورتوں میں شمار کی جاتی۔ خدا نے وہ وقت دیا جسکے لیے میں حقیقتاً بنائی گئی تھی۔ یعنی ہمارے گھر کا چراغ گُل مراد ہم کو ملا۔ میرے لڑکا پیدا ہوا۔ بالکل اپنے باپ کی شکل۔ جس سے میں بہت خوش ہوئی کہ جس وقت اس کا باپ گھر موجود نہوا کرے گا میں اسکی پیاری شکل دیکھ لیا کروں گی اپنے باپ کو بھی وہ بہت عزیز تھا وہ کہتے تھے کہ ابتک جو ہم لوگ اپنے گھر کے ان بیجان پھولوں سے دل خوش کیا کرتے تھے یہ بیفائدہ تھا اب خدا نے وہ زندہ اصلی پھول دیا ہے مگر یہ بھی تمھاری ہی خوبی ہے اگر تم نہ آتیں تو میں اس گُل کو کیونکر پاتا تمھارے ہونے سے نہ صرف میرا قصبہ میرے گملے اور گلدستے ہی سرسبز و تازہ ر[illegible]

تھے بلکہ ایک اور سب سے زیادہ قیمتی و خوشنما و دلخوش کن پھول بھی تم نے کھلا دیا۔ بچہ پیدا ہونے سے میری مصروفیت زیادہ اُسکی طرف ہونے لگی۔ اس سے پہلے مجھے صرف رات دن ایک اُسی کے خیال میں اُسی کے محبت و آرام و خوشی کے انتظام میں لگا رہنا یا گھر کی دیکھ بھال وکیاریوں کا سینچنا ہی رہتا تھا۔ اب اس نوشگفتہ پھول کی پرورش بھی عاید ہو گئی۔ میری مسرتوں میں ایک بیش بہا اضافہ ہوا۔ اُن سے فراغت پاکر بھی میں دن بھر اپنے ننھے بچے اور گھر کے پھولوں میں مصروف رہنے لگی۔ میں نہیں بیان کرسکتی کہ کس قدر خوشی تھی اسکا اندازہ خود میں بھی نہیں لگا سکتی۔ دنیا میرے لیے بہشت اور میں اپنے گھر کی حور تھی۔ صرف اتنا کہہ سکتی ہوں۔

کس طرح لوگ کہتے ہیں کہ عورت "ناچیز ہے بیکار ہے عورت وبال جان ہے" جگ بیتی کو کیا جانوں میں تو آپ بیتی کہتی ہوں۔ میں تو اپنے میکے اور پھر اپنے شوہر کے لیے گویا نعمت غیر مترقبہ تھی میں بہت خوش ہوں کہ دنیا میں آنے کا میں نے پھل پایا۔ سب سے زیادہ قابل قدر و قیمتی شے یعنی "محبت" وہ میں نے بھرپور حاصل کی۔ میرا شوہر مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہے اگر میں اُسپر پروانہ وار نثار ہوں تو وہ مثل بھونرے (گو یہ تشبیہ غلط ہے بھونرا بدنما سیاہ اور میرا شوہر خوبصورت چاند کا ٹکڑا) کے میرے گرد پھیر فدا ہوتا ہے۔ میں اسکو دیکھ کر جیتی ہوں تو وہ بھی میرا ہی دم بھرتا ہے۔ غرض کہ میں دنیا میں ایک گہوارۂ محبت میں جھولکر ایک پُرنشہ و بے فکر زندگی بسر کر رہی ہوں۔ خدا میرے سے نصیب سبکو دے۔ اب ایک آخری تمنا یہ ہے کہ اپنے ابا جان و بھائیوں کے سامنے اپنے شوہر کے ہاتھ سے وہ قیام گاہ ابدی بھی حاصل کروں جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔ میرا شوہر میرے باپ اپنے محبت بھرے ہاتھوں سے مجھے تہ خاک آرام سے سلائیں۔ آمین یا رب العالمین۔ ایک خوش نصیب بہت

نام اور نسب

ابوالفیض نام، فیضی تخلص ہے آخر میں فیاض تخلص کیا۔ چنانچہ اس بارہ میں خود اسکے دو بیت شاہد ہیں ؎

زین پیش کہ سکہ ام سخن بود — فیضی رقم نگین من بود
اکنوں کہ شدم بعشق مرتاض — فیاضیم از محیط فیاض

مگر شہرت فیضی ہی کی ہوئی۔ خاندان کے بارہ میں اسکے چھوٹے بھائی ابوالفضل کا جو بیان ہے۔ میں یہاں پر صرف اسکا ذکر کردینا کافی سمجھتا ہوں۔ ابوالفضل نے اپنی کتاب آئین اکبری کے خاتمہ پر اپنے خاندان کے حالات میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ملخص اور ماحصل یہ ہے۔

"اسلاف میں سے کچھ دولت و امارت، کچھ علم و فضل اور کچھ عزلت نشینی اور ترک دنیا کے لباس میں اپنی عمریں بسر کر گئے۔ ان زندہ دلوں کا وطن یمن تھا۔ پانچویں پشت میں شیخ موسیٰ نامی بزرگ میرے دادا تھے۔ جن کا خیال ابتدا سے ترک دنیا اور زاویہ نشینی علم و فضل کی طرف مائل تھا مگر بعد چھوڑ کر ترک وطن اور سفر پر آمادہ ہوئے۔ اور نویں صدی میں علاقہ سندھ کے قصبہ ریل میں پہنچے۔ اور وہیں خانہ داری پھیلائی۔ شیخ موسیٰ اگرچہ جنگل سے آکر شہر میں آباد ہوئے لیکن اپنی تمام عمر درویشانہ انداز سے گزاری۔ ان کے بیٹے پوتے بھی انکے نقش قدم پر چلتے رہے۔ دسویں صدی کے آغاز میں شیخ خضر (یعنی ابوالفضل کے دادا) کو آرزو ہوئی کہ اولیاء ہند سے ملاقات کریں اور وہاں سے عرب کی سیر کرتے ہوئے اپنے بزرگوں کی نسل سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہو جائے۔ یہ بزرگ اسی خیال سے بہت سے رشتہ داروں اور دوستوں کو لے کر ناگور جو (اجمیر کے شمال و مغرب میں واقع ہے) میں وارد ہوئے۔ یہاں

کئی نیک سیرت بزرگوں سے نیاز حاصل کیا۔ ان کے فیوض سے فیضیاب ہوئے اور ان ہی کے ایما سے سفر کا ارادہ فسخ کر کے ناگور ہی میں سکونت اختیار کی ابتدا میں شیخ خضر کے کئی بچے ہوئے مگر سب مرگئے۔ آخر ۹۱۱ھ میں شیخ مبارک اللہ (یعنے ابوالفضل اور فیضی کے باپ) پیدا ہوئے "

شیخ مبارک اپنے زمانے کا ایک بےمثل عالم تھا۔ زمانے کے دست حسد کی یہ فطرت ہے کہ جب کسی باکمال کے ستارے کو فضل وکمال کے آسمان پر چمکتا دیکھتا ہے تو اسپر مصائب وآلام کی خاک ڈال کر دھندلا کر دیتا ہے۔ شیخ مبارک نے بھی ان ہی مصائب وآلام سے تنگ آکر اپنے وطن ناگور کو چھوڑا اور ایک مدت پریشان حال اور بے خانماں رہنے کے بعد شیخ یوسف مجذوب اور علاؤالدین مجذوب کے ارشاد سے ۲۰ محرم ۹۵۰ھ میں آگرہ آئے اور دریاے جمنا کے پار شہر کے مقابل چار باغ نامی بستی میں سکونت اختیار کی۔ وہاں ایک قریشی گھرانا رہتا تھا جو علم وفضل سے مالامال تھا شیخ مبارک نے اسی خاندان میں شادی کی۔

فیضی کی پیدائش

۹۵۴ھ جبکہ ہندوستان کا تخت حکومت شیرشاہ کے بیٹے سلیم شاہ کی جلوہ فروزی سے پارونق ہو رہا تھا تو آگرہ کے مقابل چار باغ کی سرزمین بھی عالم معنی کے تاجدار کی آمد آمد کی خبر سنکر کچھ عجیب نشاط انگیز اور بہار دار ہو رہی تھی دریاے جمنا کی لہریں خوشی کے مارے اچھل اچھل جاتی تھیں کہ عنقریب اسکے پاس سے ایک ایسا چشمہ جاری ہونے والا ہے جو دنیا کے سوکھے اور مرجھائے ہوئے پودوں میں ایک تازگی اور نئی روح پھونکدے گا۔ بالآخر اسی سال جبکہ شیخ مبارک کا سن ۴۳ سال تک پہنچ چکا تھا۔ ان کے گھر میں سپہر فضل وکمال کا ماہ کامل یعنی شیخ ابوالفیض فیضی پیدا ہوا۔

سن شعور اور تحصیل علم

بچپن کی زندگی نہایت افلاس و عسرت میں گذری۔ باپ کی نحوست کے سایہ میں وہ وہ تکلفیں اُٹھائیں جو ناقابل برداشت تھیں۔ غریب باپ بھی نوشتہ تقدیر کو کیا کرے جو کچھ لکھا تھا اسکو کون مٹا سکتا تھا۔ باایں‌ہمہ صعوبت و مصائب بچے کی تعلیم سے ذرہ برابر بھی غافل نہیں رہا۔ خود فضلاے عصر کا سرتاج تھا۔ اسلیے بیٹے کی تعلیم کے لیے کسی دوسرے کی احتیاج نہ تھی۔ خود تعلیم دیتا تھا۔ ہر علم کی کتابیں نہایت خوش اسلوبی سے پڑھائیں ہر فن میں دستگاہ پیدا کردی علوم عقلی و نقلی سب میں ایک مہارت اور ملکہ پیدا کردیا۔

فن شاعری

فیضی نے شاعری میں جو فضل و کمال دکھایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعرانہ دل و دماغ لے کر پیدا ہی ہوا تھا۔ اور ملک الشعرا کا جو خطاب اسکو اکبر کے دربار سے ملا۔ وہ در اصل روز ازل ہی سے قسام ازل نے اپنے دربار خاص سے اسکو عنایت کیا تھا فیضی نے اور علوم و فنون کی طرح شاعری کے لیے بھی کسی دوسرے کے آگے زانوے شاگردی تہ نہیں کیا۔ جو کچھ سیکھا اپنے باپ سے سیکھا۔ اس فن کے تمام اسرار و رموز بھی اسکے باپ شیخ مبارک ہی نے اسپر کھولے۔ شیخ مبارک اگرچہ خود شاعر نہ تھا لیکن ہمہ دان فاضل تھا اسلیے بیٹے کا کلام دیکھتا، اسمیں زبان اور فصاحت و بلاغت کی چاشنی پیدا کرتا۔ رموز سخن اور نکتہ نکتہ سے بیٹے کو آگاہ کرتا رہا یہانتک کہ فیضی ایکدن سپہر شاعری پہ ہلال بنکر طلوع ہوا اور بدر کامل بن کر چمکا۔

فن طب

علاوہ ان علوم و فنون کے فیضی نے علم طب کو بھی حاصل کیا۔ اور اسمیں بھی پوری مہارت اور دستگاہ پیدا کی مگر اس سے بجز خدمت بندگان الٰہی اور کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ علاج کرتا تھا لیکن کسی سے اجرت نہ لیتا تھا۔ بلکہ بسا اوقات جب اسپر

تنگی رزق نہ ہوتی تو دوائیں بھی مریضوں کو اپنے ہی پاس سے دیتا۔ رفتہ رفتہ جب اوج و اقبال نے منھ دکھایا اور افلاس و ادبار نے ہمیشہ کے لیے پیٹھ پھیری تو رفاہ عام کی غرض سے ایک شفاخانہ بھی کھول دیا۔

شیخ مبارک کے فضل و کمال نے اس کے بہت سے حاسد بھی پیدا کر دیے۔ جو ہر موقع پر تکلیفیں پہنچاتے رہتے تھے۔ اور ان حاسدین میں مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری اور شیخ عبدالنبی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ عوام میں بھی با اثر تھے۔ اور ان ہی کے ہاتھوں میں سلطنت کی باگ بھی تھی۔ شیخ مبارک اپنے استغنا و دلی اور علم و فضل کے آگے انکو کب خاطر میں لاتے تھے۔ شدہ شدہ کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ یہ لوگ شیخ مبارک کی ایذا رسانی کے در پے ہوے۔ کبھی تشیع کا الزام لگایا، کبھی فرقہ مہدوی کا پیرو مشہور کیا غرض آئے دن ایک نہ ایک نئی مصیبت شیخ مبارک کے سر پر لاتے رہے۔

فیضی کی شہرت اور دربار اکبری میں طلبی

یہانتک کہ جب فیضی کے عطر سخن کی شمیم انگیزی فضاے عالم میں پھیلکر دربار اکبری میں پہنچی۔ تو فیضی کی شاعری اور اسکے فضل و کمال نے اکبر سے سفارش کی۔ اور شہنشاہ اکبر نے فیضی کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ بدخواہ حاسدوں سے اسوقت بھی نہیں رہا گیا اور اس رحمت و عنایت کی طلب کو قہر و عتاب کے رنگ میں رنگ دیا۔ اور حاکم آگرہ کو اسطرح لکھا کہ "شیخ مبارک کے لڑکے فیضی کو وہ جہاں اور جس حال میں ہو ہوا سمیت ساتھ دربار میں بھیجو" کچھ بات گئی تھی کہ چند ترکوں نے گھر پر آکر شور مچایا۔ دشمنوں نے ان سپاہیوں کو یہ پٹی پڑھائی کہ شیخ مبارک بیٹے کو چھپا دے گا۔ اور تمہے بہت حیلے حوالے کرے گا۔ ڈرائے دھمکائے اور سخت گیری کے بغیر کام نہ چلے گا۔ ادھر اتفاق ہو کہ اتفاقاً فیضی گھر میں نہ تھا۔ باغ کی سیر کو گیا ہوا تھا۔ ترک سپاہیوں نے بہت شور و غل مچایا اور شیخ مبارک کو خبر دی تو انھوں نے صاف طور پر حقیقت حال کہا

وہ ظاہر کر دیا۔ سپاہیوں کو دشمنوں کی بات کا یقین آ گیا کہ شیخ بہانہ کرتا ہے اور زیادہ شور و غل مچانا شروع کیا۔ قریب تھا کہ کوئی فتنہ بپا کریں اسی اتفاق سے فیضی آ پہنچا حال معلوم کرنے پر سفر کی تیاریاں شروع کیں۔ لیکن افلاس و غربت کے مارے آمدنی کا رستہ بند تھا۔ سامان سفر کس طرح مہیا ہو۔ خیر عقیدتمندوں اور شیخ مبارک کے شاگردوں کے ذریعہ یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ اور رات ہی کو فیضی گھر سے روانہ ہو گیا۔

فیضی دربار اکبری میں

فیضی تو گھر سے روانہ ہو گیا لیکن ادھر گھر کے تمام لوگ رنج و الم کے دریا میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے اور نہایت اضطراب کے ساتھ اس خبر کے سننے کے لیے پریشان تھے کہ بادشاہ نے کیا سلوک کیا۔ چند روز کے بعد یہ خبر آئی کہ شہنشاہ جہاں نے غریب نوازی کی اور اپنے رحم و کرم کے سایہ میں جگہ دی۔

فیضی جب اکبر کے پاس پہنچا تو اکبر ایک ایسے کمرہ کے اندر بیٹھا تھا جس کے گرد جالیدار کٹہرا لگا تھا۔ فیضی جب حاضر کیا گیا تو اس سے باہر کھڑا تھا۔ اسوقت فیضی نے بادشاہ سے مخاطب ہو کر برجستہ اور فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی۔

بادشاہا درون پنجرہ ام　　از سر لطف خود مرا جا دہ
زانکہ من طوطی شکر خارم　　جائے طوطی درون پنجرہ بہ

اکبر اس بے ساختہ پن حسن استدعا اور برجستہ گوئی سے بہت محظوظ ہوا اور لطف و عنایت کے ساتھ اندر آنے کی اجازت دی۔ (باقی دارد)

ابو محمد ستار ندوی اشرف پوری

ہم سب کے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ [illegible] کی [illegible]
جتنی [illegible] ترقی [illegible]

اس طرح چھپ گئے ہیں کہ بالکل نہیں معلوم ہوتے۔ دیکھنے کے قابل اس مقام پر یہ بات ہے کہ جوڑا اور وہ بھی گھنے ہوئے بالوں کا جوڑا ایک نمایاں چیز ہے اسکا چھپنا بالوں سے اور وہ بھی چھپ جانے میں طریقہ بالوں کی اس کثرت کو بتلا رہا ہے کہ جو غیر معمولی شان رکھتے ہیں اس شعر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ عرب کی عورتیں اپنے بالوں کی آرایش اس عہد میں اس طریقے سے کرتی تھیں اور یہی غالباً اس زمانے میں سب سے بہتر طریقہ آرایش تھا جبکہ ہمارے حسن پرست امرء القیس نے اپنی معشوقہ کے لیے منتخب کیا ہے واقعی خوش قسمت تھا اور بہت خوش قسمت تھا امرء القیس ایسے حسن پرستی اور شاعری کے لحاظ سے جسکے عشق اور شاعرانہ جذبات کی نشو و نما ایسے خطہ میں ہوئی جسکے ذرہ ذرہ میں حسن و عشق کا ہیولا مضمر تھا اور صرف یہی نہ تھا بلکہ حسن کو اپنے تمام اثرات کا احساس اور پورا احساس بھی ہوتا تھا۔

وَكَشْحٍ لَطِيفٍ كَالْجَدِيلِ مُخَصَّرٍ — وَسَاقٍ كَأُنْبُوبِ السَّقِيِّ الْمُذَلَّلِ

اس شعر میں معشوق کی کمر اور پنڈلیوں کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کمر اسکی نزاکت اور پتلے پن میں مثل مہار ناقہ کے ہے جو نرم اور لچکدار ہوتی ہے اور پنڈلی اسکی مثل گھوکے ہے جو اپنی شادابی اور تر و تازگی اور صفائی کی وجہ سے جھکی رہتی ہے یا مثل اس بند نیچے کے ہے جسکو پانی شاداب و نرم کرتا رہتا ہے ان تشبیہوں سے اعراب کے طرز معاشرت اور زندگی کا پتا چلتا ہے جیسا طرز معاشرت تھا ویسے ہی خیالات اور ظرافت شاعری بھی ہیں لیکن ہر شعر سے ایک نیچرل انداز تخیل ٹپک رہا ہے اور یہی اسمیں دیکھنے کے قابل بات ہے

وَتُضْحِي فَتِيتُ الْمِسْكِ فَوْقَ فِرَاشِهَا — نَؤُومُ الضُّحَى لَمْ تَنْتَطِقْ عَنْ تَفَضُّلِ

اس شعر میں معشوق کی خوابگاہانہ اور حسن کے مدارج کمال دکھاتا ہے کہتا ہے کہ جب صبح ہوتی ہے محبوبہ میری استخواب ناز سے بیدار ہوتی ہے تو بستر خواب پر مشک کے ریزے

پائے جاتے ہیں جو اُسکے سونے کی حالت میں اُسکے جسم سے پیدا ہوکر بستر کو معطر کرتے ہیں اور جب وہ جامۂ شبخوابی پہن لیتی ہے تو اُسکے بعد کمر کسنے کی ضرورت نہیں رہتی ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ کمر کس کے سونا یہ اُن لوگوں کی شان سے ہے کہ جنکو صبح ہوتے ہی فرائض وکام انجام دینا ہوتے ہیں میری معشوقہ کو اسکی کیا ضرورت ہے اس شعر میں گویا عنیزہ کی شان امارت بھی ظاہر کرنا مقصود ہے۔

تُضِيءُ الظَّلَامَ بِالْعَشِيِّ كَاَنَّهَا   مَنَارَةُ مُمْسٰى رَاهِبٍ مُتَبَتِّلِ

اس شعر میں معشوقہ کے حُسنِ عالم سوز کو ایک ایسی پیاری تشبیہ کے ساتھ ادا کرتا ہے کہ تو بہ معاذ اللہ رے سادگی اور اللہ رے جذب کوئی ایسا ہی تیّھر کا کلیجے والا ہوگا یا کیفیات حسن وعشق سے بالکل بیگانہ جسمیں امرؤالقیس کی اس تخئیل سے حرکت وجدانی نہ پیدا ہوجائے لکھتا ہے کہ میری عنیزہ کے چہرہ کی روشنی یعنی اُسکی برق حُسن تاریکی کو اسطرح روشن کردیتی ہے گویا کہ وہ راہب خدا رسیدہ یعنی تارک الدنیا لوگوں کی شمع ہے یعنی جس طرح راہبوں کا چراغ شام عام تاریکی میں بھولے بھٹکے ہوے مسافروں کو اپنی تیز روشنی سے فائدہ پہنچاتا ہے اُسی طرح عالم کی روشنی کے لیے میری معشوقہ کی شمع جمال ہے اول تو عنیزہ کی تشبیہ شمع سے یہی بجاے خود ایک پیاری اور نازک تشبیہ ہے پھر اُسپر خدا رسیدہ لوگوں کی قید نے معنوی خوبیوں میں اور چار چاند لگادیے میرے خیال میں اسمیں کوئی شک نہیں کہ یہ شعر داخلی اور خارجی پہلوؤں سے نہایت دلکش جواہرات کا مجموعہ ہے۔

اَلَا رُبَّ خَصْمٍ فِيْكِ اَلْوٰى رَدَدْتُهٗ   نَصِيْحٍ عَلٰى تَعْذَالِهٖ غَيْرِ مُؤْتَلِ

اب میں بعض وہ اشعار اس مقام پر لکھتا ہوں جسمیں امرؤالقیس نے اپنی معشوقہ عنیزہ سے مخاطب ہوکر اظہار وفا کیا ہے اور شبہاے فراق کی گذری ہوئی مصیبتیں اور شب فراق سے عالم بیخودی میں باتیں بیان کی ہیں کس قدر خوش قسمت ہے وہ عاشق جسکو

فراق کی تکلیفوں کے اظہار کا موقع معشوق سے نصیب ہو سکتا ہے امرء القیس جس کا حاصل یہ ہے کہ بہت سے ناصح جنھوں نے سختی کے ساتھ تیری محبت سے باز رکھنا چاہا تھا مجھے تیری بہتری کے خیال سے لیکن میں نے انکو واپس کر دیا اور کبھی انکی نصیحتوں کا اثر نہیں لیا یعنی میرے قدم تیری محبت میں نہ ڈگمگاتے تھے نہ ڈگمگائے اور دنیا کی کوئی قوت تیری محبت پر غالب نہ آسکی میرے خیال میں یہی وہ سچے جذبات ہیں جو محبت بھرے دل کی جان اور حسن و عشق دونوں کے لیے سرمایۂ ناز ہیں۔

وَلَيْلٍ كَمَوْجِ الْبَحْرِ أَرْخَى سُدُولَهُ ... عَلَيَّ بِأَنْوَاعِ الْهُمُومِ لِيَبْتَلِي

اور بہت سی فراق کی راتیں ہیں کہ جنھوں نے مثل سمندر کی موجوں کے قسم قسم کے اندوہ و صدمات کے ساتھ اپنی تاریک پوششوں کو میرے اوپر ڈال ڈال دیا کہ تیری محبت میں میرا امتحان کر لیں اور آزمائیں میری قوت صبر و شکیبائی کو۔

فَقُلْتُ لَهُ لَمَّا تَمَطَّى بِصُلْبِهِ ... وَأَرْدَفَ أَعْجَازًا وَنَاءَ بِكَلْكَلِ

پس کہا میں نے اس شب فراق سے جبکہ وہ رات ڈھل کے بڑھی اور اسکے پچھلے یعنی آخری ساعتیں ایک دوسرے کے بعد آنے لگیں اور اُن ساعتوں کا سلسلہ باوجود حصہ آغاز ختم ہو جانے کے نہ ٹوٹتا۔

أَلَا أَيُّهَا اللَّيْلُ الطَّوِيلُ أَلَا انْجَلِي ... بِصُبْحٍ وَمَا الْإِصْبَاحُ مِنْكَ بِأَمْثَلِ

یعنی اے بڑھتی ہوئی اور طولانی شب فراق اپنی تاریکی کو نور سے بدل دے تاکہ مجھکو صبح سے رہائی ہو۔

فَيَا لَكَ مِنْ لَيْلٍ كَأَنَّ نُجُومَهُ ... بِأَمْرَاسِ كَتَّانٍ إِلَى صُمِّ جَنْدَلِ

یعنی واسطے ہو تجھپر اے شب فراق کہ عجب رات ہے گویا کہ تیرے ستارے رسن ہائے کتان سے بھاری پتھروں میں بندھے ہوئے ہیں کہ اپنی جگہ سے جنبش ہی نہیں کرتے دیکھو ایک فراق کے مارے ہوئے دل کے جذبات حسرت نہ وہ زبان سے یوں اچھے

آتش عشق کے بھڑکے ہوئے عالم بیخودی میں یوں مناظر قدرت کو مخاطب کر کے بھڑکے ہوئے شعلوں پر آب پاشی کرتے ہیں مضطرب دل کو عالم بیکسی میں تسکین دینے کا یہ طریقہ ہے اُمنڈتے ہوئے جذبات محبت کا آتش غم سے جب یوں انقلاب ہوتا ہے تو اثر اپنے آغوش میں لے کر زمین کے طبقات اور آسمان کے پردوں میں آگ لگاتا ہے فضا میں کرۂ عشق سے جب اسے سیمابی ذرات اُڑا کر پہنچتے ہیں اور رقص کرتے ہیں تو دلوں پر بجلیاں ٹوٹتی ہیں اور پتھر کے کلیجے پانی ہوتے ہیں ایسے فراق نصیبوں کو پھر وصال معشوق کیونکر نصیب ہو۔

حسرت ہے تیری زندگی پر اے امرؤ القیس کاش ہماری بھی نشو و نما اسی ہلاکت انگیز سے ہوتی جس سے تو تھا جیسا میرا جی چاہتا ہے ویسی تنقید اس آخری شعر کی نہیں کر سکتا۔ اس شعر میں امرؤ القیس نے جذبات نفسانی کو دکھایا ہے دراصل جن کا تعلق حسیات نفسانی سے زیادہ ہے۔ اسوقت مجکو ایک اُردو کے زبردست شاعر کا اسی مضمون کا ایک شعر یاد آگیا ہے جسکو ناظرین "تمدن" کی دلچسپی کے لیے پیش کرتا ہوں دیکھو جلال مرحوم اسی خیال کو کس فلسفیانہ انداز سے ادا کرتے ہیں ؎

نہ جائے گی مرے گھر سے نہ جائیگی شب غم　　میں دیکھتا ہوں کہ گردش ہی آسماں میں نہیں

(باقی آئندہ)　　آشفتہ لکھنوی

ضروری گذارش

"تمدن" بلا طلب جن حضرات کی خدمت میں بھیجا یا کسی معزز دوست کی تحریک سے پہنچے براہ کرم فوراً اپنے ارادۂ خریداری سے مطلع فرمائیں ورنہ خاموشی رضامندی سمجھی جائے گی اور دوسرے ماہ میں اُنکا نام رجسٹر کر کے تیسرے ماہ کا پرچہ بذریعہ وی۔ پی بھیجا جائیگا جسکا وصول کرنا اُن کا قومی اور اخلاقی فرض ہوگا۔

منیجر

غزلیات

جناب نواب عسکری مرزا خانصاحب عرف بن صاحب بلیغ لکھنوی

لاش نکلی اسطرح گھر سے ترے ناکام کی
جسنے دیکھا رو دیا کچھ حد نہ تھی کہرام کی

عشق وہ آتا ہے کہ دنیا کی نہیں رہتی خبر
کچھ عجب تاثیر ہوتی ہے ترے پیغام کی

دوستی کرتے ہی تم سے اک قیامت ہوگئی
ساری دنیا بنگئی دشمن ہمارے نام کی

نفع اتنا میکدے سے شیخ کو حاصل ہوا
لیگئے تصویر آنکھوں میں چھلکتے جام کی

گر خدا چاہے گا خلوت گاہ بھی دیکھینگے ہم
ابتدا تو ہوگئی ہے نامہ و پیغام کی

یا الٰہی مجھکو دیوانہ کہیں سب حشر تک
مدتوں سے فکر ہے اپنے بنائے نام کی

صبر کرتے کرتے آخر ہوگیا مجھکو جنوں
اور باتیں ڈھونڈیے میرے لیے الزام کی

کل جو ہونا ہے پھر اُس سے آج فرصت کیوں نہو
زندہ رہجائیں مریں کس کو خبر انجام کی

عمر بھر قسمت میں اب رونا ہی رونا ہے بلیغ
اُٹھ گئیں دنیا سے سب باتیں مرے آرام کی

حضرت عزیز لکھنوی

مرے پیغ تڑپنا تو ضبط کی قوت دکھا دینا
نہ آئیں وہ تو اکدن آگ اس گھر میں لگا دینا

مریض ہجر کو تم زہر دینا یا دوا دینا
مگر بالیں سے دم بھر چارہ سازوں کو ہٹا دینا

بھلا پھر کر سکینگے چارہ گر کیا مندمل اُنکو
تری تفریح ہو جس وقت زخموں کا ہوا دینا

تمھارا فرض ہے اپنی سی کوشش چاہیے تمکو
مگر آساں نہیں ہے میری ہستی کا مٹا دینا

شکایت اک ہو جائے تربت میں جاتی نکلی ہو ہیں
ذرا ملنے جانے والے قبر پہ پھر مسکرا دینا

یہاں وہ وقت ہے اب دل کی قوت گھٹتی جاتی ہے
تمھیں تو کھیل ہے اک باتوں باتوں میں رلا دینا

کوئی تدبیر بن پڑتی نہیں کیا ہونیوالا ہے — مجھے آسان ہوتا کاش انھیں دلسے بھلا دینا
مری میت پہ کس دعوی سے وہ کہتے ہوئے آئے — ہٹا دینا ذرا ان رونیوالوں کو ہٹا دینا
اُٹھینگی آندھیاں غم کی جو ذرہ بھی رہا باقی — زمین دشت غربت خاک میری سب اُڑا دینا
کسی کو دیکھکر ایسا نہو میں پھر بہک جاؤں — مجھے روز جزا اک دوسرا دل اے خدا دینا
تمھارے سامنے اک دفتر راز محبت ہے — بدشواری کسی بیمار غم کا لب ہلا دینا
یہ کہکر قبر پہ پھر یاد اپنی کر گئے تازہ — ارے اے مرنے والے اب مجھے دلسے بھلا دینا
یہ مانا قلب کی جنبش نظام زندگانی ہے — ٹھہر جائے مرا دل چارہ گر ایسی دوا دینا
بہت گہری نظر ہے عشق پر حسن ستمگر کی — خداوندا مجھے جو درد دینا لا دوا دینا

عزیز اک دفتر پند و نصیحت کھلنے والا ہے
بڑھے گر اختلاج دل تو ناصح کو دعا دینا

جناب نواب سعید الدین احمد خاں صاحب طالب رئیس دہلوی

یہ دل کسی نہ کسی وجہ داغ دار رہا — ہزار شکر کہ یہ باغ پُر بہار رہا
صبا کی ضد سے جو اُڑتا مرا غبار رہا — بڑے عروج پہ یاد و میں خاکسار رہا
نہ لالہ زار رہا اور نہ سبزہ زار رہا — کہ سیل اشک سدا صرف جوئے بار رہا
پلائی اتنی سبھوں کو چھکا دیا ساقی — رہا تو تشنہ مے مجھسا بادہ خوار رہا
وفا شعار فروتن جہاں سے مستغنی — مدام شیوۂ مردان روزگار رہا
شکارگاہ میں آیا ہے گلچھلا یہ کون — کہ زخم سے نہیں خالی کوئی شکار رہا
تمام عمر کا ہے درد سر مئے الفت — یہ وہ نہیں کہ گھڑی دو گھڑی خمار رہا
جفائیں آپ کی مانا کہ بیحساب رہیں — مگر ہماری وفاؤں کا کیا شمار رہا
خودی میں خود نہ رہے جب ہم خدا شناس — نہ کوئی غیر رہا پھر نہ کوئی یار رہا
ہمارے گریہ نے ٹھنڈا کیا کسی کا دل — ذرا نہ سنگ میں باقی کوئی شرار رہا

نگاہ بھر کے جو تم دیکھتے رہے دل کو — وہ میفروش رہے اور یہ میگسار رہا
درود لاکھوں کروروں سلام ہوں اُسپر — جو عفو امت عاصی کا خواستگار رہا
چلا ہے راستہ کترا کے دیکھ تو زاہد — وہ میکدے سے کوئی تجھکو ہے پکار رہا

نہ پھنسا دام محبت میں کب تلک طالب
وہ سادہ لوح بہت دن تو ہوشیار رہا

حضرت محشر لکھنوی

دوست پہ حال اپنا عیاں کردیا — دل میں جو تھا صاف بیان کردیا
مرگیا دل دفن میں کیا اہتمام — تھوڑی سی مٹی میں نہاں کردیا
دیکھ سکے کون جمال حبیب — جس نے کہ روشن یہ جہاں کردیا
رہ چکے خاموش بس اے دردِ ہجر — کردیا اب قصدِ فغاں کردیا
مرکے بھی اس درد کی پائی نہ حد — جسنے مجھے محو فغاں کردیا
اپنے اس ارمان پہ میں خود نثار — جس نے تمھیں محو فغاں کردیا
جستجوئے دوست میں ہم مرگئے — شوق نے بے نام و نشاں کردیا
اسکو خفا مجھ سے خدائی ہوئی — رازِ محبت کو عیاں کردیا

دلیہ ہے محشر یہ کرم عشق کا
واقفِ اسرار نہاں کردیا

حضرت ثاقب قزلباش لکھنوی

تمام عمر کی غفلت کے بعد خواب آیا — اُٹھا جو پردۂ ہستی سمجھے حجاب آیا
اجل نصیب تھا شام وصال خواب آیا — وہ بے حجاب ہوے تو مجھے حجاب آیا
چلا ہے شام جوانی سے خوش نوا ایدل — سنبھل کہ عمر کی دنیا میں انقلاب آیا
بڑھا ہے حوصلے وہ یاد ہی نے ساقی کے — فدا سے جام میں سو بار آفتاب آیا

زمانے والوں کو پہچاننے دیا نہ کبھی / بدل بدل کے لباس اپنے انقلاب آیا
کوئی صدا نہیں آتی کہ کون ہے کیا ہے / کہاں بھٹک کے دل خانماں خراب آیا
سوائے یاس نہ کچھ گنبد فلک سے ملا / صدا بھی دی تو پلٹ کر وہی جواب آیا
حریف مے نہیں سمجھا تو کیوں مری جانب / لہو کے گھونٹ پیے ساغر شراب آیا
سنائیں کیا تمہیں نیرنگِ عشق کا قصہ / تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خواب آیا
ہٹے نہ اپنی طبیعت سے حسن و عشق کبھی / ہزار بار زمانے میں انقلاب آیا
کھٹک وہ دل میں ہے پیدا جو آج تک نہ ہوئی / سمجھ رہا ہوں کہ طفلی گئی شباب آیا
اگر وہ آئیں مری قبر پر تو میں پوچھوں / مجھے مٹا کے کبھی پھر بھی انقلاب آیا

کفن پنہا دیا ثاقب صنم پرستی نے
خدا کے سامنے جاتے ہوئے حجاب آیا

حضرت آشفتہ لکھنوی

مری عمر رواں منجدھار تک پہنچے گی مشکل سے / یہ کشتی ہو کے طوفانی چلی ہے اپنے ساحل سے
بھرے آتے ہیں آنسو کیا کروں مجبور ہوں دل سے / شریک بزم ہوں لیکن الگ بیٹھا ہوں محفل سے
زمیں مشکل سے سنبھلی آسماں سنبھلا ہے مشکل سے / خداوندا یہ کس نے آہ کھینچی دکھ بھرے دل سے
مرتب ہو رہی ہے اک نئی تاریخ دنیا کی / مرے اجڑے ہوئے گھر سے مری ویران منزل سے
ذرا سی ٹھیس اس پھوڑے میں لگنا قافیا ہے / ہزاروں زخم اور ناسور بہ نکلے مرے دل سے
رگ جاں اب جہاں تک ہو سکے نرمی مناسب ہے / ندامت سخت جانی کی رہی جاتی ہے قاتل سے
بجھا دو شمع تربت کھول دو یا اپنے بالوں کو / کسی کی منتظر آنکھوں میں نیند آئیگی مشکل سے
لیے جاتی ہے آہستہ مجھے رحمت طلب ہستی / خدا معلوم کتنا فاصلہ باقی ہے منزل سے
ذرا تم بھی تو دیکھو شان آزادی اسیروں کی / نکالی جا رہی ہیں ہڈیاں طوق و سلاسل سے
دل بیمار کی حالت پہ آتا ہے مجھے رونا / سمجھتا ہوں کہ یہ بیمار اب سنبھلے گا مشکل سے

نہ پوچھو تم نہ پوچھو اُف میں دیوانہ نہ ہو جاؤں　　ہوا کرتی ہیں تنہائی میں کیا باتیں مرے دل سے
اسے مرنا تو تھا مرتا مگر یہ کرب مٹ جاتا　　تمہیں ہو وقت میں اُٹھنا نہ تھا بالیں بسمل سے
انھیں ہاتھوں سے خنجر جنہیں تھا اب دل سنبھالے　　نگاہ یاس میری کہہ دیا کیا تو نے قاتل سے
انھیں ٹوٹی ہوئی قبروں میں ساماں قیامت ہے　　کبھی محشر بپا ہوگا اسی خاموش محفل سے
خداوندا زمانے بھر کا جس میں ساز و ساماں تھا　　دھواں تھوڑا سا وقت واپسیں نکلا ہے اُس دل سے

یہ کیسی رہگذر تھی عالم ہستی کی آشفتہ
مجھے ہاتھوں ہی ہاتھوں لے لیا منزل نے منزل سے

حضرت خلیق دہلوی

ساقی بھر جام لال شربت کے　　دیکھ بادل اُٹھے وہ رحمت کے
کچھ پری کے نہ حور جنت کے　　ہم تو عاشق ہیں آدمیت کے
زر کے طالب ہیں اور نہ صورت کے　　ہم ہیں بھوکے فقط محبت کے
حشر کا وعدہ کر گئے وہ تو　　دن گنا کیجیے قیامت کے
ایک دو تو ہمیں دکھا دیجیے　　چشم بد دور اپنی صورت کے
جنکو بھولا سمجھتے تھے پہلے　　اتنے پرکالے ہیں وہ آفت کے
دل ناداں کے واسطے یہ بت　　کیا کھلونے ہیں دست قدرت کے
دو قدم چل کے دیکھ لیجیے گا　　ہوش اُڑ جائینگے قیامت کے
اپنی صورت پہ وہ بھی عاشق ہیں　　صدقے اللہ تیری قدرت کے
حضرت دل کا دم غنیمت ہے　　یہ بھی اچھے ہیں اپنی عادت کے
آب خنجر میں یہ مزا پایا　　پی لیے گھونٹ جیسے شربت کے
میر تنہائی میں رفیق رہا　　ہم ہیں ممنون درد فرقت کے
بیکسی ہے مزار عاشق کی　　آنسو پونچھے گی شمع تربت کے
خانۂ دل میں آج کل اپنے　　مہد ودرے ہیں درد فرقت کے

سب ہیں خُلق خلیق سے واقف
یاد ہیں ڈھنگ اسکو ملت کے

[illegible]

[illegible]

پچپال صابون

ایک ملتانی طبیب کی ایجاد ہے!

[illegible] خوبصورت [illegible]

[illegible] کی [illegible] خوبصورت [illegible]

[illegible] شہرت کی [illegible]

[illegible]

روغن پری بہار گیسو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جس کی غذا بوقت دست لگائی جاتی ہے

دمہ کی دوا

[illegible]

پیچک کی دوا

[illegible]

رنگ گورا کرنے کی

[illegible]

رجسٹرڈ نمبر اے ۵۱۷

جلد ۲ نمبر ۶ مارچ سنہ ۱۹۱۶ء

تمدّن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹر ایم۔ اے قاری (علیگ) دہلوی خلف اکبر جناب قاری محمد سرفراز حسین صاحب (علیگ) عزمی دہلوی سیاح جاپان و انگلستان

فہرست مضامین

پبلشر محمد عباس حسین قاری — ناردرن انڈیا پرنٹنگ پریس لکھنؤ میں چھپا — پرنٹر نواب علی

قیمت سالانہ ۳ ر — مقام اشاعت پل چھاؤ لال لکھنؤ — نمونے کے پرچہ کی قیمت ۳ر

قواعد

(۱) "تمدن" ہرماہ کی پہلی تاریخ کو لکھنؤ سے شایع ہوتا ہے

(۲) ایسے مضامین جن سے اخلاق پر بُرا اثر پڑے یا ذاتیات سے بحث ہو یا سیاسی پہلو لیے ہوے ہوں درج "تمدن" نہیں ہوتے۔

(۳) مضامین نظم و نثر ہرماہ کی ۱۵ تاریخ تک آجانے چاہئیں۔

(۴) جو مضمون کسی دوسرے رسالے میں درج ہو چکا ہو اُسکو "تمدن" کے لیے ارسال نہ کرنا چاہیے۔

(۵) اگر کسی صاحب کے پاس ڈاکخانہ کی غفلت سے اتفاقاً کوئی نمبر نہ پہنچے تو اُسی ماہ کی ۲۰ تاریخ تک طلب کریں ورنہ پھر چار آنے کے ٹکٹ آنے پر روانہ ہوگا۔

(۶) نا تمام مضامین درج "تمدن" نہیں ہو سکتے۔

تمدّن

فن تاریخ

(۱)

تاریخ کی حقیقت

موجودہ زمانے میں فن تاریخ نے باعتبار اپنے اعلیٰ مقصد اور شاندار نتائج کے جو غیر معمولی منزلت مہذب و متمدّن قوموں میں پیدا کرلی ہے اس بنا پر یہ موضوع نہایت طویل بحث کا محتاج ہے لیکن قلت وقت، کثرت مشاغل اور ہجوم افکار مجھے زیادہ شرح و بسط کا موقع نہیں دیتے اسلیے یہ مختصر مضمون اگرچہ تاریخ کی بیشمار خوبیوں اور نہایت دلچسپ مسائل کے ذکر کے لیے ناکافی ہوگا تاہم اسکی اہمیت و عظمت ایک حد تک معلوم ہوسکتی ہے؛

تاریخ کی حقیقت سمجھنے کے لیے پہلے ہم کو یہ معلوم کرلینا چاہیے کہ عالم میں جسقدر واقعات روزانہ پیش آتے ہیں انکی نوعیت مختلف ہوتی ہے اور زمانے کے تغیر کے ساتھ ساتھ انمیں

ہزاروں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں، آج جو واقعہ ظاہر ہوتا ہے پانچ ہزار برس پیشتر دوسرے رنگ میں اسکا ظہور ہوا تھا، اس لحاظ سے انسان کے تمدن، معاشرت، عادات اور مذہب کی مختلف قیدوں کے ساتھ اسکے گذشتہ حالات کی تحقیق کیجائے تو چند دور نکلینگے اور ہر دور کی خصوصیت دوسرے سے ممتاز حیثیت میں نظر آئیگی، مثلاً

انسان کا پہلا دور وہ تھا جب وہ جنگلی پھل قدرتی میوے، دریاؤں کی مچھلیاں، آبشار اور چشموں کے پانی پر گذارا کرتا وحشی جانوروں کی طرح پہاڑ کی کھوہوں زمین کے غاروں میں دھوپ کی شدت، جاڑوں کی سردی، برسات کے موسلادھار پانی سے اپنے آپ کو بچایا کرتا، دوسرا دور وہ آیا جسمیں اُس نے جانوروں کو سدھانا اور اُن سے اپنی ضرورتوں میں کام لینا سیکھا اُنکے گوشت کو اپنی غذا اور کھالوں کو اپنا لباس بنایا اور غوں غاں کے بجائے ٹوٹے پھوٹے چند الفاظ اپنے اظہار مطلب کے لیے سیکھے تیسرا دور وہ تھا جب اُس نے گلہ بانی شروع کی، رہنے کے لیے جھونپڑے بنائے، کھانا پکانے کے لیے آگ اور نمک کو تلاش کیا۔ اناج اُگانے کے لیے زراعت شروع کی، اسکے بعد جوں جوں نسل انسانی روے زمین میں پھیلتی گئی توں توں انسانی تمدن میں نئے باب کا اضافہ ہوتا گیا، غرض یہ تمام واقعات اور حالات تاریخ کا سرمایہ ہیں اور ان ہی مختلف رنگوں سے تاریخ کی عمارت میں گلکاریاں کی جاتی ہیں اسلیے اسکی تعریف مختصر لفظوں میں اس طرح کی جاسکتی ہے کہ "تاریخ وہ علم ہے جس سے گذشتہ لوگوں کے مختلف حالات کا پتہ لگایا جاسکے"

تاریخ کی ابتدا

(۲)

اسمیں شک نہیں دنیا میں نسل انسانی کا وجود ہزاروں برس سے ہے مگر ابتدائی زمانہ نہایت تاریک اور دشواریوں سے مملو ہے اور اسپر تاریخی حیثیت سے کچھ بھی

روشنی نہیں ڈالی جاسکتی، اُس زمانے کے جو حالات بیان کیے جاتے ہیں اُنکی بنیاد محض ظن اور تخمین پر ہے، البتہ چند ہزار برس پیشتر کے حالات تاریخ کی روشنی میں لائے گئے ہیں انکا ماخذ زیادہ تر توریت ہے۔ بہرحال اس فن کے ماہرین نے تاریخ کو تین دور میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) قرون اولیٰ یعنی ابتدائی چند صدیاں یہ دور سنہ ۳۰۰۰ قبل مسیح سے شروع ہوکر سنہ ۵۰۰ء میں ختم ہو جاتا ہے۔

(۲) قرون وسطیٰ، درمیانی چند صدیاں یہ دور سنہ ۵۰۰ء سے سنہ ۱۵۰۰ء کے قریب قریب آخر تک شمار کیا جاتا ہے۔

(۳) قرون اخریٰ، اس دور کی ابتدا سنہ ۱۵۰۰ء کے اختتام سے کچھ ہی پیشتر ہو جاتی ہے

اب ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ تاریخ کی ابتدا کب اور کیونکر ہوی اور کس قوم نے تاریخ کو مدون کیا لیکن ناظرین کو یہ سُنکر نہایت تعجب ہوگا کہ مصری، یونانی، کلدانی رومانی وغیرہ باوجودیکہ نہایت پُرعظمت وجبروت قومیں گذری ہیں اور انھوں نے عقلی علوم وفنون میں ایک حد تک خاصی ترقی حاصل کی تھی اس بنا پر قدرتاً یہ خیال دل میں پیدا ہوتا ہے کہ انکی کوشش اور علمی شغف کے سبب فن تاریخ بھی محروم نہوگا لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نایاب گوہر سے بالکل تہیدست تھیں صرف یونانیوں کی بابت اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اس قوم میں کچھ کچھ تاریخ کا رواج تھا، ہومر یونان کا نہایت فصیح اور مشہور شاعر گذرا ہے اسنے چند واقعات اپنے اشعار میں قلمبند کیے ہیں اسلیے بعضوں کی رائے ہے کہ تاریخ کی بنیاد اسی کے ہاتھ سے پڑی ہے اسکے بعد سنہ ۵۰۰ قبل مسیح میں ہیرودوٹس ایک نامی شخص گذرا اس نے بہت سے تاریخی واقعات جمع کیے اور تاریخ کی ایک کتاب لکھی جسکا ترجمہ مختلف زبانوں میں اب ہوگیا ہے، اس بیان سے معلوم ہوسکتا ہے کہ تاریخ کی ابتدا

یونانیوں کے زمانے میں ہوئی، مگر کوئی مستقل حیثیت اسکی قائم نہیں ہوئی تھی جب اسلام کا قدم دنیا میں آیا اس نے جس طرح اور دیگر علوم و فنون کا نہایت گرمجوشی سے خیر مقدم ادا کیا تاریخ بھی اس عزت سے محروم نہیں رہی اور اسی زمانے میں اسکی تدوین مکمل ہوئی اور اس نے مستقل حیثیت قائم کرلی۔

(۳)

تاریخی واقعات کے ذرائع

تاریخی واقعات جن جن چیزوں سے معلوم کیے جاسکتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں!

(۱) عینی مشاہدہ اسکا یہ مطلب ہے کہ مورخ انھیں باتوں کو قلمبند کرے جنکو اسنے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اگرچہ یہ قسم بہ نسبت تمام دوسری قسموں کے زیادہ موجب یقین ہے مگر اسمیں بھی یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ مورخ نے نتائج کے استنباط کرنے میں غلطیاں کی ہیں اور اصل واقع کی تہ تک نہیں پہنچ سکا ہے۔

(۲) سماعی روایات، اس سے یہ غرض ہے کہ مورخ خود واقع میں موجود نہ تھا بلکہ دوسروں سے زبانی روایتیں سنکر واقعات جمع کردیے ہیں۔

(۳) قصائد اور عام اشعار، تاریخی سرمایہ بہم پہنچانے میں اشعار بہت بڑا ذریعہ بنے ہیں جس زمانے کے اشعار ہوں اس زمانے کے لوگوں کا عام مذاق، طبیعت کا رجحان، خیالات اور جذبات کا پورا پورا پتہ ان سے لگایا جاسکتا ہے۔

(۴) دفاتر سلطانی، یعنی ملکی کاغذات جن سے یہ تحقیق ہوسکتی ہے کہ اس زمانے میں سلطنت کے احکام کس قسم کے تھے رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کیا وسائل عمل میں لائے گئے بادشاہ اور حکام وقت کے استبداد اور عدل گستری کا حصہ اسمیں کسقدر شامل تھا۔

(۵) سکے، منار، عمارتیں اور دیگر آثار قدیمہ، ان چیزوں سے تاریخی پر از اسرار معلومات

حاصل کرنے میں بہت زیادہ مدد ملی ہے قدیم منارے اور عمارتوں نے گذشتہ قوموں کی معاشرت، ذہنی قوت اور کارناموں کے معلوم کرنے کے لیے رہبر طریق کا کام دیا ہے، کیونکہ ایک مکان جو انجینیری کے اصول کے مطابق تعمیر کیا گیا ہو اور ایک وہ جو بالکل سادہ اور بغیر انجینیری کے اصول کے بنایا گیا ہو ان دونوں مکانوں میں علمی حیثیت سے جو فرق ہوگا وہی فرق انکے تعمیر کرنے والوں میں صاف نظر آئے گا۔" (باقی آیندہ)

احمد اللہ

اک اور کرم بانیٔ بیداد کیے جا — ٹھوکر سے مری قبر کو برباد کیے جا
سنتا ہوں کہ امید یہ قائم ہے زمانہ — صیاد معین مری میعاد کیے جا
رکنے کے نہیں فصل بہاری میں وحشی — تدبیر جو ہو تجھ سے وہ حداد کیے جا
ہمت کا تقاضا ہے کہ اُف منہ سے نہ نکلے — اور درد یہ کہتا ہے کہ فریاد کیے جا
وہ نقش نہیں مٹ کے جو اُبھروں میں کبھی پھر — تو کوشش ناحق کی یہ بہزاد کیے جا
پہچان نے پابند قفس ذوق طبیعت — صیاد کا دل بہلے گا فریاد کیے جا
الفت کی یہ ہے شان کہ دل اور جگر کو — قربانِ نگاہِ ستم ایجاد کیے جا
دم گھٹ گیا اللہ قفس رکھدے چمن میں — اتنی سی تو خاطر مری صیاد کیے جا
ہر روز نیا رنگ وفا دیکھنا میرا — ہر روز نئے تو ستم ایجاد کیے جا
مانا کہ اثر دل پہ کسی کے نہیں ہوتا — فریاد مگر اے دل ناشاد کیے جا
معلوم ہے جو کچھ مری قسمت میں لکھا ہے — صیاد مگر تو مجھے آزاد کیے جا
دکھلا دے نیا رنگ وفائے دل غمگیں — وہ بھولتے جائیں تجھے تو یاد کیے جا
اللہ الناک ہے کس درجہ یہ منظر — میں چپ رہوں اے چرخ تو بیداد کیے جا

مل جائیں گے یہ سب بھی تصدق میں اُسی کے
اے صدر خدا ہی کو تو بس یاد کیے جا

صدر الاسلام صدر

شخصی اور قومی حسیات

جس حالت اور جس کیفیت کا نام ہم زندگی رکھتے ہیں وہ سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ چند حسیات کا ایک محسوسہ اور معمولہ مجموعہ ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص زندہ ہے یا اسکی بھی کوئی ہستی ہے تو اس کی دلیل یہی ہوتی ہے کہ وہ حسیات رکھتا اور اُن سے اپنے رنگ میں کام لیتا ہے جب انسان مرجاتا ہے تو اُسکی تمام حسیات جو اس جسم یا اس حالت کے تابع یا متعلق ہیں مرجاتی ہیں نہ ناطقہ رہتا ہے نہ لمس اور نہ بصارت اور نہ سماعت وہی انسان جو ابھی ابھی بولتا چالتا اور تمام حسیات کا مالک تھا ایک دم کے نکلنے سے بالکل ایک تختہ یا مٹی بن جاتا ہے اگرچہ یہ سلسلہ حسیات برسوں تک محسوس اور معمول رہتا ہے لیکن ایک دم کے نہ آنے سے اُسکا نشان بھی نہیں ملتا۔

حسیات اور کیفیات حسیات شروع ہی سے انسان کے حصہ میں آجاتی ہیں اگرچہ علے قدر مراتب اُنکی حالت اور کیفیت ہمیشہ جداگانہ ہوتی ہے لیکن یہ مواد ہر ایک انسانی ہستی کو حاصل ہوتا ہے کوئی جزو یا کوئی ذات اس سے خالی نہیں ہوتی ایک بچے سے لے کر ایک بوڑھے تک میں یہ کیفیت پائی جاتی ہے جس طرح ایک بچہ رفتہ رفتہ ترقی پذیر ہو کر نشو و نما پاتا ہے اسی طرح یہ حسیات اور کیفیات حسیات بھی نشو و نما پاتی رہتی ہیں جسم کی بالیدگی موجب ہوتی ہے۔ بالیدگی قوتوں اور حسیات کی عقل و فراست بھی ایک وجدانی اور ذہنی حس ہی ہے اسکی بالیدگی بھی رفتہ رفتہ ہی ہوتی ہے دیکھو ایک بچہ کی عقل و فراست وہ کیفیت نہیں رکھتی جو بعد میں نصیب ہوتی ہے۔

اگرچہ تجربہ۔ مشق۔ مشاہدات اور اجتہادات بعد میں عقل وفراست کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں لیکن عقل وفراست بھی رفتہ رفتہ ہی سترقی ہوتی ہے ایک تجربہ کار جس خوبی سے رائے لگاتا اور اجتہاد کرسکتا ہے ایک بچہ ویسا نہیں کرسکتا اسکی نسبت ہر پھیر کر یہی کہا جاتا ہے۔

گاہ باشد کہ کودک نادان

باوجود حسیات کی موجودگی کے بھی اُسے پوری عقل وفراست رکھنے والا نہیں کہا جائے گا اگرچہ ہر فرد شخصیت کی حسیات جداگانہ اور منفرد ہوتی ہیں لیکن اُن سب افرادی حسیات میں ایک نسبت مشترکہ بھی ہوتی ہے خواہ نوعیت کے اعتبار سے اور خواہ فعلی اور انفعالی اعتبار سے بصارت اور سماعت کا گو مختلف افراد میں وزن اور رنگ جداگانہ ہوگا لیکن من جہت بصارت اور سماعت اُن میں ایک نسبت بھی ہوگی اور وہی غرض مشترکہ سے تعبیر پاتی ہے جبکہ ان حسیات کا نام ہی زندگی یا زندگانی ہے تو دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے گا کہ ان حسیات اور کیفیات حسیات کی بدولت ہی ہمیں دولت حیات حاصل ہوتی ہے۔ ایک فردی یا ایک شخصی زندگی جو کچھ اپنے اندر حسیات رکھتی ہے وہی اُسکی زندگانی کا سرمایہ ہے حسیات کی تعبیر دو طور پر کیجا سکتی ہے

(الف) منفردانہ رنگ میں۔

(ب) اجتماعی رنگ میں۔

ایک فرد یا ایک شخصیت میں جسقدر حسیات پائی جاتی ہیں اُن کے تصرفات اور عملیات کا علم اور ادراک کبھی منفردانہ محسوس ہوتا ہے اور کبھی مجموعی صورت میں یہ حسیات گویا بجائے خود ایک ایک ہستی اور ایک ایک قوت ہیں جب کبھی اُنکا ادراک اجتماعی رنگ میں ہوتا ہے تو اُس وقت یہ سمجھا جاتا ہے کہ۔

در اصل ایک ہی قوت اور ایک ہی جذبہ کام کر رہا ہے کام کرتے کرتے یا کام لیتے لیتے انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ اُسمیں در اصل ایک ہی طاقت کام کر رہی ہے جب کبھی کسی شخص یا کسی فرد کی حس زائل ہو جاتی ہے تو اُس حالت میں یہ کہا جاتا ہے کہ

(اُس کی یا میری حس زائل ہوگئی ہے)

احساسی قوتوں کے کم زور پڑ جانے سے انسان کی زندگی ایک دُھندے یا ایک وبال میں پڑ جاتی ہے گو ایسا انسان بظاہر چلتا پھرتا ہے لیکن در اصل عملی رنگ میں اُسکی زندگی ہو چکی ہوتی ہے بعض لوگوں کے خیال میں زندگی صرف خورد و نوش چلنے پھرنے اور بات چیت کرنے ہی کا کام ہے یہ ایک غلطی ہے یہ تو زندگی کے عوارض ہیں۔ زندگی سے مراد در اصل ایک عملی حالت یا عملی کیفیت ہے جو اُسکے کاموں اور حسیات سے ظاہر اور منکشف ہوتی ہے۔ ایک پرانا شعر کسی کا ہے۔

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

زندہ دلی سے مراد ہنسی ٹھٹول مذاق اور مسخراپن ہی نہیں بلکہ مراد عملیات کی کیفیات بھی ہیں زندہ دل بھی وہی رہ سکتا ہے جو عملی رنگ میں زندگی رکھتا ہے جو شخص کوئی زندگی ہی نہیں رکھتا وہ زندہ دل کس طرح ہو سکتا ہے افرادی یا شخصی حسیات سے قومی حسیات کی داغ بیل پڑتی ہے۔ قوم کیا ہے وہ مجموعہ کثیر افراد یا کثیر شخصی زندگیوں کا جو منفردانہ رنگ میں پایا جاتا ہے اور جو خود کو ایک ہی سلسلہ یا ایک ہی مرکز سے منسوب کرتا ہے یہ سلسلہ یا یہ مرکز بھی افراد منتشرہ ہی کی جدوجہد کا حصہ ہوتا ہے جب رفتہ رفتہ چند افراد ایک مرکز مجوزہ پہ ثابت قدم ہو جاتے ہیں تو اُسکا نام کبھی ایک فرقہ اور کبھی ایک قوم

پڑ جاتا ہے باوجودیکہ دوسری اقوام کے افراد منتشرہ کی اغراض اور حسیات بھی اُن افراد سے کچھ نہ کچھ نسبت رکھتی ہیں اور اُن میں بھی اُنکا عکس ایک حد تک پایا جاتا ہے

قوموں کی حدبندی کس طرح ہوتی ہے اسکی مختلف صورتیں ہیں۔

(الف) نسلی حدبندی۔

(ب) ملکی حدبندی۔

(ج) مذہبی حدبندی۔

تین صورتیں ہیں جن پر عموماً قوموں کی حدبندی کا بہت کچھ مدار ہے بعض قومیں صرف امتیاز نسلی کی وجہ سے ایک قوم کہلاتی ہیں۔ بعض قوموں کی حدبندی ملکی اغراض اور ملکی رشتوں کے تابع ہوتی ہے بعض کی حدبندی مذاہب کی بدولت ہے میرا اس حدبندی سے منشا مذہبی شاخوں کا نہیں ہے بلکہ ایک مجموعی حصہ قوم کا۔ مذہبی حدبندی کا اثر عموماً دوسری دو صورتوں پر بھی حاوی ہوتا ہے لیکن بعض اقوام میں اسکا اثر صرف نہیں ہوتا ہے۔

ہندو قوم کی حدبندی اندرونی امتیازات کی وجہ سے بہت ہی پریشان کہی جاسکتی ہے چار برن کی تقسیم نے اس اندرونی تفریق کو ایک بڑے اسکیل پر قائم کر رکھا ہے اور اُسمیں ابتک کسی فرق آنے کی امید نہیں ہے گو کہ شروع شروع میں اسکی بنیاد ایک تمدنی فلسفہ پر بہت ہی ضروریات کے ماتحت رکھی گئی تھی۔

ان چار برنوں کے چلانے کا ذریعہ اسوقت صرف ایک ہندو دھرم اور ملک ہندوستان ہی ہے ان مرکزوں یا ان نقاط پر آکر ہندو قوم کو ایک قوم کہا جا سکتا گویا ہندو قوم اندرونی تفرقات کو قائم رکھکر مذہب اور ملک کی اغراض سے

تابع ہو کر ایک قوم بنتی ہے۔

چینی اور جاپانی قومیں ملکی اور مذہبی نقطۂ خیال سے ایک قوم کہلاتی ہیں چینی ہمیشہ چینی کہلانے کو ترجیح دیتا ہے اور جاپانی جاپانی کہلانے کو لیکن ان ملکوں کے اندر جو افراد دوسرے مذاہب کے مثلاً مسلمان اور عیسائی رہتے ہیں وہ اگر ایک طرف خود کو چینی اور جاپانی کہتے ہیں تو دوسری مذہبی تفریق کی وجہ سے خود کو مسلمان اور عیسائی کہیں گے۔ زردشتی افراد قوم بھی مذہبی اور ملکی نقطۂ خیال سے ایک قوم ہیں۔ عیسائی اقوام کی بڑی بھاری تفریق نسلی اور ملکی اغراض اور شرائط کے تابع ہے اگرچہ اُنکا مذہب عموماً ایک ہے لیکن ایک انگلستانی کبھی فرانسیسی اور ایک فرانسیسی انگلستانی اور ایک جرمن انگلستانی اور انگلستانی جرمن کہلانا پسند نہیں کرے گا یہ تفریق اور یہ امتیاز یہانتک وسعت پذیر ہے کہ ان مختلف ممالک اور نسلوں کی رسوم میں بھی ایک بڑی حد تک فرق پایا جاتا ہے گو ان میں کرسچین مذہب ہی ایک حد مشترک ہے لیکن جب نسلی اور ملکی بحث بیچ میں آپڑتی ہے تو پھر رشتۂ مذہب کی طاقت ایک بڑی حد تک گھٹ جاتی ہے ایک یونانی ایک سروین کے ساتھ گو اپنا مذہبی رشتہ رکھتا ہے لیکن جب یونانی اور سروین نسلوں کی بحث چھڑ جاتی ہے تو مذہبی اثر بہت کمزور پڑ جاتا ہے یورپ میں مختلف گروہوں اور مختلف اقوام پر مذہب نے ایسا اثر نہیں کیا جو دیگر سب رشتوں سے مضبوط خیال کیا جائے۔

یونانی ایک یونانی ہے اور سروین ایک سروین ہے تا وقتیکہ مسیح علیہ السلام کے نام کی تقدیس نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ یہ مذہبی رشتہ بھی بہت کچھ ڈھیلا پڑ جاتا ہے کیونکہ مذہب کی اندرونی تفریقات کی وجہ سے بعض واقعات پیدا ہو کر گڑبڑ ڈالدیتے ہیں مسلمانوں کی بابت یہ بحث اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے لیکن نتیجہ خیز ضرور

رہے۔

میں بالفعل چند منٹوں کے واسطے مسلمانوں کو ایک قوم سے تعبیر کروں گا اس قوم کی حقیقت اور کیفیت یہ ہے کہ اس میں نہ مختلف اقوام ہی کے بلکہ مختلف ممالک اور مختلف نسلوں اور مختلف ذریات کے افراد بھی ایک کثیر تعداد میں شامل ہیں صرف مختلف ممالک اور مختلف قوموں اور مختلف نسلوں ہی کے بلکہ مختلف مذاہب کے افراد سے بھی یہ قوم ترکیب یافتہ ہے مسلمانوں میں بھی اندرونی قومی فرقہ بندیاں ہیں جنہیں دوسرے الفاظ میں مختلف گروہوں سے تعبیر کرنا زیادہ ترموزوں ہوگا لیکن باوجود اس پریشان رشتہ بندیوں کے بھی مذہب مسلمانوں پر زیادہ غالب ہے اسلام نے تمام قومی درجہ بندیاں توڑ دی ہیں گو اس وقت تک کچھ کچھ درجہ بندیاں پائی جاتی ہیں مگر دراصل انکا خاتمہ ہوچکا ہے۔ جب ایک انگریز اور ایک یونانی و فرنچ سے سوال کیا جائے کہ تم کون ہو تو اس کا پہلا جواب یہ ہوگا کہ

میں انگلش ہوں۔ فرنچ ہوں۔ یونانی ہوں۔

اگر کسی ہندو سے سوال کیا جائے کہ تم کون ہو تو گو وہ خود کو کھتری برہمن جتیا کر ہندو ہی کہے گا مگر حقیقت الامر سے اسکا جواب مبہم اور کسی قدر دور ہوگا کیونکہ در اصل ہندو کسی مذہب کا نام نہیں ہوسکتا بلکہ ہندو کا زیادہ تر قریبی اطلاق ملک ہند سے ہونا موزوں ہے۔ ایک دوسرا لفظ آریہ بھی ہے اسکا اطلاق بھی کچھ بہت صاف نہیں ہے میری رائے میں اس سے ثابت یا ظاہر ہے کہ اس پرانی اور نامور قوم میں ملکی خصوصیت مذہبی خصوصیت پر غالب ہے اور اس کے بعد نسلی خصوصیت کا زور ہے۔

ایک مسلمان سے جب پوچھا جاتا ہے کہ تم کون ہو تو سب سے اول اسکا یہ جواب ہوگا کہ میں مسلمان ہوں،

اس جواب سے ثابت ہے کہ مذہب اسلام رفتہ رفتہ قوم یا قومیت کے رنگ میں بھی رنگا گیا ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ دائرۂ اسلام میں آکر کوئی قوم یا قومیت گزشتہ باقی نہیں رہتی ایک نئی قوم مسلمان کے نام سے مل جاتی ہے اب دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ۔

مسلمان ایک مذہب بھی ہے اور ایک قوم بھی۔ مذہبیت اس قومیت سے وہی نسبت رکھتی ہے جو خود اسلام کو اپنے آپ سے ہے ہمیشہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں تو اسکا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ تمام نسلیں اور قومیں اختیار اسلام سے اپنی قومیت چھوڑ کر ایک ہی مرکز اسلام پر آچکی ہیں اس شان اور اس رنگ میں کوئی دوسرا مذہب قومیت اور اقوام نسلوں اور ذریات نسلوں پر غالب نہیں ہوا اس رشتہ کو مد نظر رکھ کر یہ کہا گیا ہے

کل مؤمن اخوۃ

اخوت کا درجہ قوم اور قومیت سے بھی بڑھکر ہے گویا مسلمان باوجود مختلف ذریتوں اور نسل ہونے کے ایک اس قوم میں جو آپس میں بھائی بھائی ہیں شامل ہو جاتا ہے اس سلسلے سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ ہر ایک قوم کی اجتماعی حسیات کا رجحان زیادہ تر کس طرف ہو سکتا ہے مختصراً یہ کہ جو قومیں زیادہ تر نسلوں ذریات اور اقوام اور ممالک سے وابستگی رکھتی ہیں انکا رجحان اور جذب حسیات کچھ اور رنگ رکھے گا اور جس گروہ کی قوتیں زیادہ تر مذہب سے مربوط ہیں انکی حسیات کا جذبہ مذہبی رنگ میں ہونا چاہیے خواہ کوئی سا رنگ ہو ان حسیات کو قومی حسیات کے نام سے تعبیر کرنا زیادہ تر مناسب ہوگا۔ اگر ایک شخصیت کی حسیات شخصی رنگ میں ایک ہی فرد کہی جا سکتی ہیں تو مذہبی حسیات بھی باعتبار ایک قوم ہونے کے ایک ہی اجتماعی قوت ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ حسیات شخصی ہوں یا قومی مر بھی جاتی ہیں جس طرح ایک شخصیت حیات کے مرنے کی صورت میں ایک بوسیدہ ہستی ہے اسی طرح ایک قوم بھی اس حالت میں ایک مردہ قوم ہے۔

اغراض مشترکہ کی بابت ایک ہی دفعہ ساری قوم یا سارے افراد قوم کے دل ودماغ میں خیالات کا تموج ہونا اور ان پر ثابت قدم رہنا افراد اور شخصیتوں کا یہ فرض ہے کہ وہ افرادی اور شخصی حسیات کا رشتۂ قوم سے منسلک اور منضبط کریں اور قوم کا یہ فرض ہے کہ وہ افراد اور شخصیات کے حسیات کو اجتماعی رنگ میں قبول کرے اور اُسے عملی پہلو سے قائم بھی رکھے یہی دو طریقے ہیں جن سے دونوں قسم کی حسیات کا قائم رہنا مقصود ہے جن اقوام کی حسیات کمزور پڑ جاتی ہیں وہ سب سے پہلے اس کوچہ سے ناواقف ہوتی ہیں کہ۔

اُن کی اغراض مشترکہ کیا ہیں۔

اور اُن کا تحفظ کن وسائل کے تابع ہے۔

جب تک یہ ادراک نہ ہو تب تک کوئی قوم اپنے حسیات سے مستفیض نہیں ہو سکتی۔ شخصی اغراض مجتمع ہو کر یا سمٹ سمٹ کر قومی اغراض اختیار کرتی ہیں یا قومی اغراض کے قالب میں آتی ہیں اگر کسی قوم کی اقتصادی حالت کمزور ہو چکی ہے تو صرف افراد کا ہی یہ فرض نہیں کہ اُس گئی گذری شان کے واپس لانے میں ہمت دکھلائے بلکہ خود قوم کا بھی یہ فرض اولیں ہے کہ قومی رنگ میں اُس کمی کے پورا کرنے میں زور لگائے جبتک قوم کا قومی رنگ میں یہ نصب العین نہ ہو تب تک کامیابی مشکل ہے۔

ہمارا فرض اولیں ہے کہ ہماری شخصیتیں بھی اُس بڑی شان سے ثابت اور قائم رہیں جو شان اُنکے لیے موزوں ہے کیونکہ افراد کی مساعی ہی قومی مساعی کی

جزو اعظم ہیں جب شخصیتوں کی تحقیر کی جاتی ہے اور اُن کا کوئی احترام باقی نہیں رہتا تو قومی حسیات بھی قائم نہیں رہ سکتیں۔

ہمیشہ جزو سے کُل کی بنیاد پڑتی ہے ایک جسم ذرات کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن ذرہ جسم کا مجموعہ نہیں کہا جا سکتا ذرات سے اجسام مرکب ہیں نہ کہ اجسام سے ذرات شروع ہمیشہ معمولی حالات سے ہوتا ہے اور خاتمہ ابتدائی وسطی اور انجامی ارکان رکھتا ہے ایک مدرسہ میں جزیات کی تعلیم دیجاتی ہے لیکن کسی وقت اُن سب جزیات کی تعلیم وار ایک قومی یا اجتماعی رنگ میں ایک خاص شکل اور اثر اختیار کرتا ہے شخصی اور قومی عملیات میں ہمیشہ فرق ہوتا ہے گو کہ قومی عمل میں بھی افرادی عناصر ہی غالب ہوتے ہیں لیکن اسکا نام ہمیشہ قومی عمل کے نام ہی سے تعبیر پاتا ہے۔

ہماری شخصی اور قومی حسیات کی ایک منڈی ہے اور ہمارے دوگونہ عملیات اور اجتہادات ایک اشیاء بیع۔ اور کوئی عمل جو شخصیتوں کی بنیاد اور اقوام کی رشتہ بندیوں کے نام سے موسوم ہو سکتا ہے جو قومیں اور جو افراد قوم ان دونوں قسم کی حسیات سے عملی رنگ میں واقف ہیں اور اُنکی قدر و قیمت کا اُنھیں علم ہے وہ اسپر بہت کچھ کہہ سکتے ہیں اور اسکے فعلی اور انفعالی اعمال اور حرکات اُن پر روشنی ڈال سکتے ہیں جو افراد قوم اور جو قومیں اس راہ سے ناواقف ہیں وہ نہ صرف اپنی حسیات ہی کا خاتمہ کر چکی ہیں بلکہ اُن کی ضروریات سے بھی اسقدر دور جا پڑی ہیں کہ اُن کے واسطے یہ ذکر ایک غیر مفید ذکر اور یہ خواب ایک بے تعبیر خواب ہے وہ باوجود اسکے خود میں ایک فرضی حس باقی ہیں اور اس فرضی حس سے زیادہ اُن کے نزدیک اور کوئی حس ہو ہی نہیں سکتی گویا ایک بے حس عضو کو ایک حس دار عضو کہا جاتا ہے اور اُسی پر سب کا مونکا خاتمہ کر دیا جاتا ہے اور یہ ایک باطل پرستی ہے۔ فتدبر۔

سلطان احمد

نظارۂ خرابات

جلوہ فلک پہ شامِ غریباں کا جب ہوا خورشید آرمیدۂ دامانِ شب ہوا
شمعِ حریمِ غم دلِ ایذا طلب ہوا افزوں مرضِ ہجر کو رنج و تعب ہوا
موسیٰ کی طرح طالبِ دیدارِ یار ہے
اپنے سے بے خبر ہے مگر ہوشیار ہے

ہے آتشِ فراقِ ستمگر لگی ہوئی سینے سے ہے امانتِ دلبر لگی ہوئی
ضبطِ فغاں سے مُہر ہے لب پر لگی ہوئی ہے چشمِ انتظار سوئے در لگی ہوئی
سب فرشِ خار بسترِ کمخواب ہو گئے
انجم نثارِ دیدۂ کمخواب ہو گئے

اس بیکسی میں کوئی نہیں ہے پیامبر لیلےٰ کو مرگِ قیس کی پہنچائے جو خبر
بلقیس کا ہو در پہ گدا کے کہاں گذر ہاں مور کو خدا کہیں بخشے جو بال و پر
پرواز تا بہ قصرِ سلیمان ہوا ابھی
مشکل جو آ بنی ہے وہ آسان ہوا ابھی

بیمار اور کوہ شبِ تار الحذر یہ مشتِ استخواں یہ گرانبار الحذر
پائے وہ دل زمانے سے آزار الحذر جو ہے ازل سے تیرا پرستار الحذر
دنیا سے کچھ غرض ہے نہ زر چاہیے مجھے
بس تیری کارساز نظر چاہیے مجھے

بیتاب مجھ سا بلبلِ شوریدہ سر کہاں گُل آشنائے داغِ دلِ نوحہ گر کہاں

پروانہ محرمِ تفِ محشر اثر کہاں　　　اک شمع ساری رات جلے پھر جگر کہاں

سوزِ فراق و حسرتِ نظارہ اور ہے

پارہ کچھ اور ہے دلِ صد پارہ اور ہے

رونق نگار خانۂ افلاک پر نہیں　　　تسکین بخش روحِ جمالِ قمر نہیں

اُجڑے ہوئے چمن میں صبا کا گذر نہیں　　　شاید یہ رات وہ ہے کہ جس کی سحر نہیں

کب سے ترس رہا ہوں میں آرام کے لئے

سینے میں دل تڑپاں ہے دل آرام کے لئے

دکھلائے لاکھ چرخ اگر سحر سامری　　　اور مشتری ہو جلوہ نما صورت پری

زہرہ کرے یہ نغمۂ داؤد ہمسری　　　آتا نہیں کسی کو بھی اندازِ دلبری

نیرنگ عالم اور ہے ہمیں دھیان اور ہے

مسکن ہے جس کا دل وہ سلیمان اور ہے

معلوم ہے بساط تری آسماں ہمیں　　　مہرے بدل بدل کے نئے بازیاں ہیں

اُفتادے ہوں پست یہ طاقت کہاں ہمیں　　　عنقا سے بھی ملا ہے بلند آشیاں ہمیں

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں

جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

بے خانماں ہیں سوختہ ساماں تو کیا ہوا　　　شیرازۂ چمن ہے پریشاں تو کیا ہوا

زیب قفس ہے مرغ خوش الحاں تو کیا ہوا　　　ذوقِ نظر ہے خار بداماں تو کیا ہوا

ابر کرم سے دن جو پھریں خاکسار کے

پھر آئیں گے خزاں میں وہی دن بہار کے

(باقی آئندہ)

آغا غلام حسین ارشد

صغرسنی کی شادی

جہانتک ہندوستان کا تعلق ہے، صغرسنی کی شادی کسی خاص فرقے یا قوم تک محدود نہیں پائی جاتی۔ اسمیں کچھ شبہ نہیں کہ ہندو قوم اس میں زیادہ لتھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور مسلمان کم، مگر ایسی برائی جو کئی قوموں میں مشترکہ ہو اسکا خطرہ زیادہ ہے بہ نسبت اس برائی کے جسکی جوابدہ فقط ایک کمیونٹی ہے۔ باوجود اس امر کے کہ مصلحانِ قوم و ملک اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر ایک حد تک عوام کی آنکھیں کھول چکے ہیں، تاہم پھر بھی یہ برائی بکثرت ہندوستانیوں میں موجود ہے اور اسوقت تک کبھی نیست نابود نہو گی جب تک ہندوستانی فطرتاً اپنے ملکی رواج کا جس نے بدقسمتی سے مذہبی صورت اختیار کر لی ہے سختی کے ساتھ مقابلہ نہ کرینگے اور سن بلوغت کے بعد اپنے بچوں کی شادی کر کے ملک میں شاندار مثالیں نہ پیدا کریں گے۔

صغرسنی کی شادی کے مسئلہ سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اس رسم کے مخالفین کی رائیں بھی مجھے معلوم ہیں اور ایسے لوگوں کے خیالات سننے کا بھی موقع ملا ہے جو اس قبیح رسم کے ابتک موافق ہیں۔ ایسی حالت میں میں اس قابل ہوں کہ موافق و مخالف دونوں پہلو ناظرین کو دکھاؤں اور بتادوں کہ ہمارے ملک کی بھلائی کس میں مضمر ہے۔ ملک کی بھلائی خود ہمارے ہاتھوں میں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک صغرسنی کی شادی کا رواج ہمارے ملک میں موجود ہے اس وقت تک ہم ہندوستان کو اس شاندار حالت پر نہیں دیکھ سکتے جسے ہم نے اپنا آئیڈیل اور مطمح نظر بنا رکھا ہے۔

صغرسنی کے موافقین کہتے ہیں کہ یہ مفید چیز ہے اس لیے کہ

(۱) میاں بیوی میں عمر بھر محبت رہتی ہے، اور

(۲) لڑکا عیوب سے بچا رہتا ہے۔

اسمیں کچھ شبہ نہیں کہ جس بحث کا بیج بچپن میں بو یا جاتا ہے وہ عمر بھر رہتی ہے لیکن ہمیں اب یہ دیکھنا ہے کہ ملک کے موجودہ رسم و رواج کے مطابق کہاں تک باہمی میل جول کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اس بارے میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ دونوں کو ارتباط کرنے کے موقع نہیں ملتے اور اس لیے وہ مطلب فوت ہو جاتا ہے جس غرض سے کہ بچپن میں شادی کی گئی ہے۔

دوسری وجہ کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ عام طور پر نکاح ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد باقاعدہ شادی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ پنجاب میں اس رسم کا نام مکلاوہ ہے اور بعض اوقات نکاح اور مکلاوہ کے درمیان کئی سال کی مدت حائل ہو جاتی ہے اور اس عرصہ میں بیرونی خراب اثرات سے متاثر ہونے کے لیے لڑکے کو کافی موقع و فرصت مل سکتی ہے۔ اس عرصہ میں اگر وہ خراب ہونا چاہے تو ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ صغرسنی کی شادی لڑکے کو خراب صحبت سے بچانے میں مدد دیتی ہے، کسقدر بے معنی ہے؟

ان دلائل سے قطع نظر ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ شادی کا مقصد کیا ہے اور یہ کہ آیا صغرسنی کی شادی اس مقصد کو پورا کر سکتی ہے یا نہیں؟

قدرت پر جب ہم غور کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہر چیز میں نر اور مادہ پیدا کیا ہے۔ جانداروں کے علاوہ یہ تذکیر و تانیث درختوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ درختوں کے نر مادہ ہونے کی بحث چھیڑنے کا یہ وقت نہیں، مگر اتنا جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بعض درخت نر و مادہ دونوں جزو اپنے میں رکھتے ہیں اور بعض میں صرف نر کا جزو ہوتا ہے اور باقیوں میں مادہ کا۔ خاص وقت پر ان کا بیج مختلف قدرتی طریقوں سے ملتا ہے اور اس طرح سے ایک درخت دوسرے پودے کی زندگی پیدا کرتا ہے

باعث ہوتا ہے۔ اور درختوں کی نسل کا سلسلہ برقرار رہتا ہے۔ مگر اس سلسلہ پیدائش کی بابت یہ بات خاص طور پر ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ یہ سب کچھ وقت پر واقع ہوتا ہے اور وقت سے پیشتر کبھی نہیں ہوتا۔ درختوں کے علاوہ حیوانوں میں ہم یہ بات نمایاں طور پر دیکھتے ہیں کہ وہ سن بلوغت کے پہنچ جانے کے بعد ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور اس طرح سے سلسلۂ توالد و تناسل کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس بارے میں انسان دیگر حیوانوں سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ توالد و تناسل کا فرض جو شادی کا مقصد ہے، ایسی عمر میں ادا کرے جبکہ قوی بالطبع اسکے ادا کرنے سے نہ تھک جائیں۔ یہ عمر سن بلوغت کے بعد کی عمر ہے۔ انسان کے لیے دیگر جانداروں کی مثال باعث عبرت ہے۔ مرد اور عورت کا ایسے وقت میں ایک دوسرے کیلئے سلسلہ پیدائش یقیناً ان کے جبکہ قوی پورے نشو و نما یافتہ نہوں، نظام اعصاب کی تباہی کا باعث ہوگا۔ خدا تعالےٰ کا انسان کو یہ قوت عطا کرنا کہ وہ خاص عمر کو پہنچ کر اپنی نسل خود بڑھا سکے، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خود چاہتا ہے کہ شادی کا مقصد باحسن وجوہ ادا ہو اور وہ اچھی طرح سن بلوغت کے بعد ہی ادا ہو سکتا ہے۔ صغر سنی کی شادی سے بعض اوقات توالد و تناسل کا مقصد تو ادا ہو جاتا ہے مگر خوش اسلوبی سے نہیں۔ قدرت اس ذمہ داری کو ہمارے سر پڑنا چاہتی ہے جبکہ ہم جسمانی طور پر اسکے ادا کرنے کے قابل ہو جائیں لیکن ہم از خود یہ بوجھ ایک ایسے وقت میں دوسروں کے کہنے سے اٹھا لیتے ہیں جبکہ ہم بالکل اسکے ناقابل ہوتے ہیں۔ بچے پیدا کرنے کی قابلیت لڑکی میں کم عمری میں بھی موجود ہوتی ہے لیکن اس قابلیت کو پیش از وقت استعمال کیا گیا تو اسکا نتیجہ کمزور اولاد ہوگی اور کشمکش حیات میں پورا اترنے کے لیے ضرورت ہے کہ اولاد ہر لحاظ سے توانا و طاقتور ہو۔ صغر سنی کی شادی میں توانائی کا سوال بالکل جاتا رہتا ہے اور اس سے پیشتر کہ لڑکا اور لڑکی اپنے تئیں تندرست قائم رکھ سکیں، توالد و تناسل کا بوجھ ان پر ڈال دیا جاتا ہے وہ علاوہ

اولاد کے فرائض کو نہیں جانتے اور جیسا کہ اکثر دیکھا گیا ہے گھر کی دوسری عورتوں کو بچے کی پرورش کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں صغر سنی کی شادی وبالِ سر کے مترادف ہے۔

مزید براں بے وقت کی شادی ہماری قوت نمو کو یکقلم رد کر دیتی ہے اسلیے کہ جو قوت پہلے اعضا کے بڑھانے میں صرف ہوتی وہ اب تمام و کمال یا زیادہ تر دوسری سمت میں استعمال کی جاتی ہے۔ اسکے علاوہ ہمارا نظام اعصاب قدرتی طور پر اسطرح سے بنایا گیا ہے کہ اگر اسپر پیش از بلوغ ذرا زیادہ بوجھ ڈالا گیا تو وہ کمزور ہو جاتا ہے، اور میاں بیوی ساٹھ سال کی عمر میں ایسے ضعیف ہو جاتے ہیں کہ گویا وہ ۸۰-۹۰ برس کے ہیں۔ یہ پیش از وقت پیرانہ سالی وہ سزا ہے جو قدرت ان لوگوں کو دے رہی ہے جو قدرتی قانون کے خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے لوگ ۶۰ سال کی عمر میں از کار رفتہ ہو جاتے ہیں اور اپنا وقت خدا کے دھیان میں صرف کرنے کی غرض سے کونے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر فزیالوجی کی رو سے دیکھا جائے تو ۶۰ سال کی عمر میں دماغی حالت اصل عروج پر ہوتی ہے۔ موجودہ جنگ یورپ میں جسقدر مشہور برٹش افسر اور کمانڈر ہیں وہ عمر میں پچاس سے زائد ہیں۔ جرمن افسر ساٹھ سے زیادہ ہیں اور بعض ستر سے متجاوز ہو گئے ہیں اور اس عمر میں زندگی اور موت کی جنگ میں مصروف ہیں۔ اگر وہ ہندوستانی ہوتے تو یقیناً کسی کام کے نہ رہتے اور اپنے ہوش و حواس کو بھی کھو بیٹھتے۔ ہمیں صغر سنی کی شادی کی سزا ملتی ہے اور انھیں قدرتی عمر میں شادی کرنے کا انعام۔

اسکے علاوہ آٹھ یا دس برس کی لڑکی کی جب شادی ہوتی ہے اور دوسرے سال جب اُسکے ہاں اولاد ہوتی ہے تو اسوقت اسے ایسی ناقابل بیان تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو صرف اس حالت میں سے گذرے ہوئے لوگوں ہی کو معلوم ہے۔

اس ضمن میں میں ایک قصہ بیان کروں گا۔ ایک لڑکی کی شادی دس برس کی عمر میں ہوئی اور گیارھویں سال اولاد ہوئی۔ اولاد ہونے سے چار دن قبل اسپر درد کے باعث سکرات کی سی حالت طاری رہی۔ آخر درد کی تکلیف اسقدر بڑھی کہ آس پاس کے لوگ اسے برداشت نہ کرسکے اور یہ تجویز ہوئی کہ اسے کلورافارم سنگھا دیا جائے۔ دس گھنٹے تک وہ اس دوائی کے زیر اثر بیہوش پڑی رہی اور اسکے بعد جب بچہ پیدا ہوا تو وہ مرا ہوا تھا اور اسکے ساتھ ہی گیارہ برس کی ماں بھی ختم ہوچکی تھی۔ اس ایک واقعہ سے ان تمام تکالیف کا اندازہ ہوسکتا ہے جو قدرتی طور پر گیارہ سے لیکر پندرہ برس کی کم عمر ماؤں پر بچہ پیدا ہونے کے وقت گذرتی ہیں۔ بچے بعض اوقات مردہ پیدا ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ کمزور ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ان کے حواس معطل ہوتے ہیں اور باوجود ان تمام خرابیوں کے ملک میں صغرسنی کی شادی کا رواج ہے۔ اور سب سے زیادہ عجیب وغریب بات ایسی شادیوں کے متعلق یہ ہے کہ ان کی انجام دینے والی بڑی بوڑھی عورتیں ہی ہوتی ہیں جو رسم ورواج اور اپنی بیوقوفی کے باعث اپنی اولاد کو ایسی مصیبت کے حوالے کردیتی ہیں جو بالآخر ان کی جان لے کر ختم ہوتی ہے۔ گذشتہ مردم شماری کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ملک میں لاکھوں بیوائیں ایسی موجود ہیں جنکی عمر پانچ اور پندرہ سال کے درمیان ہے اور اگر دیکھا جائے تو یہ وہ زمانہ ہے جبکہ انھیں مدرسہ میں ہونا چاہیے تھا۔

مدراس پریزیڈنسی میں پانچ سے کم عمر کی سات سو اڑتیس بیوائیں موجود تھیں اور پانچ سے دس برس کی عمر کی چار ہزار تین سو تیس اور دس اور پندرہ برس کی عمر کی چوبیس ہزار چار سو سینتالیس۔ ان اعداد سے ان بدبخت وجودوں کی تعداد معلوم ہوسکتی ہے اور پھر ہمارے ہاں کی رسم ورواج ایسے ہیں کہ بیوہ ہو جانے پر تمام دنیا کی لعنت طعن اسی کے حصے میں آنے لگتی ہیں۔ بعض ہندوؤں میں یہانتک ہے

کہ ہر خوشی کے موقع پر بیوہ کو کوٹھری کے اندر بند کر دیا جاتا ہے۔ مبادا اسکا منحوس اثر باقی گھر والوں پر نہ پڑے۔ یہ ہے وہ شرم و ذلت کی زندگی جو اسے بیوہ ہو جانے کے بعد بسر کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات یہ بھی سزا ملتی ہے کہ وہ دوسرا نکاح نہ کرنے پائے گویا اپنے خاوند کی موت کی ضامن وہی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسی رسم جو اپنے میں فائدہ کچھ نہیں رکھتی اور سراسر نقصان ہی سے مملو ہے، کیونکر وجود میں آئی؟ ہندوؤں میں "منو" کے قوانین کو خاص درجہ دیا جاتا ہے اور اگرچہ اسمیں صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ مرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ۲۴ برس کی عمر تک برہم چاری رہے اور اسکے بعد گرہستی زندگی بسر کرے مگر بعد میں جو سمرتیاں لکھی گئیں انمیں عورت کی شادی کے قابل عمر آٹھ اور دس سال بتائی گئی ہے مگر ساتھ ہی آٹھ برس کی لڑکی کے لیے چوبیس برس کا مرد لکھا ہے جو بالکل نامعقول ہے ان سمرتیوں کا اثر ہندوؤں میں اسقدر زیادہ ہے کہ اب صغر سنی کی شادی کا بالکل عام رواج ہو گیا ہے۔ غالباً اسمیں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بعد کے لوگوں کی کارستانی معلوم ہوتی ہے اور اس لیے جب کبھی فیصلہ کرنے میں کچھ دقت معلوم ہو تو اس صورت میں ہمیں چاہیے کہ مذہبی قانون کا (جو در اصل غلطی سے مذہبی قرار دے لیا گیا ہے) قانون قدرت سے موازنہ کریں۔ اور موخرالذکر کو اسلیے قبول کر لینا چاہیے کہ وہ بالکل اٹل ہے اور ایسا قانون ہے جسے کسی انسانی ہاتھ نے نہیں وضع کیا اور صرف خدا کا وضع کردہ قانون ہے۔ لیکن اگر ہم ہندوؤں کے قدیم زمانے کی طرف جائیں تو ہمیں صاف معلوم ہو جائیگا کہ اس زمانے میں شادی سن بلوغ میں پہنچنے کے بعد ہوتی تھی اور در اصل ہندو قوانین بھی یہی ہیں کہ ایسی عمر میں شادی کی جائے کہ میاں بیوی دونوں اس مقصد کو اچھی طرح سے سمجھ سکیں جسکے لیے قدرت نے انھیں ملایا ہے۔ قدیم ہندو کتب میں اس امر کی بہی مثالیں ملتی ہیں کہ

شادیاں مرد اور عورت دونوں کی باہمی رضامندی سے ہوا کرتی تھیں۔ موجودہ زمانے کی ہندو اسپرٹ کا مقابلہ قدیم اسپرٹ سے کیا جائے تو صاف کہنا پڑے گا کہ

ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بہ کجا

مزید براں ہندوؤں کے چار آشرم میں سے ایک آشرم یہ ہے کہ وہ ۲۵ برس کی عمر تک بالکل برہم چاری (مجرد) کی زندگی بسر کرے۔ ایک طرف اس حکم پر یقین کیا جاتا ہے اور دوسری طرف صغر سنی کی شادی پر زور دیا جاتا ہے۔ ایک طرف کہا جاتا ہے کہ برہم چرج رکھو اور دوسری طرف بچپن کی شادی کو بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ بچپن کی شادی اور برہم چاری کی زندگی دونوں متضاد چیزیں ہیں، ایک وقت میں صرف ایک رہ سکتی ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اکثر ہندوؤں کے دلوں میں یہ خیال ہے کہ بچپن کی شادی کا اس لیے رواج ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے حملوں کی وجہ سے عورتوں کے لیے محافظ مقرر کر دینا زیادہ قرین مصلحت سمجھا گیا تھا۔ کیونکہ والد کے بعد عورت کی حفاظت کا بوجھ اسکے خاوند پر ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ جس عمر میں شادی کر دی جاتی تھی وہ ایسی کم ہوتی تھی کہ خاوند بیوی کی حفاظت تو کیا اپنی حفاظت بھی بمشکل کر سکنے کے قابل ہوتا تھا۔ یہ وجہ میں اب تک سمجھنے سے قاصر ہوں۔

مسلمانوں میں یہ قبیح رسم اسلئے آئی کہ بہت سے ہندوؤں نے مسلمان ہو جانے پر بھی اپنی قدیم رسموں کو نہیں چھوڑا۔ پیرانا رنگ اسپر اسقدر غالب تھا کہ وہ نئے رنگ سے کلی طور پر متاثر نہ ہو سکے۔ اب بھی دیہات میں ایسے مسلمانوں کی تعداد بے انتہا ہے جو پوچھنے پر اپنے آپ کو مسلمان بتائینگے مگر نام اور رسم و رواج کے اعتبار سے اگر

دیکھا جائے تو وہ پورے ہندو ہیں۔ چونکہ یہ خود اسی رسم میں مبتلا تھے، اسلیے انھوں نے مسلمانوں کو بھی مبتلا کر دیا۔

مگر وجہ خواہ کچھ ہی ہو اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں ہمیں آلودہ نظر آتے ہیں اور اب دونوں فریقوں کے لیڈروں اور ہر خیر خواہ ملک و قوم کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے ذرائع اختیار کرے جس سے اس رسم کا بتدریج ہمیشہ کے لیے استیصال ہو جائے اور آئندہ جو نسل پیدا ہو وہ موجودہ نسل کی طرح قد میں چھوٹی اور جسم میں کمزور نہ ہو بلکہ وہ پرانے راجپوتوں کی طرح سے مضبوط و توانا ہو کیونکہ ہندوستان کا مستقبل طاقتور لوگ بنا سکتے ہیں نہ کہ کمزور ٹھٹھرے ہوئے نوجوان۔

علم النفس کا ایک اصول یہ ہے کہ ہر کام کے لیے ایک مصمم مرضی اور ارادے کی ضرورت ہے۔ لہذا ان تمام والدین کو جو دل سے اپنے ملک کی ترقی چاہتے ہیں، یہ عزم بالجزم کر لینا چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کی شادی شیر خوارگی اور بچپن میں نہ کرینگے (ہندوستان میں عورت کی شادی کی عمر ۱۶ سال ہے اور مرد کی ۲۵ سال) دوسرے ہر قومی درسگاہ کو تعلیم کے بارے میں تھیوسوفیکل خیالات کی عملی اشاعت کرنی چاہیے ہر تھیوسوفیکل انسٹیٹیوشن کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کبھی ایسے طالب علم کو اپنے سکول میں داخل نہیں کرتا جسکی شادی ہو چکی ہو۔ برخلاف اسکے لڑکے کے والدین کو سمجھایا جاتا ہے کہ وہ لڑکے کی شادی کا خیال اسوقت دل میں لائینگے جبکہ وہ اسکول کی تعلیم ختم کرے گا، اور اس سے پہلے نہیں۔ تھیوسوفیکل سوسائٹی نے جو یہ تعلیمی آئیڈیل مقرر کیا ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک تعلیمی زندگی اور گرہستی زندگی میں نمایاں اختلاف ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بالکل علحدہ ہیں اور ایسے زمانے میں جبکہ اسکول کی تعلیم اور امتحانات کے سلسلہ کی بدولت لڑکے پر بہت زیادہ بار پڑتا ہے، اگر اسے خاوند بنا دیا جائے گا تو اسکا نتیجہ اسکی جسمانی صحت پر ایک ایسا

بوجھ ہوگا جسے وہ کبھی برداشت نہیں کرسکے گا۔ ساتھ ہی جب ہر سال اسکولوں اور کالجوں سے ایسے بیماریوں کی تعداد نکلے گی جو جسم اور دماغ میں کافی طور سے مضبوط ہوں گے تو آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہندوستان کے کیسے پھلنے آ جائینگے یہ دونوں باتیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں، ذرا سی دلیری اور فراست اشیا سے طے پاسکتی ہے اور دونوں صفات کے بغیر آج تک کوئی قوم اصلی قومیت تک نہیں پہنچی۔

ہندوستان کے موجودہ تعلیم یافتہ گروہ میں بہت کم ایسے اشخاص ہیں جو تیس برس کی عمر میں بالکل تندرست ہوں۔ ہزار ہا نوجوان اعصاب اور معدہ کی بیماریوں میں مبتلا ہیں سینکڑوں دوران خون کی شکایت کے شاکی ہیں اور ہزاروں ایسے ہیں جنکے اعضائے رئیسہ کمزور ہیں۔ اسی طرح ذیابیطس کے مریضوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ یہ سب لوگ کمزور والدین کی اولاد ہیں اور ان میں سے اکثر ایسے ہوں گے جنھوں نے صغر سنی میں شادی کی ہوگی۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایسی حالت ہندوستان کے تعلیمی پہلو پر ایک بہت بدنما دھبہ ہے ہمارے نوجوان ۳۰ سال کی عمر میں پچپن کے اور ساٹھ سال کی عمر میں نوّے سال کے معلوم ہوتے ہیں درآنحالیکہ دوسرے ممالک کے بوڑھے آدمی بڑھاپے میں بھی اپنی قوم کو صلاح و مشورہ دینے کے قابل رہتے ہیں۔ یہی حالت ہم ہندوستان میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس بری رسم کے استیصال میں ہندو مسلمان دونوں کو مل کر کام کرنا چاہیے۔ مختلف لکچروں کے ذریعہ والدین کے دلوں میں اس رسم بد کی طرف سے خوف اور دہشت بٹھا دینی چاہیے اور اگر ہم لڑکیوں کی خاطر نہ سہی، لڑکوں ہی کی خاطر صغر سنی کی شادی کو بند کردینگے تو ہم اس زمانے کو اس شاندار بنانے کو جسے ہماری آنکھیں عالم خیال میں دیکھ رہی ہیں بہت زیادہ

قریب لے آئیں گے اور ہم ہر لحاظ سے ایک ایسی مضبوط قوم بن جائیں گے جو دنیا میں عزت و وقار کے ساتھ رہنے کے قابل ہو سکے گی۔

اگر ہم نے صغرسنی کی شادی کو جلد کم نہ کیا تو بیسویں صدی کے آدمیوں پر یہ الزام عاید ہوگا کہ وہ دختر کشی کرنے اور ستی کرانے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ دونوں خوفناک مراسم اصولاً معدوم ہیں مگر صغرسنی کی شادی میں ہم ان ہی رسموں کو گویا ادا کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ رسم ان سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔

"اے خدا تو ہماری آنکھیں کھول تاکہ ہماری تباہی خود ہمیں نظر آنے لگے اور ساتھ ہی ہمیں اس سے بچنے کی بھی توفیق دے۔"

ترکِ محبّت

ضیاالدین برنی

میں کہ اب مستغنیِ جذباتِ الفت ہوگیا — ہستیِ ناآشنائے رنج و راحت ہوگیا
دل سے مطلق مٹ گئی خارِ محبّت کی خلش — اندمالِ دردِ ریزیِ جراحت ہوگیا
خواہشاتِ مضطرب احساس ساکن ہوگئیں — شوق رخصت ہوگیا ارمان رخصت ہوگیا
مل گئی فرطِ تمنا کی کشاکش سے نجات — سدِّ بابِ تلخیِ انجامِ حسرت ہوگیا
ذوقِ نظارہ رہا باقی نہ امیدِ وصال — اختتامِ ناگواری ہائے فرقت ہوگیا
عشقِ رسوا کن کی محشر زائیاں جاتی رہیں — جذب۔ ضبطِ نفس میں جوشِ طبیعت ہوگیا
بے نیازی اک نیاز آگینیوں میں آگئی — ناشناسِ طرز و اندازِ محبّت ہوگیا
اب بھی دل ہے وہی میں ہوں وہی دورِ حیات — اور حاصل پھر وہی عہدِ فراغت ہوگیا

درد کی بیدردیاں آخر میں درماں ہوگئیں
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

ارشد تھانوی

شاعر

نرگس و نسرین کیا۔ کیا یاسمن کیا نسترن
لالۂ آتش نوا کیا بلبلوں کی انجمن

موج دریا کا تموج چاند کا پیارا سماں
برق و باران و شفق سب رنگ ہائے آسماں

آہ و غم۔ شور دوام۔ عشاق کا سوز و گداز
آمدِ بادِ صبا محبوب کے انداز و ناز

دامنِ صحرا۔ نکیلے خار۔ رنگیں کشت زار
بھینی بھینی گل کی خوشبو۔ رونق فصل بہار

بلبل و قمری کے نغمے ہُو ہُو و گل کی نمود
ساغر و مینا کی باتیں انکشاف ہست و بود

آرزوئے شاعرانا کام کا انجام ہیں
صدر بزم لامکاں کی شان کا پیغام ہیں

حسن کیا ہے دیدۂ شاعر کا ہے سماں نواز
راگ کیا ہے نغمۂ تار رباب سوز و ساز

فلسفی سمجھا تحیر میں فقط ناداں مجھے
زاہد ناداں نے جانا قالب بیجاں مجھے

مجھکو خالق نے محبت کے لیے پیدا کیا
گل کا بلبل کا تخیل کا مجھے شیدا کیا

بے زبانی ہے دل کسی کی میں کسی کا راز ہوں
گل صفت اس انجمن میں گوش بر آواز ہوں

ہوں سراپا نور مشعل نور کا جویاں ہوں میں
وادیِ ایمن کا ذرہ ہوں ید بیضا ہوں میں

حرف کُن کی دھن میں چھوٹی سی اک تفسیر ہوں
خوش نظر آتا ہوں لیکن درد کی تصویر ہوں

اپنی ہستی کا نشاں میں آپ پا سکتا نہیں
دل میں رکھتا ہوں بہت کچھ لب پہ لا سکتا نہیں

ہوں سکوت آموز حرف مدعائے درد قوم
التجائے قلب ملت ہوں صدائے درد قوم

اک طرف لیلیٰ کو رلواتی ہے خاموشی مری
اک طرف مجنوں کو تڑپاتی ہے بیہوشی مری

اسقدر جلوے عیاں ہیں پیکر خاموش میں
اسقدر یوسف نہاں ہیں روح کی آغوش میں

شورشِ دنیا کو اک محشر دکھا سکتا ہوں میں
اہل محفل کو ہنسا سکتا رلا سکتا ہوں میں

نتیجۂ محمد انور سیالکوٹی

فضل لکھنوی

بعض خوش نصیبوں کو خزانۂ غیب سے بے تلاش وجستجو وہ دولت مل جاتی ہے جو بہتوں کو کوشش وسعی سے بھی میسر نہیں آتی۔ دنیا اس خداداد دولت کو حیرت کی نظر سے دیکھتی اور تعجب کرتی ہے لیکن جن لوگوں کو شاہی درباروں کے حالات سے کچھ دلچسپی ہے ان کے نزدیک یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ ایسے واقعات بکثرت پیش آتے رہتے ہیں، اور مستحق وغیر مستحق سب کے سب انعام پاتے ہیں ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دولتِ شاعری بھی مبدءِ فیاض سے بعضوں کو اسطرح چھپر پھاڑ کے مل جاتی ہے گویا وہ ماں کے پیٹ ہی سے شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ نہ ان کو عروض سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے نہ قافیہ کی حاجت، موزوں طبیعت ہی بحر ہے اور مذاق سلیم تقطیع، نہ کسی کے آگے زانوے شاگردی تہ کرنے سے مطلب، نہ کسی سے دوستانہ مشورہ کی غرض۔ لطف یہ ہے کہ کم استعدادی وکم علمی بھی سدّراہ نہیں ہوتی بخلاف اسکے جن لوگوں کو قدرتی طور پر استعداد نہیں وہ علم وفن شعر کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے میں عمریں صرف کر دیتے ہیں، تب بھی وہی "ڈھاک کے تین پات"۔

اسلام سے پہلے عرب کے شاعر جن کی شاعری اور فصاحت و بلاغت نے انھیں "عرب العرباء" کا معزز خطاب دلایا، تمام عالم سے اپنا لوہا منوایا قریب قریب سب جاہل تھے لیکن شعر ایسے کہتے تھے کہ ان کے اخلاف جنکو "مولدین عرب"

کہتے ہیں باوجود علم و فضل کے اُنکے برابر نہ پہنچ سکے اور نہ اُنکی فصاحت و بلاغت کو پا سکے۔ مگر عجم میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ جاہل ہو کر اعلےٰ درجہ کے شاعر ہوے ہوں اہل ادب کے دلوں پر اُنکا سکہ بیٹھا ہو یا کسی نے اُن کا لوہا مانا ہو۔ ہاں اوسط درجے کے کہنے والے مل جائیں گے جنکے کلام میں رطب و یابس دونوں حصّے برابر ہونگے مگر وہ بھی بمشکل اور معدودے چند۔

ان ہی معدودے چند میں سے ایک حضرت فضل لکھنوی ہیں جنکی بے علمی پر نظر کرتے ہوے حیرت ہوتی ہے اور بے اختیار زبان پر شعر آجاتا ہے ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

حضرت فضل کی ولادت باسعادت لکھنؤ کے مشہور محلہ "قندھاری بازار" میں ہوئی یہیں وہ سِن تمیز کو پہنچے اور ۱۹۰۶ء تک یہیں سکونت پذیر رہے۔ پورا نام فضل اللہ اور ان کے والد کا نام محمد خاں ہے۔ آپ ایک اعلےٰ خاندان سے ہیں۔ آپ کے باپ دادا بڑے کامل فاضل لوگ تھے "نافع السالکین" میں اُن حضرات کا مختصر تذکرہ موجود ہے۔ مگر اُن کے خلاف حضرت فضل نے اپنا تمام زمانۂ طفولیت کھیل کود میں ضائع کیا۔ پڑھنے لکھنے میں بالکل دل نہ لگایا بلکہ اسقدر بے تعلق رہے کہ اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔ یا للعجب!

عبرت کا مقام ہے کہ فاضلوں کے لڑکے علم و فن سے اس طرح کورے رہیں کہ اپنا نام بھی نہ لکھ سکیں۔ ؎

گہ آری خلیلے نہ تبخانہ　　کنی آشنائی نہ بیگانہ
گئے باپیاں گوہر خانہ خیز　　چو بوطالبے را کنی سنگ ریز

اخیر عمر میں اپنی اس نا رحالت پر خود بھی بہت افسوس کرتے تھے۔ مگر

"اب پچھتائے کا ہوت ہے، چُگ گئیں چڑیاں سبرا کھیت"

ساٹھ برس کی عمر میں جب مکہ معظمہ سے حج کرکے واپس آئے تو قرآن شریف (اس خیال سے کہ یہی دین و ایمان ہے) پڑھنا شروع کیا۔ چنانچہ تخمیناً دو سال میں ختم ہوا بس آپ کا سارا سرمایۂ علم یہی ہے۔ اور سچ پوچھیے تو یہ بھی بہت کافی ہے اور اس کا علم اصل علم ہے۔

شعر و شاعری کا چسکا روز ازل میں پڑ چکا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی شعر کی دُھن میں سیدھے اور اُلٹے سیدھے الفاظ جوڑ جوڑ کر شعر موزوں کرنے لگے۔ پھر لوگوں کے ساتھ مشاعروں میں جانا شروع کیا۔ پڑھنے کے لیے نہیں صرف سُننے کی غرض سے۔ سُنتے سُنتے اشعار کے معنے مطلب سمجھنے لگے اور مہمل و با معنے کہنے بھی لگے۔ جو کچھ کہتے پہلے اپنے ہمجولیوں کو سُناتے وہ داد دے کر اور واہ واہ کرکے دل بڑھاتے اسی طرح ان کا حوصلہ روز بروز بڑھتا رہا اور مشق ہوگئی۔ یہانتک کہ زمرۂ شعرا میں داخل ہوگئے۔ اوّل اوّل تو چار چار، پانچ پانچ شعر کہتے تھے پھر پوری پوری غزلیں ہونے لگیں۔ خود تو لکھنا آتا نہ تھا اپنا کلام لوگوں سے لکھوا لکھوا کے بڑے شوق سے جمع کرتے رہے۔ جن اشعار کے لکھوانے کی نوبت نہ آتی وہ چند روز میں صفحۂ دل سے اُتر کر بیاض نسیان پر درج ہو جاتے۔ قبل اسکے کہ اس مجموعہ کی (جو اس محنت سے دوسروں سے لکھوا لکھوا کے جمع ہوا تھا) کوئی شہرت ہو یا طبع کی نوبت آئے گردش گیتی نے ۵۷ء کے فتنہ میں یہ بتمام سرمایۂ عمر تلف کر دیا۔ دل پر کیسی چوٹ لگی ہوگی؟ کسقدر صدمہ ہوا ہوگا؟ شاعر کے لیے اس سے زیادہ اور کیا رنج دہ سانحہ ہو سکتا ہے؟ یہی اُن کے لخت جگر اور یہی پارہ ہائے دل۔ سچ یہ ہے کہ جسقدر صدمہ و رنج ہوا ہو تھوڑا ہے۔ اس ہنگامہ میں نہ صرف یہ مجموعہ ہی ضائع ہوا بلکہ لکھنؤ سے محبوب وطن کو بھی خیرباد کہنا پڑا۔ عزیز احباب بھی پراگندہ ہوا۔ عزیز و اقارب میں بھی کوئی کہیں جا پڑا کوئی کہیں بغاوت

لکھنؤ کے بعد خالص پور میں قیام اختیار کیا۔ یہ گاؤں حضرت فضلؔ کے بزرگوں کی جاگیر میں ہے اور لکھنؤ سے دس بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے:

یہاں آنے کے بعد نئے افکار اور پیش آنے والے ترددات کی وجہ سے مدت تک شعر و شاعری کا مشغلہ موقوف رہا۔ اگر کوئی موقع پیش بھی آیا تو غدر کی تباہی سے ایسے متاثر تھے کہ کچھ نہ کہا اور بالکل زبان بند کیے بیٹھے رہے۔ ایک عرصہ کے بعد جب ذرا اطمینان حاصل ہوا تو دوستوں کے اصرار سے کبھی کبھی ایک آدھ غزل کہہ لیتے اور اپنے صاحبزادے کے معلموں سے لکھوا کے رکھ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک ایک کرکے ایک اچھا خاصہ مجموعہ تیار ہو گیا۔ اب جی چاہا کہ یہ چھپ جائے تو بہتر ہے۔ مگر ساتھ ہی اسکے یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ "مجھ جاہل ناخواندہ کے کلام میں سینکڑوں، ہزاروں غلطیاں ہوں گی۔ لوگ اعتراض کریں گے، ہنسیں گے" اب ایک کشمکش میں پڑ گئے اُدھر طبع دیوان کا شوق دامنگیر ادھر یہ خیال عاقبت مآل چھپنے سے مانع۔ آخر اشتیاق طبع غالب آیا اور بڑے پس و پیش کے بعد یہ خیال کرکے کہ "کوتہ نظر جو چاہیں کہیں مگر اہل انصاف میری ہیچمدانی پر نظر کرکے ضرور داد دیں گے" مولوی عبدالعلی صاحب آسیؔ مرحوم مالک مطبع آسی محمود نگر لکھنؤ کے پاس بغرض طبع لیگئے۔ مولوی صاحب موصوف نے اُسے شروع سے آخر تک بنظر تعمق دیکھا اور پوری پوری داد دی۔ کہیں کہیں بعض الفاظ کا ردوبدل بھی کردیا اور قافیوں کی غلطیوں کو بھی بنادیا۔ پھر خود ہی چھپنے کا انتظام کیا۔ مولوی صاحب کی اس داد و مہربانی سے حضرت فضلؔ نے نیک فال لی اور سمجھ لیا کہ "ہاں اہل نظر ضرور داد دیں گے۔ چنانچہ سنہ ۱۳۱۱ھ میں یہ دیوان [1] نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے

[1] جن حضرات کو ملاحظہ کا شوق ہو آسی پریس محمود نگر لکھنؤ سے طلب فرمائیں۔ ۸ر قیمت ہے لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے البتہ کاغذ معمولی ہے۔ دیکھنے کی چیز ہے۔

آسی پریس لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہوا - یہ دیوان اسوقت ہمارے پیش نظر ہے - ۱۸۸ صفحوں پر ختم ہوا ہے - شروع میں پانچ چھ صفحے فضل صاحب نے اپنے حالات لکھے ہیں جنمیں اپنی جہالت پر بہت کچھ اظہار تاسف بھی کیا ہے - اسکے خاتمہ پر یہ شعر درج ہے ؎

غلام ہمت آن شاعران ذی کرم
کہ یک صواب ببینند و صد خطا پوشند

اسکے بعد طبع دیوان کی تاریخ میں ایک قطعہ لکھی ہے اور سچ یہ ہے کہ حضرت فضل نے تاریخ بہت خوب نکالی ہے - وہو ہذا

الٰہی خوش ہوں سب جملہ احباب   ہو مرا یہ نامہ باغ بے خزاں
ہوا تیار جب یہ گلشن شوق   کہی تاریخ اسکی "باغ شاداب"

اب غزلوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے - ردیف الف میں چند غزلیں حمد و نعت اور بزرگان دین کی شان میں ہیں - ایک مناجات ہے بہتر شاعرانہ کلام ہے - اس موقع پر بطور نمونہ کے چند غزلیں بلا انتخاب درج کی جاتی ہیں جو اس ناخواندگی پر بے شک قابل ستایش ہیں - ناظرین ملاحظہ فرمائیں - ببر کی مشہور زمین "شراب کی سی ہے" "حباب کی سی ہے" میں فرماتے ہیں ؎

زیست دنیا کی خواب کی سی ہے   بلکہ دنیا حباب کی سی ہے

ببر کے بعد یہ مطلع! فنا سے دنیا کا ایسا مرقع ہے!! زبان سے بے اختیار واہ نکلتی ہے - سبحان اللہ! ایسے ہی اشعار حضرت فضل کی مداحی کرلے بغیر نہیں رہ سکتے - ان ہی اشعار نے مولوی عبد العلی صاحب کو ثناخوانی پر مجبور کیا ہوگا - اور فرماتے ہیں

رنج ہجراں نہیں ہے دنیا میں   اک نشانی عذاب کی سی ہے
کیا کہوں اللہ وصف اُس گل کا   ساری رنگت گلاب کی سی ہے

آتش غم سے دل جلا شاید — یہ تو اس کی کباب کی سی ہے
بہکی بہکی ہے چال یار کی آج — کیفیت سب شراب کی سی ہے
میرے رونے کو دیکھ کہتے ہیں — یہ تو بارش سحاب کی سی ہے
فضل کچھ مجھسے بولتے نہیں آپ
یہ نشانی عتاب کی سی ہے

"کفن بگڑا، دہن بگڑا" کی طرح میں آتش نے اپنے اُستاد مصحفی سے کہا تھا "استاد اس ردیف قافیہ میں کوئی ایک شعر نکال دے تو کلیجا نکل پڑے" حضرت فضل فرماتے ہیں

نہیں مجھ سے اکیلا دوستو وہ گلبدن بگڑا — اس اپنے عندلیب دل سے [illegible] بگڑا
سحر کے وقت جب وہ شمع محفل سے جاتا ہے — نظر آتا ہے دن بھر مجکو رنگ [illegible] بگڑا
بگاڑا تو بہت تو نے صبا گیسوے جاناں کو — نہ کچھ بل آیا اُسمیں ہو رنہ اسکا بانکپن بگڑا
سوال اُس سے کیا جب ڈرتے ڈرتے لبکے بوسہ کا — کہوں کیا کسطرح مجھ سے مرا شیریں دہن بگڑا

"دہن" کے قافیہ پر بھی آتش کو بڑا ناز تھا۔ ہمارے اَن پڑھ فضل نے جو اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتے تھے "دہن" کا قافیہ باندھ دیا۔ اور "شیریں" کا لفظ اسپر لگا۔ [illegible] ماشاءاللہ جس کو آتش سا اُستاد مشکل سمجھے اُسکو حضرت فضل آسان کر کے یوں کہدیں۔

"کہوں کیا کسطرح مجھ سے مرا شیریں دہن بگڑا"
تمہارا قد موزوں دیکھکر گلگشت گلشن میں — دکھائی دیگیا قمری کو قد سرو چمن بگڑا
اُڑا کر لیگئی خوشبو صبا جو زلف جاناں کی — تو اس [illegible] رنگ بوے عنبر و مشک ختن بگڑا
خدا چاہے تو وہ اچھا بنا دے خلق کے آگے
نظر آتا ہے فضل اپنا بھی کچھ طرز سخن بگڑا

تجکو پکارتا پھرا قاتل کہاں کہاں   یہ ڈھونڈھتا ہوا دل بسمل کہاں کہاں

کیا مطلع ہے! کیا روانی ہے!! کیا صفائی ہے!!! سبحان اللہ

فرقت میں ایک لحظہ نہیں دلکو چین ہے   تبلاؤں کیا کہ پھرتا ہوں بیدل کہاں کہاں
اسے مدعا ہوا تلاش میں اب اُسکی دیکھنا   کرتا ہوا میں جاتا ہوں منزل کہاں کہاں
اُس بیوفا کے عشق میں گھر سے نکال کر   مجھکو پھرائے گا تو اب اے دل کہاں کہاں
دل لے کے تیرا اب وہ نجانے کہاں گیا   پھر ڈھونڈھنے تو جائیگا بیدل کہاں کہاں
صیاد کے خیال سے گلشن کو چھوڑ کر   پھرتے ہیں مارے مارے عنادل کہاں کہاں

اب آستان یار پہ اے فضل جم کے بیٹھ
پھرتا ہے در بدر تو اے غافل کہاں کہاں

ان آنکھوں نے دیکھے جواں کیسے کیسے   ہوے اس جہاں سے رواں کیسے کیسے
رہے ہیں سے ابتک ان آنکھوں کے آگے   ہوے انقلاب جہاں کیسے کیسے
نہیں اُس ستمگر کے مژگان و ابرو   ہیں دشمن مرے بیگماں کیسے کیسے
ہیں عاشق کے لب خشک تر چشم تن زرد   یہ سب عشق کے ہیں نشاں کیسے کیسے
گل و ماہ و آئینہ و شمع و خورشید   ہیں چہرے پہ اُنکے گماں کیسے کیسے
شہیدان شمشیر ناز و ادا کو   ملیں گے ارم میں مکاں کیسے کیسے

ہے افسوس افسوس فضل اس جہاں سے
گئے خاک میں گلرخاں کیسے کیسے

تیرا جبدم خیال آتا ہے   دین و دنیا کا غم بھلاتا ہے
اُسکو کا کہاں ہے محشر کا   سر تسلیم جو جھکاتا ہے

دل تڑپتا ہے جان جاتی ہے جب وہ پہلو سے اُٹھ کے جاتا ہے
چاہتا ہے جسے دکھا کے جھلک اپنا دیوانہ وہ بناتا ہے
وہی پاتا ہے شاہد وحدت اپنی ہستی کو جو مٹاتا ہے
دل کی آنکھوں سے ڈھونڈتا جو ہے وہی اے یار تجھکو پاتا ہے
بھول جاتا ہے فضل وہ سب کو
اُس صنم سے جو دل لگاتا ہے

دیوان کی اکثر غزلیں اسی رنگ کی اور بعض اس سے بہتر ہیں بعض بعض بہت مشکل زمینوں میں ہیں۔ بعض بہت بڑی بڑی ہیں چنانچہ ایک غزل میں ۴۰ شعر ہیں ہم نے طوالت کے خیال سے انکو قلم انداز کرکے صرف چار چھوٹی چھوٹی غزلوں پر اکتفا کی - اور انتخاب ایک شعر کا بھی نہیں کیا - ایک تذکرہ میں عمدہ عمدہ شعروں کا انتخاب ہم اس لیے ناپسند کرتے ہیں کہ اس سے شاعر کی اصلی حالت اور قوت کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ واقعیت سے زیادہ شاندار رخ نظر آنے لگتا ہے - اور یہ بات سوانح نگار کے فرائض سے بعید ہے کہ اصل مرقع کو اپنی رنگ آمیزی سے خوشنما کرکے پیش کرے -

آخر دیوان میں مولوی عبد العلی صاحب آسی مرحوم نے اور مولوی محمد صاحب[1] مدرس عربی مدرسۂ فرقانیہ لکھنؤ نے قطعات تاریخ لکھ کر حضرت فضل کی بہت کچھ تحسین کی اور حوصلہ بڑھایا ہے - لیکن ان حضرات کی تحسین سخن شناسانہ ہے اسمیں ہم بھی اُن کے ہم آہنگ و ہم خیال ہیں -

محبوب علی لکھنوی

[1] مولوی صاحب موصوف عربی علم ادب میں اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتے ہیں - آپ کی عربی نظمیں اور قصائد نہایت فصیح و بلیغ ہوتے ہیں مصر وغیرہ کے ادبی پرچوں میں آپکی نظمیں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں - آپ مولانا عین القضاۃ اجلہ کے تلامذہ میں سے ہیں اور مولوی عبد العلی صاحب آسی مرحوم کو ہر شخص جانتا اور انکی لیاقت و سخن شناسی کو جانتا ہے ۱۲

خیال یار

میں کیونکر عشق کا آزار چھوڑوں — تجھے کس پر دل بیمار چھوڑوں
اُٹھایا ہاتھ جب دونوں جہاں سے — بھلا کیونکر در دلدار چھوڑوں
نہیں قابو میں دل اپنا الٰہی — میں کیونکر گریہ خونبار چھوڑوں
میں چھوڑوں کسطرح فریاد و شیون — میں کیونکر آہ آتشبار چھوڑوں
کوئی آنکھوں میں میری پھر رہا ہے — میں کیونکر حسرت دیدار چھوڑوں
سر شوریدہ ٹکراؤں کہاں پہ — اگر میں یار کی دیوار چھوڑوں
قسم ہے اپنی ہی وحشت کی مجکو — گریباں میں جو کوئی تار چھوڑوں
نہیں ممکن مرے جوش جنوں سے — کہ سیر وادیٔ پرخار چھوڑوں
رہے اُس بت سے لطف ہمکلامی — میں کیونکر لذت گفتار چھوڑوں
ہوی مدت بتوں کو پوجتا ہوں — میں کیونکر رشتۂ زنار چھوڑوں

نہیں ممکن ہے جیتے جی یہ باسط
کہ دامان خیال یار چھوڑوں

باسط بسوانی

ضروری گذارش "تمدّن" بلا طلب جن حضرات کی خدمت میں نمونتاً یا کسی معزز دوست کی تحریک سے پہنچے براہ کرم فوراً اپنے ارادہ خریداری سے مطلع فرمائیں ورنہ خاموشی رضامندی سمجھی جائے گی اور دوسرے ماہ میں اونکا نام درج رجسٹر کر کے تیسرے ماہ کا پرچہ ذریعہ وی پی بھیجا جائیگا جسکا وصول کرنا اُن کا قومی اور اخلاقی فرض ہوگا۔

جو حضرات "تمدّن" کی عمر کے پانچویں سال کے اختتام یعنی ۱۷ اپریل تک "تمدّن" کو چار مستقل خریدار عنایت فرمائینگے اُن کی خدمت میں ایک سال کے لیے "تمدّن" مفت حاضر ہوگا۔ علاوہ صاحب دو مستقل خریدار عنایت فرمائیں گے اُنکے پاس چھ ماہ تک پرچہ مفت حاضر ہوگا۔

ابر مردہ

جسے اسفنج بھی کہتے ہیں۔ اس کی ماہیت کے متعلق اکثر کا خیال ہے کہ یہ سمندر کا جھاگ ہے۔ اسکا رنگ خاکی نما ہوتا ہے دہلی میں ایک سوداگر کی دوکان پر ایک کاغذ کے پاٹن میں قریب ایک درجن کے ٹکے ہوئے تھے۔ دور سے اُن کا رنگ کھینچے جاتا تھا۔ آگے بڑھا اور سوچا کہ ان میں سے ایک ضرور خریدوں گا۔ ابھی دوکاندار سے سلسلۂ کلام شروع بھی نہ کیا تھا کہ لوگ آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک کے سوا سب فروخت ہو گئے۔ میں نے دل میں کہا سچ ہے واقعی دنیا مردہ پسند ہے ایک رہ گیا تھا اسکا سودا میں نے کر لیا اور گھر واپس چلا آیا۔ رات کا وقت تخلیے کا ہوتا ہے ضروری مشاغل سے فرصت مل جاتی ہے۔ پس میں ایک عمل پڑھا کرتا ہوں اور جس چیز سے مجھے کلام کرنا ہوتا ہے اُسے سامنے رکھ لیتا ہوں۔ یہانتک کہ وہ چیز خواہ جاندار ہو یا بیجان نباتات میں سے ہو یا جمادات میں سے میرے سوال کا جواب دینے لگتی ہے آج ایک

ننھی سی لاش

ابر مردہ کی میرے سامنے تھی۔ اسکا جسم کسی ظالم نے چھلنی کر دیا تھا۔ مجھے تفتیش کی ضرورت ہوئی چنانچہ وہ عمل پڑھ کر عالم تخیل میں جا پہنچا۔ اور اس نعش سے مخاطب ہو کر کہا۔ اوجنس خاموش۔ آہ تجھے کس بیدرد نے گھائل کیا ہے؟ ذرا سر اُٹھا کر سچ بتادے تیرے مرنے کے بعد یہ گرم بازاری کیوں تھی۔ یہ سن کر ابر مردہ مسکرایا اور کہا تمھارے دو سوال ہیں ان کا ایک جواب دوں یا دو۔

میں نے کہا نہیں فرداً فرداً جواب دینا ہو گا۔ کہا پہلے سوال کا تو یہ جواب ہے کہ میں کسی

کی تیر نظر کا

زخمی ہوں

اُس ظالم نے مشق ستم کے لیے میرا سینہ ہی منتخب کیا۔ میرے شغف کیفیت یہ ہے کہ زخم تو کھایا گیا لیکن ایک لذت بھی پیدا ہوتی رہی ہر اُس تیر کے ساتھ جو جگر میں پیوست ہو جاتا تھا۔ دہن زخم سے مرحبا کی صدا نکلتی تھی آخر میں نے کہہ بھی دیا

تیر جن کے ترے کیوں نہ جگر میں رکھ لوں
کس مزے سے یہ اُڑاتے ہیں نشانہ دل کا

جب اچھی طرح زخمی ہو گیا تو امانت عشق۔ قطرات محبت کا حامل بن گیا۔ اور تم بھی دیکھیے وہ فطرت نے مجھے تفویض کر دیا ہے۔ پس یہ سینے کی غربالی میرے لیے عید ہے تو یہ ہے آپ افسردہ نہ ہوں۔

رہا دوسرا سوال۔ میری چاہت کیوں ہے اسکا جواب آپ نے خود ہی دیدیا ہے کہ دنیا مردہ پسند ہے مگر میں اسمیں اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ مردہ میں بشرطیکہ کوئی کمال رہ چکا ہو۔ اہل اللہ کے مزارات پر عوام الناس کی حاضریاں زیادہ تر فیض کی خاطر ہوتی ہیں۔ میاں اُس مرنے والے کو یاد کیا جاتا ہے جس کے اوصاف زندگی میں دوسروں کو فائدہ پہنچا چکے ہوں۔ ہاے

چودھویں صدی

کے لوگوں نے ہنر کو عیب سمجھ رکھا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ہم جنکے مقلد ہیں وہ باہنر ہے اور ہمارے بھی وطن سے سکڑوں ہی روپیہ اسی ہنر کی بدولت کھینچ چکا ہے۔ دنیا ہنرمندکی قدرداں ہے زندہ اگر بے ہنر ہے تو اسکی پوچھ نہیں پس بے ہنر مردہ کی کیسے پوچھ ہو سکتی ہے۔ یوں کہو دنیا مردہ پسند نہیں مطلب پرست ہے۔ تم نے یہ نہ دیکھا

کہ میری مانگ ہے میری قدر ہے میں ہاتھوں ہاتھ فروخت بھی ہو گیا لیکن یہ بھی کبھی غور کیا

کہ کیوں؟ نادان دوست۔ مجھ میں ایک قوت ہے اور اسکا نام جذب ہے۔ میری قدر نہیں۔ میرے جذب کی قدر ہے۔ میں آپ کو مشاہدہ کرا سکتا ہوں۔ امتحاناً ایک گلاس پانی کا لایئے اور اسمیں مجھے ڈالدیجیے پھر تماشا دیکھیے کتنا پانی چوس لیتا ہوں دنیا تو اس بات کی قدر کرتی ہے۔ آہ دل پر اک چوٹ لگی۔ ابر کے ٹکڑے نے

تصوف کے مراحل

طے کردیے۔ انسان کامل بیشک وہی ہے جسکا جگر تیر عشق سے چھد چکا ہو۔ ایک بیکلی ہو۔ جو کل نہ آنے دیتی ہو ایک خلش ہو جو بار بار کھٹکتی ہو میرے ہمدم ہو اور میرے سینے کا کھیت ہو۔ لوگ کہیں سرسوں پھولی ہے۔ کیا بسنت کے دن آگئے ہاں وہ بارہ مہینے دیکھیں اور ہیاں بسنتی موسم نظر آئے۔ میرا دل ایک پھول ہے اسے وحدت مکھی کہتے ہیں سورج مکھی کا رخ سورج کی طرف رہتا ہے اور اسکا رخ ہمیشہ میری شہ رگ کی جانب۔ میں یہی دعا مانگتا ہوں کہ کسی کے تیر نظر کا صدقہ مجھ میں جذب پیدا ہوجائے۔ جسکو دیکھوں وہ میرا نہیں تیرا ہوجائے روحانی کشش کی خیر جس کے دم سے اسلام کا بول بالا ہوا۔ آئینہ دل کی بجے جسکی جلا نے عالم انسانیت کو متحیر کردیا۔ چشتی تصوف کے تاجدار حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر لاکھ لاکھ بار رحمت و برکت ہو۔ نقشبندی تصوف کے چمکتے ہوئے گوہر حضرت صدیق اکبرؓ پر انوار الٰہی کا مینھ برسے۔ جنکے سلسلے کی لاکھوں کڑیاں اسلام کے لیے مایۂ ناز ہوئی ہیں۔ اور اس ابر مردہ کی حیات پھر جو میرے لیے سبق آموز ہوا۔

مقرب حسین مقرب دبیر حلقۂ نجات دہلی

حضرت رسا جمال الٰہی گیاوی

اُس شوخ نے کی نہ قدردانی میری ضائع ہوئی ہائے جانفشانی میری
ٹھوکر سے مٹایا نقش تربت میرا وہ بھی نہ رہی جو تھی نشانی میری

پردہ نسواں

رسالۂ تمدن میں پردے اور تعلیم کے متعلق ایک مختصر سا مگر نہایت موزوں مضمون والدہ ممتاز حسین کے قلم کا لکھا ہوا میری نظر سے گذرا۔ میں چاہتی ہوں کہ اسپر کچھ اپنی ناچیز راے کا اظہار کروں۔

جہانتک میرا خیال ہے۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ مشرقی لوگوں میں بہت کم ایسے آدمی نکلیں گے جو اپنے سے مخالف راے رکھنے والے کی بات سُننے کے متحمل ہونگے اور جو دلائے وہ پیش کرے اُس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔ معلوم نہیں کہ انھوں نے مخالفت کیکیوں ایسا ہوا سمجھ رکھا ہے۔ جبکہ سعدی سے زبردست فلاسفر کا قول ہے کہ

گو دشمن شوخ چشم وبیباک تا عیب مرا بمن نماید

درحقیقت مخالفت ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے کسی مسئلہ کا عیب و ثواب عوام پر بخوبی روشن ہو جاتا ہے۔ یہی وہ بھٹی ہے جسمیں پڑکر مسئلہ کا کھرا ہوتا اپنی پوری آب و تاب سے چمک جاتا ہے۔ یہی وہ کسوٹی ہے جسپر کھرا کھوٹا۔ پرکھا جاتا ہے یہی وہ چھلنی ہے جس سے کوڑا کرکٹ گرد و غبار پاک ہو جاتا ہے۔ اس سبب مجھے یقین ہے کہ میری تحریر کو کسی دیگر خیال سے نہ دیکھا جائے گا۔ ہاں جو کچھ میری تحریر کے جواب میں اُس کے خلاف لکھا جائے گا میں نہایت خوشی کے ساتھ دیکھوں گی اور اس کا حتی الامکان موزوں جواب دینے کی کوشش کروں گی۔

پردے کے حامی لوگ پردے کی تائید میں مدت سے بہت کچھ لکھتے آئے ہیں اور پردے کی تائید اور اسکو عمل میں لانے کی نہایت سختی کے ساتھ تاکید کی جاتی ہے لیکن شاید وہ اس سے

ناواقف ہیں کہ عورتوں سے جتنی سختی کے ساتھ پردے کی پابندی کرائی جائے گی اُسی قدر مردوں کے اخلاق کی توہین کھلے الفاظ میں ہوگی اور اس سے زیادہ عورتوں کا اخلاق کمزور ثابت ہوگا چونکہ عرصہ دراز سے مردوں کے ہاتھ میں قلم رہا ہے اس لیے انھوں عورت ذات پر دل کھول کر الزام لگائے ہیں اور پیٹ بھر کر اس کی توہین کی ہے کہیں اس کو ناقص العقل کہا ہے کہیں اسکے اخلاق پر حملے کیے ہیں۔ کہیں اسکو مردوں کی غلام لکھا ہے اور اسی قسم کے عیب ظاہر کیے ہیں۔ عورتیں بیچاری یہ سب باتیں سُنتی ہیں اور خاموش ہیں۔ مردوں کا مقابلہ کون کرے یہ تعلیم یافتہ صاحب علم وفضل۔ ہم جاہل مطلق۔ ناقص العقل تو آپ سے آپ ہیں۔ ہمارے جاہل رکھنے میں بھی مردوں کا ہی ایک ناقابل معافی قصور ہے۔ کیونکہ اگر ہم تعلیم یافتہ ہوں گے تو مردوں سے اپنے واجبی برابر کے حقوق مانگیں گے۔ جنکو وہ دنا کسرشان سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم تو خود مختاری کے ساتھ جو چاہیں کریں۔ مگر عورت ایک کاٹھ کی پتلی کی طرح یا ربڑ کی گڑیا کی مثال۔ روٹی۔ کپڑا بھی ہم سے نہ مانگے تو بہت ہی اچھا ہم دنیا کی تر و تازہ ہوا کھائیں۔ ہر جگہ جائز ناجائز مجمع میں بیٹھکر دل بہلائیں۔ مگر عورت گھر کی چار دیواری میں پردے کے اندر قید رہے نامحرم عورت بھی اندر نہ جا سکے کیا خوب۔ گویا ہم طوطے مینا کی طرح پنجرے میں بند رہ کر انکو میٹھی میٹھی بولیاں سناتے رہیں اور مرد ہم کو ایک خاص وقت پہ خاص قاعدے سے دانا پانی دیں اور اگر ممکن ہو سکے تو اس سے بھی چشم پوشی کر جائیں۔ سبحان اللہ کیا انصاف ہے کیا ایمانداری ہے۔

خالق دنیا نے بیدہ آنکھوں کو اور پاکیزگی دل کو عطا فرمائی ہے۔ اور شرم و حیا کا مسکن نگاہ میں بنا دیا ہے۔ عورت کے پردے کی حد بس یہیں ختم ہو جاتی ہے

اگر دل پاکیزہ نہیں شرم و حیا آنکھوں سے دور ہے تو ہزار پردے اور وہ بھی موٹے موٹے ٹاٹ کے بیفائدہ ہیں۔ کیا ایسے موٹے موٹے پردوں میں سوراخ کرنے والیاں موجود نہیں ہیں۔ اور اگر دل پاک ہے۔ نگاہ میں شرم و حیا ہے تو یہ سارے پردے بیکار ہیں۔ اخلاق عورت کو بیشک پاکدامنی سکھاتا ہے۔ نہ کہ موٹا کپڑا پردے کی جگہ لٹک کر عصمت پائی تباے گا۔ یہ ظاہری پردہ بالکل ناچیز ہے جبکہ باطن درست ہے۔ چونکہ عورتیں بہت دنوں سے پردے کی قید میں رہتی چلی آئی ہیں۔ اسلیے وہ بھی ملک چین کے پچاس سالہ قید کی طرح۔ اس قید کو ہی بہتر سمجھنے لگی ہیں۔ جس نے اُن کے اخلاق پر کمزوری کا الزام لگا یا صحت جسمانی کو اتنا بگاڑ دیا کہ میل بھر تک چل نہیں سکتیں۔ دنیا کی تازہ ہوا۔ سیر و تفریح سے علٰحدہ محروم کر دیا۔ الٰہی خیر۔ پردہ ہوا۔ وبال جان ہو گیا۔ یہ عورتوں کے اخلاق کی زبردست توہین ہے

درحقیقت یہ پردے کا شدید طوفان مردوں کی اخلاقی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ مردوں کو پردے کی حمایت کرتے ہوئے بے انتہا شرم آنی چاہیئے۔ کہ ہم ڈھٹائی سے پردے کی تاکید نہیں کرتے ہیں بلکہ اپنی اخلاقی کمزوری کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ مردونکی طبیعت شکیہ زیادہ واقع ہوئی ہے۔ اور اسیطرح وہ اپنے خیال کے بموجب عورتوں پر بھی قیاس دوڑاتے ہیں۔ یہ مثل مشہور ہے آپ بھلا تو جگ بھلا۔ میرا خیال ہے کہ عورتوں میں فیصدی پچھتر ایسی نکلیں گی جنھوں نے اپنے خاوند کے علاوہ غیر مرد کا خیال۔ خواب میں بھی کبھی نہ کیا ہوگا مگر مرد ذرا اپنے سینہ پر ہاتھ رکھکر ایمان سے کہدیں کہ اُن میں فیصدی کتنے ایسے نکلیں گے جنھوں نے اپنی زوجہ مشفقہ کے علاوہ کسی غیر عورت کو بری نگاہ سے نہ دیکھا ہو۔ پس عورتوں کی پاکیزہ خیالی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا ایسے پاکیزہ دل اور خیال والے لطیف عنصر کو پردے کی قید میں رکھکر اسکی ساری خوبیوں کا ضائع کر دینا۔ مردوں کی ضرورت سے زیادہ عقلمندی کا کھلا ہوا ثبوت ہے

ورنہ عورتیں اصلیت میں پردے سے راضی نہیں۔ یوں منہ دیکھی بات کسی خاص مرد کے دباؤ سے کہدیں تو کہدیں۔ میں نے اکثر موقع پر عورتوں کو بارکش گاڑیوں۔ پالکی گاڑیوں وغیرہ میں شہر سے باہر جاتے ہوئے دیکھا ہے اور آبادی سے دور جاکر گاڑی سے اُتر جاتی ہیں اور پیدل چلتی ہیں۔ جس کی وہ مدت سے مشتاق تھیں۔ لیکن کمزوری کے باعث تھوڑی دور چل کر ہانپ جاتی ہیں۔ گو جی گاڑی میں بیٹھنے اور اس کے پردوں میں قید ہونے کو نہیں چاہتا مگر مجبور بیچاریاں کیا کریں۔

علاوہ مسلمانوں کے ہندوستان سے بڑے ملک میں اور قومیں بھی آباد ہیں لیکن ان کے ہاں پردے کا یہ زور شور نہیں ہے اور خوبصورتی بدصورتی سب قوموں میں پائی جاتی ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اُن کی عورتیں زیور عصمت و عفت سے عاری ہیں۔ علاوہ نیچ قوم کے۔ ہندوؤں۔ پارسیوں میں عموماً پردے کا نام و نشان نہیں۔ لیکن عصمت و عفت میں کہیں فرق نہیں آتا بمقابلہ ان کے ہاں کی عورتیں کچھ عنقا صفت نہیں۔ نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا سے زیادہ خوبصورتی انکے ہی حصے میں آئی ہے۔ پھر خوبصورتی کوئی عیب نہیں۔ اخلاق درست ہونے چاہئیں۔ نگاہ پاک بین ہو۔

مردوں کو لازم ہے کہ پہلے اپنے اخلاق درست کریں یہ اُس سے بہتر ہے کہ عورتوں کو پردے کی تاکید کریں۔

اُم یوسف

ریویو

ایک ناول بنام "دغا" ہمارے پاس ریویو کے لیے آیا ہے جسکو جناب قاضی محمد محمود صاحب وفضلی ڈسٹرکٹ کورٹ بیٹے نے تصنیف کیا ہے۔ ناول کا طرز بیان عام ناولوں سے بہت کچھ جداگانہ اور عجیب ہے۔ اسمیں بازاری عورتوں کی مکاریاں، بعض تقدس نما لوگوں کی ریاکاریوں کا پول فاش پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول نمبر ۱۲۷-۱ امین آباد پارک لکھنؤ کے پتہ پر مصنف سے طلب کیا جاسکتا ہے۔ قیمت ۶ر تقطیع ۱۸-۲۲ صفحہ ۷۵)۔

حُسنِ سعادت

(۱)

جمیلہ نہایت سنجیدہ دور اندیش اور سمجھدار لڑکی تھی صورت شکل کے لحاظ سے خاندان میں امتیازی درجہ حاصل تھا اُس نے انھیں امورِ خانگی کی تربیت پائی تھی جو ضیح و شریف گھرانے کی رسم ہے سینے پرونے کھانے پکانے کے علاوہ انتظام تقریبات میں کامل دخل رکھتی تھی بُردباری اور سنجیدگی کا یہ حال تھا کہ کمسنی ہی سے بڑے سن کی عورتیں اور ہم عمر ہجولیاں پورا پورا ادب کرتی تھیں۔

گو ابھی ایوانِ ہستی کی سولھویں منزل سے شباب کے لہلہاتے ہوئے باغ کی ولولہ انگیز و مسرت بخش ہوا کھا رہی تھی لیکن اُس نے اس موقع پر بھی اپنی متانت کا کافی ثبوت دیدیا تھا اور جس طرح اس سن میں فطرتاً شوخی شرارت پیدا ہوجایا کرتی ہے اُسمیں نام کو نہ تھی والدین نے چھوٹے سے سِن میں اُسکی شادی قرابت داری میں کردی تھی جہاں طفلی کا زمانہ پابندی سے بسر کرنا پڑا۔

جمیلہ دوسری لڑکیوں کی طرح دوڑ دھوپ کے کھیلوں سے الگ رہی اپنی سہیلیوں کو کھیلتے کودتے اور آپسمیں چہلیں کرتے دیکھتی تھی مگر خود شرکت نہ کرسکتی تھی کیونکہ اسکی خوشدامن کا مزاج بہت سخت واقع ہوا تھا۔

اگرچہ جمیلہ کو آئے دن تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنی ساس کی ممنونِ احسان تھی کیونکہ اسکی ناگوار روک ٹوک نے جمیلہ میں صبر و تحمل کا مادہ پیدا کردیا ... سختیوں کو نہایت آسانی اور سکون سے برداشت کرنے کے قابل ہوگئی ... جو بڑھتی تھی اسکی ذات میں خوبیاں جمع ہوتی جاتی تھیں جو اُنکے

پُرکیف و پُر فضا میدان میں قدم رکھکر اس نے تین باتوں کو اپنا فرض منصبی قرار دیا "عبادت خدا" اطاعت شوہر" بزرگوں کی رضاجوئی۔

یہ جوہر ایسے تھے جنھوں نے ہر اپنے پرائے دل میں گھر کر لیا تھا خاندان کی چھوٹی بڑی عورتیں اسکی عزت و حرمت کرتیں اور اسکی خوش۔ اُن کی بدمزاجیوں پر دل ہی دل میں نفرین کرتیں لیکن اس بات نے سب کو استعجاب میں ڈال رکھا تھا کہ باوجود بعض ہمسن لڑکیوں سے بے انتہا خلط ملط کے بھی جمیلہ نے اپنی غصہ ور ساس کی شکایت نہ کی۔

(۲)

قیصر غیور شجاع اور خلیق لڑکا تھا اس نے زمان طفلی اور لڑکوں کے مانند کھیل کود کر بسر نہ کیا تھا بلکہ گرانبہا وقت تحصیل علم اور اچھی باتوں کے سیکھنے میں صرف کیا تھا اسمیں اُن باتوں کی کافی صلاحیت موجود تھی جنکے سیکھنے سے انسان معراج ترقی کے حدود تک پہنچ جاتا ہے یہی وجہ تھی کہ چودہ برس کی عمر میں عربی فارسی سے فارغ التحصیل ہوکر علوم مغربی حاصل کرنے میں مشغول ہوا۔

قیصر کے والدین خدا کی دی ہوی نعمت (قیصر) پر فخر و مباہات کرتے تھے جو درست و بجا تھی انھوں نے اپنے ہونہار صاحبزادہ کا عقد چودہ برس کی عمر میں جمیلہ کے ساتھ کردیا لیکن علوم مغربی کی جانب قیصر کی توجہ دیکھکر ایک اسکول میں نام لکھوادیا جہاں تین چار برس پڑھنے کے بعد اس نے علیگڈھ جانے کا قصد ظاہر کیا۔

قیصر کا قاعدہ تھا جب اسکول سے واپس آتا تو ہاتھ مُنھ دھوکر دو ڈھائی میل پیدل چل کر تفریح کرتا اور چراغ جلے گھر واپس آکر کھانا کھاتا پھر کمرے میں جھکر اپنی نیک نہاد مطیع بیوی سے خوش مزاجی کی گفتگو کرتا ۔ جمیلہ کی بھولی

بھالی باتوں سے دلی مسرت حاصل ہوتی اکثر بارہ بارہ بجے رات تک اُسکی ساتھ اُسکی شیریں باتوں سے دل بہلایا کرتا۔

جمیلہ کی نیک اطواری نے قیصر کے دل پر پورا پورا قبضہ کرلیا تھا جسکی وجہ سے قیصر اسکی خوشی کا جویا رہتا تھا اُس نے اکثر والدہ کو اشاروں کنایوں میں سمجھایا کہ وہ بدمزاجیاں چھوڑدیں لیکن خلقی عادت نہ چھوٹنا تھا نہ چھوٹی اور قیصر تنگ ہوکر خاموش ہوگیا۔

قیصر کی عمر بیس برس کی ہوچکی تھی اسے صرف بی۔اے کا امتحان دینا باقی تھا جسکی ہوس دل کو بیچین رکھتی تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی خواہش تھی کہ علیگڈھ جاکر امتحان دیا جائے اس نے کہہ سنکر منت سماجت سے والدین کی اجازت حاصل کرلی تھی مگر علیگڈھ جانے کی کوئی تاریخ نہ مقرر کی تھی تاہم ہفتہ عشرہ میں ارادۂ سفر تھا۔

تاریخ معین نہونے کا قوی سبب یہ تھا کہ قیصر جمیلہ کو ناخوش کرنا نہ چاہتا تھا اسے جو کام کرنا منظور ہوتا موقع محل دیکھکر جمیلہ سے صلاح ومشورہ کرتا اور بہ لطائف الحیل راضی کرلیتا اس بارۂ خاص میں جمیلہ سے گفتگو کرنے کا موقع نہ پاکر تاریخ روانگی کی نسبت قطعی فیصلہ نہ کیا تھا۔

(۳)

برسات کی سہانی فصل ہے شام کا دلفریب منظر دیکھتا ہوا قیصر گھر آیا حسب معمول جمیلہ کو امور خانہ داری میں مصروف پاکر کمرے میں چلا گیا۔

یہاں کا فرش فروش اور سامان آرایش ایشیائی طرز کا تھا کمرے کی سجاوٹ میں بڑے اہتمام اور تکلف سے کام لیا تھا لیکن سادگی وضعداری کو فراموش نہ کیا تھا تختوں کے چھکے پر تکلف سفید چاندنی اور صدر میں اونی غالیچہ مع گاؤ تکیہ کے موجود تھا

ایک ولایتی بڑا لیمپ مسند کے برابر روشن تھا۔
قیصر نے شیروانی اُتار کر کھونٹی پر ٹانگی اور الماری سے ایک اخلاقی کتاب نکال کر مطالعہ کرنے لگا اُسے ایک وحید روزگار حکیم کا یہ قول نہایت بھلا معلوم ہوا۔ علم و فن اگر فوائد عام کے لیے حاصل کیا جائے تو اصلی مسرتوں کا موجب ہے اُس نے بار بار اس عبارت کو پڑھا اور لوح دل پر کندہ کر لیا اخبارات میں اکثر لمبے چوڑے مفید عام مضامین لکھے دیکھے تھے لیکن تحقیق کرنے سے ثابت ہو گیا کہ اسکے لکھنے والوں میں بہت ایسے بھی ہیں جنکی مثال دو رخی تصویر ہے کہ دوسروں کے واسطے ناصح مشفق ہیں مگر اپنے افعال شنیعہ کی خبر نہیں۔
جمیلہ کاموں سے فراغت پا کر کمرے میں داخل ہوئی اور قیصر سے مخاطب ہو کر بولی
جمیلہ۔ آج خلاف قاعدہ دیر تک کہاں رہے۔
قیصر۔ میں تو ٹھیک وقت پر آ گیا لیکن تمہیں ضرورت سے زیادہ کاموں میں مشغول رہنا پڑا شاید کوئی نیا گل کھلا۔
جمیلہ۔ تم ان باتوں کا خیال نہ کیا کرو امی جان ہماری سرتاج ہیں جو چاہے کہیں اُنکا کچھ فرمانا ہماری عین عزت کا باعث ہے رنج صرف اس بات کا ہوتا ہے کہ غصہ کرنے سے انھیں تکلیف پہنچتی ہے جو ضعیفی میں خطرے سے خالی نہیں۔
قیصر۔ شاباش تمھاری ہمت اور فرمانبرداری پر سچ کہتا ہوں مجھے انکا خواہ مخواہ ناراض ہونا ناگوار گذرتا ہے ہر مرتبہ جواب دینے کا قصد کرتا ہوں لیکن اسکے حقوق زبان بند کر دیتے ہیں۔
جمیلہ۔ دانتوں میں اُنگلی دبا کر افسوس کوئی خورد بزرگوں کی نسبت ایسا ہونا قصد کرتا ہے تمھارے اس خلاف تہذیب خیال نے مجھے نہایت صدمہ پہنچایا آئندہ خیال کرنا

قیصر۔ ندامت سے واقعی میری زبان سے ایسا فقرہ نکل گیا جو نافرمانی کا پہلو لئے لیکن انسان بھول چوک سے خالی نہیں خطائیں ہو جایا کرتی ہیں مگر ارباب اخلاق ازراہ مروت معاف کرتے ہیں۔

جمیلہ قیصر کو شرمندہ دیکھکر خاموش ہو رہی کسی طرح گوارا نہوا کہ قیصر کو بار بار غلطی یاد دلاکر افسردہ کرے اسلیے تھوڑے سکوت کے بعد گفتگو کا رخ بدل کر کہا۔

جمیلہ۔ آج ابھی تک تمھیں بھوک نہیں معلوم ہوی نو بجا چاہتے ہیں پھر سبق کب یاد ہوگا۔

قیصر۔ تمھاری باتوں میں نہ کہہ سکا حالانکہ آج سویرے سے اشتہا تھی۔

جمیلہ نے ماما کو پکار کر کھانا لانے کا حکم دیا تھوڑی دیر بعد دسترخوان چنا گیا دونوں میاں بیوی نے ساتھ نوش جان کیا کھانے سے فراغت کرکے ہاتھ منہ دھوئے پھر دونوں کتابیں لے کر روشنی کے پاس بیٹھے گیارہ بجے رات تک مطالعہ جاری رہا ادھر گھڑی نے گیارہ بجائے اُدھر دونوں اپنے اپنے پلنگ پر دراز ہوئے

حسن اتفاق سے آج دونوں کی آنکھوں سے نیند اُڑ گئی لاکھ لاکھ کوشش کی بن کے لیٹے کروٹیں بدلیں مگر خواب کا کالے کوسوں پتا نہ تھا بارہ بج گئے رات بھیگنے لگی چوکیداروں کی بھیانک صدائیں (جاگتے رہو کھنکھارتے رہو) سکوت کی فضا میں گونجنے لگیں مگر ان دونوں کو نیند نہ آئی قیصر آنکھیں کھولکر آیندہ تحصیل علم کی نسبت غور کرنے لگا اسے یاد آگیا کہ آج بھی جمیلہ سے علیگڑھ جانے کا تذکرہ کرنا بھول گیا اتنے میں جمیلہ نے کروٹ بدلی۔

قیصر۔ آہستہ سے کیا سو رہی ہو۔

جمیلہ۔ آج نیند اُچٹ گئی جب سے پڑی کروٹیں بدل رہی ہوں تم تو سو گئے تھے۔

قیصر۔ عجب اتفاق ہے میرا بھی بالکل یہی حال ہے نیند کے خیال میں آنکھیں

منہ کیے لیٹا رہا مگر غنودگی تک نہ آئی آخر چپ پڑے پڑے دل گھبرانے لگا۔

جمیلہ۔ اکثر رات کو خاموشی میں اُلجھن ہونے لگتی ہے باتیں کرو طبیعت بہل جائیگی

قیصر۔ تم سے ایک بارۂ خاص میں رائے لینا ہے کئی روز سے قصد تھا لیکن کہہ نہ سکا۔

جمیلہ۔ کہو جو میری سمجھ میں آئے گا ظاہر کروں گی۔

قیصر۔ میرا قصد ہے وکالت پڑھوں۔

جمیلہ۔ نہایت پاکیزہ خیال ہے۔

قیصر۔ لیکن پہلے بی۔اے کی ڈگری حاصل کرنا ہوگی۔

جمیلہ۔ پھر مانع کون ہے۔

قیصر۔ تمھاری جُدائی۔

جمیلہ۔ کیا باہر جانا ہوگا۔

قیصر۔ ہاں قصد ہے علیگڈھ جا کر امتحان دوں۔

جمیلہ۔ اگرچہ تمھارے جانے سے بیحد ملال ہوگا طبیعت پریشان رہے گی لیکن میں ان جملہ مشکلوں میں صبر سے کام لوں گی تم شوق سے جاؤ ہاں ہر چوتھے روز اپنی خیریت سے اطلاع دیتے رہنا۔

قیصر۔ مجھے بھی مفارقت شاق ہے مگر دنیا میں رہ کر کچھ بن نہیں پڑتا ابا جان اور اماں جان سے تو پہلے ہی اجازت حاصل کر چکا صرف تم سے دریافت کرنا باقی تھا اب انشاءاللہ اسی ہفتہ میں تیاری کر کے چلا جاؤں گا البتہ وہاں کے قیام میں دھڑکا لگا رہے گا۔ اماں جان یوں ہی تم سے لڑا جھگڑا کرتی ہیں میرے جانے کے بعد تو خدا جانے کیا کچھ نہ کریں

جمیلہ۔ تمھیں ان باتوں سے کیا سروکار جیسا ہوگا سمجھ لوں گی تم سدھارو۔

(باقی آئندہ)

مرزا فدا علی خنجر لکھنوی

اعراب جاہلیت کا سالانہ مشاعرہ

(بسلسلہ اشاعت سابق)

جس طرح امراءالقیس نے سب سے پہلا نمبران مشاعروں میں لیا ہے اور سب سے پہلے کامیابی کا سہرا امراءالقیس کے سر رہا اسی طرح امراءالقیس کے بعد طبقۂ اولے کے مشاہیر شعرا سے عمرو یا ابو عمرو (باختلاف آراے مورخین) ابن عبد ابن سفیان ابن حرملہ الملقب بطرفہ ہے جو امراءالقیس کے بعد جسکی فصاحت و بلاغت کو تمام فصحاے عرب نے تسلیم کیا وہی ہے جو اسی کا کلیجہ تھا ورنہ امراءالقیس کے قصیدہ کے مقابل میں خانۂ کعبہ پر شعراء عرب سے کسی کی مجال نہ تھی جو اپنا قصیدہ لٹکا سکتا۔

عمرو ابن عبد بن سفیان بن حرملہ قبیلۂ بکر بن وائل سے تھا اور جریر بن عبد المسیح الملقب بمتلمس کی بہن کا بیٹا تھا اور بعض مورخین نے اسکی تشریح نسب یوں کی ہے طرفہ بن عبد بن سُفیان بن سعد بن مالک بن ضبّیہ بن قیس بن ثعلبہ بن عکابہ بن صعب بن علی بن بکر بن وائل بن قاسط بن ہنب بن اقصی بن دعمی بن جدیلہ بن اسد بن ربیعہ بن نزار بن معد بن عدنان - مورخ آمدی لکھتا ہے اس نام کے یعنی طرفہ کے چار شخص شعراء عرب سے گذرے ہیں چنانچہ پہلا یہ شخص ہے جسکا ذکر ہم کر رہے ہیں اور دوسرا طرفہ بن الاآة بن نضلہ بن منذر بن سلمی بن جندل بن نہشل بن دارم ہے اور تیسرا طرفۃ الجزمی ہے قبیلہ جذیمہ عبسی سے اور چوتھا طرفۃ اخو قبیلہ بنی عامر بن ربیع سے - میرا خیال ہے کہ اسی نام کے مشارکت کی وجہ سے بعض شارحین دھوکا کھا گئے۔

طرفہ کی عمر بعض مورخین ۲۶ - اور بعض بیس سال کی لکھتے ہیں لیکن

البستانی کے نزدیک صحیح روایت ۲۶ کی ہے یہی مورخ لکھتا ہے کہ اتنی سی عمر میں طرفہ نے کمالات شاعری اسقدر حاصل کیے تھے جسکو لوگ طولانی مدتوں میں عمر کی بھی نہیں حاصل کر سکتے تھے مورخین کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہجو لکھنے میں اپنی قوم اور دوسری قوموں کی بہت جری اور نڈر تھا اور نہایت تعجب میں ڈالنے والی طبیعت رکھتا تھا۔ ۲۰ یا ۲۶ برس کی عمر میں یہ قتل کیا گیا اور اسکا واقعہ قتل یہ ہے جسکو زوزنی نے مفضل بن محمد بن یعلی الضبی سے معلوم کیا ہے وہ کہتا ہے کہ طرفہ بہت بڑے خانوادہ کا شخص تھا اور بہت بزرگ نسب تھا اور اسکی بہن کا عقد عبد عمرو ابن بشر بن عمرو ابن مرثد بن سعد ابن مالک بن ضبیعہ بن قیس سے ہوا تھا یہ شخص سردار اہل زمانہ سے تھا اور علی بن ہند ملک حیرہ اسکی بہت عزت و بزرگی کرتا تھا ایک دن ہمشیرہ طرفہ نے اپنے شوہر کی شکایت طرفہ سے کی طرفہ نے اپنی بہن کی شکایت پر عبد عمرو کی ہجو کہڈالی اتفاق سے یہ ہجو عمرو بن ہند الملک کے پاس بھی پہنچ گئی ایک روز اتفاقیہ عمر بن ہند الملک شکار کے قصد سے نکلا اور اسکے ساتھ عبد عمر تھا ایک بچہ پائے پر عمر بن ہند الملک نے ایک تیر مارا اور وہ گرا ملک نے عبد عمرو سے کہا کہ اپنی سواری سے اترکر اسکو ذبح کر عبد عمرو اترا لیکن ذبح کرنے میں اسکا پیٹ دیکھکر ملک ہنسا اور کہنے لگا کہ کچھ تجھکو خبر بھی ہے گویا تجھکو طرفہ دیکھ دیکھکر تیری ہجو پڑھ رہا ہے جو اس نے تیرے متعلق کہی ہے اسی کے ساتھ ملک نے اسکی ہجو میں وہ شعر بھی ملادیے جو طرفہ نے خود ملک کی ہجو میں کہے تھے جب وہ تمام اشعار پڑھ چکا تو عبد عمرو کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ کچھ سنا تو نے کہ طرفہ تیرے متعلق کیا کہہ رہا ہے یہ سن کے عبد عمرو نے کہا کہ واہ واہ آپ نے اپنی ہجو بھی میری ہجو میں ملادی کیا آپ انکار کرتے ہیں اس ہجو سے جو طرفہ نے آپ کے متعلق لکھی ہے حالانکہ وہ میری

سلہ یہ مولف دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ہے۔

مجھ سے زیادہ سخت ہے کچھ ان باتوں کا خاص اثر ایسا ملک پر پڑا کہ اس نے ایک نامہ گورنر بحرین کے نام لکھا جسکا نام معلے اور قبیلہ بنی قیس سے تھا کہ طرفہ کو قتل کرڈال لیکن ملک کو اہل دربار نے مشورہ دیا کہ ایسا غضب نہ کرنا کہ تنہا طرفہ قتل کرڈالنا ورنہ متلمس اُسکا ماموں ایک تجربہ کار اور مشّاق شاعر ہے غضب ہی کی ہجو لکھے گا اور اسکے علاوہ وہ بڑے قبیلہ کا شخص یعنی قبیلہ بنی ضبیعہ سے ہے یہ مشورہ ملک کے بھی سمجھ میں آگیا اور اُس نے عنوان قتل بدلا ایک شخص کو طرفہ اور متلمس کے لینے کو بھیجا جب یہ دونوں آگئے تو اس نے دو خط گورنر بحرین کے نام لکھکر دیے اور اُسمیں لکھا تھا کہ جیسے دونوں تمھارے پاس آئیں تو انھیں قتل کرنا چاہئے وقت کچھ ہوا یا دیے کہ یہ ہماری طرف سے گورنر بحرین کو دیدینا اور طرفہ اور متلمس کو نہایت اطمینان دلایا کہ جب تم لوگ وہاں جاؤ گے تو وہ تمھارا بہت اعزاز و احترام کرے گا اور باکرام و عطایا پیش آئے گا حسب الحکم یہ لوگ روانہ ہوے اور ارض خیرہ پر پہنچ گئے متلمس نے طرفہ سے کہا کہ ملک نے جو ہم کو تم کو خط دیے ہیں گورنر بحرین کے نام اسکے مضمون سے ہم تم واقف نہیں بھئی میں تو مشکوک ہوں اور بڑی غلطی ہے بغیر دیکھے اور سمجھے ہوے گورنر کے پاس جانا طرفہ چونکہ ناتجربہ کار اور کمسن تھا اس نے اس نے جواب دیا کہ یہ تمھاری بدگمانی ہے جو کچھ ہم سے ملک نے کہا ہے گورنر بحرین وہی ہمارے ساتھ برتاو کرے گا اور اگر اسکے خلاف کریگا تو پلٹ چلیں گے لیکن متلمس کا دل اس بات پر راضی نہیں ہوا اور اس نے اپنے خط کی مُہر توڑ ڈالی تھوڑی دور بڑھکر ایک لڑکا اہل بحرین سے ملا اُس سے متلمس نے پوچھا کہ تم کچھ پڑھنا جانتے ہو اُس نے کہا کہ ہاں متلمس نے کہا کہ اچھا اس خط کو تو پڑھو کہ اسمیں کیا لکھا ہے اس لڑکے نے جسکا نام مجاہ تھا اُس خط کو دیکھکر پوچھا کہ کیا تیرا ہی نام متلمس ہے اس نے جواب دیا کہ ہاں اس لڑکے نے کہا کہ تیرے قتل کا حکم عمرو ابن

ہند الملک کی جانب سے گورنر بحرین کے نام لکھا ہوا ہے یہ سن کے متلمس نے وہ خط لے کے دریا میں پھینکدیا اور ہجو ملک میں شعر پڑھنے لگا اور طرفہ سے کہا کہ قسم خدا کی یہی حکم تیرے خط میں بھی ہے لیکن طرفہ نے کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا یہ حکم صرف تیرے ہی لیے تھا متلمس تو چلا گیا اور طرفہ گورنر بحرین کے پاس پہنچ گیا اور وہ خط گورنر بحرین کو دے ہی دیا گورنر بحرین نے اُس خط کو لے کر طرفہ سے کہا کہ تو ایک بزرگ حسب و خاندان کا شخص ہے اور میرے تیرے درمیان مدتوں سے سلسلہ برادرانہ و قرابت ہے اس خط میں تیرے قتل کا حکم ہے تو چلا جا جلد سے جلد جب تو چلا جائے گا تو میں اس خط کو پڑھوں گا اُسوقت مجھپر تیرے نہ قتل کرنے کا کوئی الزام بھی نہیں عاید ہوگا اور تیری جان بھی بچ جائے گی لیکن جب اسکو پڑھ لوں گا تو مجبور ہوں گا مگر طرفہ نے اسے منظور نہیں کیا یہانتک کہ ایک شخص کے ہاتھوں سے جو بنی قیس سے تھا شراب پلا کر قتل کیا گیا - اور عتبی نے اس کے قتل کی دوسری وجہ لکھی ہے وہ لکھتا ہے ایک دن صحبت شراب گرم تھی عمرو بن ہند الملک کے یہاں اور طرفہ بھی موجود تھا کہ عمرو بن ہند الملک کی بہن اتفاقیہ اسکے پس پشت آگئی اُسکے چہرے کا عکس طرفہ کے جام میں جو پڑا تو طرفہ نے عشق میں ڈوبا ہوا ایک شعر پڑھا جو سوء ادب کا پہلو لیے ہوئے تھا اور اسی سبب سے عمرو بن ہند الملک نے اسکو قتل کرا ڈالا صورتِ قتل میں بھی اختلاف ہے جسکو مورخین لکھتے ہیں چنانچہ ایک روایت یہ ہے کہ گورنر بحرین کو جب اس نے ہند الملک کا نامہ دیا ہے تو اُس نے اُس سے دریافت کیا کہ تو جس صورت کو پسند کرے اُسی طرح تجھے قتل کروں طرفہ نے کہا کہ مجکو شراب پلا دے اور جب مخمور ہو جاؤں تو میری ہفت اندام کی فصد کھلوا دے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور بحرین میں دفن کر دیا گیا۔

اور البستانی صاحب دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) اسکا سبب قتل یوں لکھتے ہیں کہ ایک روز صحبت ملک میں طرفہ شراب پی کر اسکے سامنے سے اکڑتا ہوا چلا ملک چونکہ بالکل ایک خشک آدمی تھا اور بہت ہیبت و جبروت کا شخص تھا نہ کبھی ہنستا تھا اور نہ مسکراتا تھا اس نے یہ حرکت طرفہ کی بہت بُری نظر سے دیکھی اور قریب تھا کہ نکلوادے نکلوایا تو نہیں لیکن اس بدتہذیبی کا اثر ضرور لیا۔ اور بعض نے لکھا ہے کہ نہیں اسوجہ سے اسکو غصہ آگیا کہ ملک کی بہن طرفہ کے پس پشت تھی اُسکو دیکھکر طرفہ نے خلاف شان شعر پڑھا اور یہی موجب قتل ہوا اور البستانی لکھتا ہے کہ ملک نے گورنر بحرین و عمان کو لکھا کہ جسوقت یہ خط تم کو ملے اور یہ لوگ پہنچیں تو ان کے دست و پا قطع کرکے زندہ دفن کردینا تو متلمس تو راستے ہی سے چلا گیا لیکن طرفہ اسی طرح سے قتل کیا گیا کہ دست و پا قطع کرکے زندہ دفن کردیا گیا۔

اور بعضوں نے لکھا ہے کہ گورنر بحرین و عمان اُس زمانے میں ربیعہ ابن الحرث تھا اور چونکہ طرفہ اُسکی بھانجی کا رشتہ میں لڑکا ہوتا تھا اس وجہ سے اُس نے اسکے قتل سے انکار کردیا تو عمرو بن ہند الملک نے ایک شخص کو تغلب سے بھیجا کہ وہ جاکر طرفہ اور گورنر بحرین دونوں کو قتل کرے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

افسوس ہے طرفہ کے قتل ہونے پر اسمیں شک نہیں کہ طرفہ اپنے عہد کے اکمل افراد سے تھا زمانہ ایسے فردوں کو مٹاکے ہر چند کہ اُن کی نظیریں پیدا نہیں کرسکتا لیکن پھر کچھ نہیں محسوس کرتا۔ میرے خیال میں جمال الدین عرفی اور طرفہ یہ دونوں شاعر دنیا میں ایسے گذرے ہیں کہ جن کے اس کمسنی میں کمالات اس پایہ پر پہنچ گئے تھے کہ دنیا اور دنیا والے اُن وصفوں کے حاصل کرنے میں تھک تھک کر رہ گئے انکے کمالات بلکہ خرق عادات شاعری جریدۂ عالم پر ابدالآباد تک زبردست حرفوں سے کندہ رہے گی اور آنے والی دنیا ہمیشہ ایک نیا عبرت کا سبق حاصل کرتی رہے گی عرفی

ستائیس برس کی عمر میں شاہزادہ سلیم کی غلط فہمیوں سے قتل کیا گیا لیکن زندگی میں بھی خدائے سخن تھا اور مرکے بھی خدائے سخن رہا زمین فارس کا کلیجہ ابھی تک عرفی کے غم میں شق ہے اور رہے گا۔ اور طرفہ کو ملک نے چھبیس برس کی عمر میں یا بائیس برس کی عمر میں قتل کرایا لیکن باوجود اس کمسنی کے اسوقت تک اہل لغت اسکے دیوان سے استشہاد وسندیں پیش کرتے ہیں۔ چونکہ مضمون طولانی ہو گیا ہے اسوجہ سے میں اسکے قصیدے کی تنقید کو افسوس کے ساتھ ترک کرتا ہوں صرف اسکے قصیدے کا ایک مطلع ناظرین "تمدن" کی دلچسپی کے لیے پیش کرتا ہوں یہ قصیدہ بحر طویل میں ہے قافیہ متدارک ہے ایکسوچھ یا ایکسوسات شعر کا قصیدہ ہے اور اسکی تشبیب عشق ہرہ اور خولہ اور ہند اور سلمیٰ میں ہے اور کبھی خولہ کو حنظلہ سے بھی خطاب کیا ہے قبیلہ کی طرف منسوب کرکے۔ اس قصیدے میں طرفہ نے اپنے گذرے ہوئے افسانوں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور شرابخواری اور حسن پرستی اور مغنیہ عورتوں کے ساتھ عشق ومحبت پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

لخولة اطلال ببرقة ثهمد　　　تلوح كباقي الوشم في ظاهر اليد

یعنی خولہ کے نشان مکان اُس زمین پر ہیں جہاں کی خاک سنگریزوں اور پتھر سے مخلوط ہے اور وہ جگہ موضع ثہمد میں واقع ہے اور وہ نشان مثل اُس باقی ماندہ گُدنے کے ہیں جو پشت دست پر محبوبوں کے چمکتا ہے اس ایک تشبیہ کی نزاکت پر پتہ دیگی سخن سنج ارباب نظر کو کہ ہم کس بچپن دل ودماغ کی ندرت تخیل کا ثمرہیں طرفہ کی اس تخیل سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گُدنا گُدوانا عرب کی عورتوں کا پرانا وصف اور قدیم رواج ہے لیکن ہمارے ہندوستان میں یہ رسم طبقہ اہل ہنود سے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔　　(باقی آئندہ)

آشفتہ لکھنوی

مسلمانوں کے پہلی صدی کے طبی کارنامے

(بسلسلۂ اشاعت سابق)

خالد کے مسند نشین نہونے کے متعلق مشہور ہے اور قرین قیاس بھی ہے کہ اسی علمی انہماک کی وجہ سے معاویہ بن یزید خلیفہ قرار پایا اور خالد بن یزید مسند خلافت سے محروم[1] رہا۔

خالد کے لیے یزید ہی کے عہد حکومت میں دوسری اقوام کے علوم عربی میں نقل ہونے شروع ہو گئے چنانچہ رومی زبان سے طبی اور کیمیاوی کتابیں عربی میں نقل کرنے کے لیے حکیم اسیفانوس کو ملازم رکھا گیا مگر افسوس اسکی ترجمہ کتابیں آج پردۂ عالم میں ہیں ع دیدی کہ چہ کردست بما چرخ جفا جو

مروان بھی علم دوستی کا دامن اپنے ہاتھ سے نچھوڑ سکا، اگرچہ اسکے عہد میں ایک طرف خون کا دریا بہتا تھا تو دوسری طرف علم کا بھی اسکے پائے تخت سے نکل کر دنیا میں بہا۔ تیاذوق مروان ہی کے زمانے کا طبیب ہے، جسکے بہت سے شاگرد بنی عباس کے وقت میں آسمان طب کے چاند اور سورج بن کر چمکے۔ فرات بن سخیا نا طبیب عیسے بن موسیٰ اسی کے شاگرد تھے۔ تیاذوق حجاج بن یوسف ثقفی کے خاص اطبا میں سے تھا حکیم ماسرجیس (یا ماسرجویہ) اسرائیلی بھی مروانی اطبا میں سے تھا حکیم ماسرجویہ محض ایک طبیب یا حکیم نہ تھا بلکہ ایک کامل ادیب اور اچھا مؤرخ بھی تھا۔ یہ حکیم اسلامی اطبا سے پہلا طبیب ہے جس نے فن طب میں چند کتابیں بھی تالیف کیں اسکی ایک کتاب قوی الاطعمہ ومنافعہا ومضارہا ہے اس کتاب میں انسان کی روزانہ خوراک اور اسکے تاثیرات سے بحث کی ہے دوسری کتاب قوی العقاقیر ومنافعہا ومضارہا ہے۔ مگر افسوس کہ یہ دونوں کتابیں معدوم

[1] جرجی زیدان اڈیٹر الہلال مصر نے اپنی کتاب آداب اللغۃ العربیہ میں یہاں ایک عجیب غلط بیانی سے کام لیا ہے لکھتا ہے کہ جب خالد نے تمام کوششوں کے بعد یہ دیکھا کہ اب میں کسی مسند خلافت نہیں پاسکتا تو علوم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ ہیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

ہو چکی ہیں، تیسری کتاب کا نام کناش (مخزن الادویہ) ہے سنہ ۹۹ھ میں یہ کتاب کسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو ملی، چالیس روز تک اپنے مصلے کے تلے رہنے دیا، جب ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ کتاب حقیقۃً مفید ہے تو منظر عام پر لاکر اسے شائع کر دیا۔ بعض مورخین کو دھوکا ہوا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ حکیم خود خلیفہ خامس یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے وقت کا تھا۔[۱]

فرات بن سخیا ثا یہودی بھی مروانی طبیب تھا، حجاج بن یوسف ثقفی کے خاص اطبا سے تھا آخری عمر میں طبیب عیسٰے بن موسیٰ کی ملازمت کرلی جو بنی عباس کا ایک مشہور طبیب تھا اور اُسکا اُستاد بھائی۔

جب عبدالملک بن مروان کا زمانہ آتا ہے تو ایک طرف مروانی اطباء کی صورت نظر آتی ہے اور دوسری طرف ہم دو اور طبیبوں کو عزت و احترام کی مسند پر ان کے دوش بدوش بیٹھا پاتے ہیں تو ذوکس اور ثونوں عبدالملک ابن مروان کے خاص اطبا تھے۔

اگرچہ ولید بن عبدالملک کے دربار میں کسی مشہور طبیب کا داخلہ نہوا مگر پھر بھی ہم اسے طب کی خدمت سے کنارہ کش نہیں پاتے۔ ولید مسلمانوں کا پہلا بادشاہ ہے جس نے ایک عظیم الشان شفاخانہ بنوایا جس میں مریضوں کے ہر قسم کے آرام کا خیال رکھا گیا تھا۔

پہلی صدی کے آخری بادشاہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے باوجودیکہ آپ سنے

---

[۱] عمر بن عبدالعزیز نے چالیس روز تک اپنے مصلے کے تلے رکھا تاکہ دیکھ بھال لیں کہ کہیں کسی اناڑی کی تالیف تو نہیں ہے اسکو جرجی زیدان یوں بیان کرتا ہے کہ بہتوں نے اس کتاب کے شائع ہونے پر زور دیا مگر پھر بھی وہ چالیس روز تک استخارہ دیکھتے رہے آخرکار (مجبوراً) شائع کرنا پڑی۔ تعجب ہے کہ معزز مؤرخ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کہ مدت استخارہ صرف تین دن ہے۔

صرف دو برس پانچ مہینہ خلافت کی اور تمام عمر علوم دینیہ کی تحصیل اور مدون کرانے میں گذری مگر پھر بھی خدمت طب سے دست کش نہو سکے کناش تیاذوق کے آپ نے کئی نسخے نقل کرائے اور مسلمانوں میں تقسیم کرا دیے۔ اس طرح سے وہ کتاب مدت تک محفوظ رہی اب لاپتہ ہے۔

اگرچہ آپ کے دربار میں کسی طبیب کا داخلہ تھا اگر خلافت سے پہلے آپ ایک بہترین کام انجام دیچکے تھے یعنی جس زمانے میں آپ اپنے والد کے ساتھ اسکندریہ میں تھے آپ نے حکیم عبدالملک بن ابجر کنانی کو جو دارالعلوم اسکندریہ میں علوم عقلیہ کا پروفیسر تھا مسلمان کر کے حکماے اسلام کے رشتہ میں منسلک کر دیا۔

حکیم یحییٰ نحوی۔ حکیم اولیطراوس۔ حکیم اربیاسوس وغیرہ اسی پہلی صدی کے جواہر ہیں مگر ہم نے انکا ذکر اس لیے چھوڑ دیا کہ ان میں کوئی نہ مسلمان تھا نہ سلطنت اسلامیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ حضرت عمرو بن عاص فاتح مصر یحییٰ نحوی سے غالباً اسی لیے بہت ملتے جلتے تھے کہ وہ ایک فن کا استاد تھا۔

یہ دیکھنے کے بعد کہ حضرت رسول صلعم کے بعد سے سنہ لغایت پہلی صدی کے آخری بادشاہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے عہد تک کوئی زمانہ ایسا نہ گذرا جسمیں مسلمانوں نے علم کی خدمت انجام نہ دی ہو اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کا دامن علوم و فنون کے جواہرات سے ہمیشہ بھرا ہوا رہا۔ مگر رونا اب ہے کہ ہم نے غیر اقوام کے علوم سے فائدہ اٹھانا شرک عظیم سمجھ لیا ہے ؎

ہماری خانہ بربادی کا باعث ایک یہ بھی ہے
کہ ہم نے پھول کے پتے ہوا میں سب اڑا ڈالے

جلال ندوی

ابوالفیض فیضی

(بسلسلۂ اشاعت سابق)

فیضی جب اکبر کے دربار میں باریاب ہوا۔ تو اُسوقت ایک قصیدہ پڑھا جس سے اسکے فضل وکمال اور اسکے شاعرانہ تفوق کا پورا پتہ چلتا ہے۔ کمال شاعری کے ساتھ اپنے فلسفہ وحکمت کی نشانیاں بھی موجود ہیں۔ تقریباً دوسو شعر کا قصیدہ ہے۔ شاہی دربار میں جاتے ہوئے رستے ہی میں کہتا گیا تھا۔ پے بہ پے آنے والے مصائب کے اثر سے وہ بھرا تھا۔ اسلیے اسمیں اپنی تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کا اظہار بھی کیا ہے۔ بادشاہی سواروں کے آنے پر گھر میں جو پریشانی اور گھبراہٹ پیدا ہوئی، اور خود اسکی طبیعت کو جو اضطراب ہوا تھا قصیدہ میں یہ تمام باتیں نہایت لطف بیان اور حسن ادا سے بیان کی ہیں۔

الفاظ کی پاکیزگی، بندش کی چستی، خیالات کی بلند پروازی، طرز ادا کی جدت، زبان کی سلاست یہی چیزیں ایوان قصیدہ کے نقش و نگار ہیں۔ ارباب ذوق خود اسکا فیصلہ کرسکتے ہیں کہ فیضی ان باتوں میں کہانتک کامیاب ہوا ہے، اتنے بڑے قصیدے میں ترکیب اور محاورات اہل زبان کے تتبع سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹا۔ میں یہانپر اس قصیدے کے جستہ جستہ مقامات سے اشعار نقل کردیتا ہوں۔

مطلع

سحر نوید رسان قاصد سلیمانی — رسید ہمچو سعادت کشادہ پیشانی
مبشران سعادت نداکناں کہ بخواں — نجات نامۂ خود اے حزین زندانی
مرا نظارۂ اش از دور بیقراری داد — چہ بے قراری باصد قرار ارزانی
شدم سوار سبک گام تو سنے چالاک — کہ گردے از سر دانش سپہر جولانی

خبر بہ بارگہ شہریار شد کا ینک | رسید بر در فردوس مرغ بستانی
فروغ بخش شبستان ہند اکبر شاہ | چراغ بارگہ دولت تمر خانی
خطاب شد کہ تلطف کناں رسانندش | بہ آسمان سعادت زتیہ ظلمانی
نخست بوسہ زدم خاک آستان سے | بہ چشمہ سار رساندم شفاہ عطشانی

ایک جگہ پر اپنی پریشانی اور مصیبت کا اظہار کرتا ہے، موقع موقع سے اپنے دشمنوں اور حاسدوں کے خرمن رشک وحسد میں آگ بھی لگاتا جاتا ہے۔

ازاں زماں چہ نویسم کہ بود بے آرام | سفینہ کو لم از موج خیز طوفانی
گہے چو وہم سراسیمہ کز کدام دلیل | برم ظنون وشکوک از علوم ایقانی
چرا بود متخالف رسوم اسلامی | چرا بود متشابہ حروف فرقانی
زباں کشیدہ بدار القضائے عجب وریا | شہود کذب زدعوئے گران ایمانی
اگر حقیقتِ اسلام در جہاں اینست | ہزار خندہ کفر ست بر مسلمانی

تھوڑے ہی دنوں میں فیضی نے اپنی ظرافت طبع، شگفتہ مزاجی اور خوش بیانی کے باعث اکبر کے دل میں گھر کر لیا۔ یہاں تک کہ سفر اور حضر کسی حال میں بھی اکبر کو اسکی علحدگی گوارا نہ تھی۔ کچھ دن گذرے کہ شیخ ابو الفضل بھی دربار میں بلائے گئے ان دونوں بھائیوں نے اپنا رسوخ اتنا بڑھا لیا کہ امور سلطنت میں سے کوئی کام انکے مشورے بغیر انجام نہ پاتا تھا رفتہ رفتہ ابو الفضل کو جو رتبہ دربار اکبری میں ملا وہ سب کو معلوم ہے۔ فیضی نے کوئی ملکی ومالی خدمت اگرچہ اپنے ذمہ نہ لی۔ کشور معانی کی تاجداری کو ان ظاہری جاہ ومناصب پر ترجیح دی۔ مگر پھر بھی یہ حالت تھی کہ مہمات سلطنت کے جزوی جزوی مسئلے اسکی رائے پر موقوف رہا کرتے تھے

(باقی آیندہ)

تیمورخان
لب
ابو الحسنات ندوی اشرفپوری

غزلیات

حضرت محشر لکھنوی

سکوں ہوتا تھا فرقت میں جو تیرا نام آتا تھا
نہ ہنسنا کام آتا تھا نہ رونا کام آتا تھا

ہمیں اس چھیڑ نے چارہ گرو نکی اور بھی مارا
کہ تشخیص مرض کے وقت تیرا نام آتا تھا

ٹپاٹپ اشک یوں گرتے تھے تار سبحہ ٹوٹے ہیں
کسی بیمار غم کو جب خیال شام آتا تھا

شب فرقت کی باتیں ملیں کہنا ہی مناسب ہے
نہ پوچھو کون سے پہلو ہمیں آرام آتا تھا

دل عشاق کی قدر ان کو کیا جو دل نہ رکھتے ہوں
وہ ناکارہ سہی پھر بھی ہمارے کام آتا تھا

کسی ہمدرد سے رمز وفا کہیے تو کیا کہیے
زباں پر بیشتر سب کے تمہارا نام آتا تھا

جفائے دوست کی ایذا پہ خاموشی ہی بہتر تھی
مری فریاد سے میرے ہی سر الزام آتا تھا

نثار اس شوق کے چھا جائے جس سے مردنی منہ پر
لہو جب سوکھ لیتا تھا تو مجھ تک جام آتا تھا

در و دیوار پر تاثیر سے بن جاتی تھیں شکلیں
فغاں کرتا جدھر سے آپ کا بدنام آتا تھا

کھڑے ہیں دم بخود یہ پوچھنے کو حشر میں محشر
وہ گھڑیاں کتنی تھیں جب عشق میں آرام آتا تھا

حضرت صفی لکھنوی

ستم کش آپ کے اس ڈر سے زہر کھا نہ سکے
یہی کہے گا زمانہ کہ ناز اٹھا نہ سکے

کھلے حسام کے جوہر نہ جاں نثاروں کے
وہ تیغ فرط نزاکت سے آزما نہ سکے

خموش بیٹھ جہاں بیٹھ مثل نقش قدم
کہ تجھکو تیری جگہ سے کوئی اٹھا نہ سکے

فرو ہوئی نہ حرارت جگر کی رونے سے
لگی ہے آگ کچھ ایسی کہ ہم بجھا نہ سکے

نکل ہی جائے گا خاطر سے رفتہ رفتہ ملال
ترا خیال نہیں ہے جو دل سے جا نہ سکے

گناہگار جلیں آتشِ جہنم میں — اگرچہ دامنِ رحمت پر آنچ آ نہ سکے
یہ خفتگانِ لحد کس بلا کی نیندیں ہیں — تمھیں پکار کے ہم تھک گئے جگا نہ سکے
یقین ہے ترے کشتوں کی بیقراری سے — زمین بھی تہِ دامن انھیں چھپا نہ سکے
ہنسی میں بات اُڑا دینگے سب یہ سچ کہ ہم — فسانۂ گل و بلبل اُنھیں سُنا نہ سکے
ستم کشانِ حوادث کا دل دُکھائیے کیوں — ستائیں آپ اگر آسماں ستا نہ سکے
اگرچہ میرا مٹانا ہی تم کو ہے منظور — تو یوں مٹاؤ کہ پھر آسماں مٹا نہ سکے
اُبل پڑے مری آنکھوں سے نکلے گرم آنسو — وہ آبلے جو دلِ تنگ میں سما نہ سکے

صفی وہ اب تو خوشامد سے بھی بگڑتے ہیں
غرض یہ ہے کہ جو روٹھیں کوئی منا نہ سکے

حضرت مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی

دل کو تاکیدِ تمنا ہے کہ فنا ہو جانا — درد کو حکمِ قضا ہے کہ دوا ہو جانا
تہنیت موت کو دیتا ہے مرے دل کا مرض — عید ہے ماتمِ حسرت کا بپا ہو جانا
جب نہ خاک بھی ڈھونڈھے نہ ملی میں تو کہا — مرنے والے اسے کہتے ہیں فنا ہو جانا
عادتِ شانہ کشی زلف گرہ گیر میں ہے — فرض ہے روز اسیروں پہ جفا ہو جانا
طشت از بام ہوا رازِ وفا غم یہ ہے — ورنہ کچھ شاق نہ تھا سر کا جدا ہو جانا
حیلۂ صبر ہے آسان جو تمھیں یاد رہے — ہم کو دم توڑتے دیکھو تو خفا ہو جانا
شمع ساں منتظرِ صبح نہ رہنا اے دل — شبِ فرقت کو دعا دے کے فنا ہو جانا
کیا قفس میں کوئی در ہے یہ بتا اے صیاد — کس سے پوچھوں کسے کہتے ہیں رہا ہو جانا
پھول کو توڑ کے دیکھو اثرِ وصل و فراق — موت ہے چاہنے والوں سے جدا ہو جانا
خاک بھی اس دلِ سوزاں کی ملیگی نہ کہیں — مجھے معلوم ہے شعلے کا ہوا ہو جانا
آؤ نظارۂ عبرت کو یہاں کچھ نہ سہی — کیا بُرا ہوگا مزاروں کا بھلا ہو جانا

کس دوراہے میں کھڑا ہوں متحیر کی طرح کہ بقا ہے مجھے ممکن نہ فنا ہو جانا
آئے ہو گور غریباں یہ تو باتیں نہ کرو ذرّے کچھ کہتے ہیں خاموش ذرا ہو جانا
کچھ نہ کچھ ہو ہی گیا عشق میں اے سوت مگر میں نے چاہا تھا کچھ اس سے بھی سوا ہو جانا
جیتے جی آئے قیامت تو مزا ہے ثاقب
دیکھ لیں وعدۂ فردا کا وفا ہو جانا

جناب چندی پرشاد صاحب شیدا دہلوی

دکھائے انداز گر ذرا لے کرشمہ اس چشم سرگیں کا بنائے خورشید روز محشر فلک یہ نافہ غزال چیں کا
نشان سجدہ ہے نقش ہستی ورق بنا جزو ہفتمیں کا بلندیوں پر ہے خاکساری بنا فلک ہے مری زمیں کا
دکھا وہ اعجاز تیغ قاتل شفق میں ہو جا نہ جزو دامن کا گرے ہمارے لہو کی چادر بنے دوپٹہ کسی حسیں کا
جنوں نے بے عیب کر دیا ہے چھٹے ہیں قید لباس سے ہم نہ کچھ گریباں کا ہے ٹھکانہ پتہ نہ کوسوں ہے آستیں کا
عتاب کی دلربا ادائیں لباس سے جلوہ گر ہوئی ہیں جبیں سے مانگے کی چین لیکر دماغ بہکا ہے آستیں کا
مجھے یہ ڈر ہے کہ ہو نہ ظاہر یہ خون ناحق بروز محشر اڑا لیا ہے شفق نے کچھ رنگ آج قاتل کی آستیں کا
اشارہ ترچھی نظر کا پا کر کھنچے ہیں خنجر چڑھے ہیں تیور مزاج بگڑا ہے کچھ جبیں کا دماغ بہکا ہے آستیں کا
کہیں ہے فانوس شمع روشن نیام تیغ قضا کہیں ہے کھلے گا محشر کے دن یہ عجیب ہے راز آستیں کا
بنی ہے دشمن یہ خاکساری کہ ہو رہے ہیں رقیب پیدا بنا رہا ہے کسی کے در کو نشان سجدہ مری جبیں کا
یہ رنگ لائی ہے خاکساری فلک بنی ہے جبیں ہماری جھکی ہے تسلیم کو جو گردن بلند رتبہ ہوا جبیں کا
ہوئے ہیں اب چاند عید قرباں چلے گی گردن پہ تیغ ابرو لگے ہیں دو دو ہلال حسیں عجیب فلک ہے تری جبیں کا
ہزار کو ایک کر دکھانا یہی ہے کثرت سے عین وحدت کہ رشتۂ حق ہے گردنوں میں بنا ہے زنار الف جبیں کا
نگاہ صیاد کے ہیں عاشق خبر وطن کی نہ ہوش اپنا بنا لیا آشیاں ہے ہم نے شجر کہیں کا چمن کہیں کا
خیال جانان جو دل میں آیا گماں کا شاہیں فلک پہ پہنچا وہ بار الفت گراں بہا ہے جھکا ہے پلہ مرے یقیں کا
یہ کسکے عارض ہیں نور افشاں بنے ہوئے ہیں جو کو ازل کا چمک رہا ہے وہ داغ ہجراں کہ ماند ہے چاند چودھویں کا
بنے صفا حور و غلماں ہر اک جگہ خوشبوؤں کا ساماں بنا دیا جسکو باغ رضواں ہے ایک ٹکڑا حسیں زمیں کا
مزا دکھاتی ہے ہر طرح کا صفائے نظم شیدا
کہیں کہیں ہے شراب رنگیں کہیں کہیں جام انگبیں کا

حضرت باسط بسوانی

کچھ غرض کعبہ سے ہمکو ہے نہ بتخانے سے کام
وہ کہیں مل جائے ہم کو اپنے مل جانے سے کام

خوبرویوں کو ہے مطلب شمع بزم افروز سے
دل جلوں کو رات بھر رہتا ہے پروانے سے کام

اے جنوں تیری بدولت خوب ہوتی ہے بسر
دل کو ویرانے کی خواہش مجھکو ویرانے سے کام

جاکے کہدے کوئی صیاد اجل سے اتنی بات
منتظر وہ ہیں ترے جنکو ہے مرجانے سے کام

سنکے ناصح کی نصیحت میں نے یوں ہنسکر کہا
تمکو سودائی سے مطلب تمکو دیوانے سے کام

مجھکو انکے جھوٹے وعدے مان لینے سے غرض
پھر وہ آئیں یا نہ آئیں دل کے بہلانے سے کام

چشم میگوں دیکھکر ساقی کی باسط نے کہا
اب غرض ساغر سے باقی ہے نہ پیمانے سے کام

کچھ اپنے متعلق

بعض صاحبان "تمدن" کو ہرماہ کی ابتدائی تاریخوں میں دیکھنے کے شائق تھے چنانچہ ہم نے اسے "تمدن" کو بجائے ۱۷ تاریخ کو شائع کرنے کے ہرماہ کی یکم کو شائع کرنے کا انتظام کرلیا ہے چنانچہ مارچ کا پرچہ یکم مارچ کو شائع ہو رہا ہے ہم نے ناظرین "تمدن" کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ گذشتہ چھ ماہ کی سخت کوشش کے بعد ہم یہ کہنے کے قابل ہوگئے ہیں کہ اب "تمدن" نے ملک کے دو تین گنے چنے بہترین پرچوں کی فہرست میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرلی ہے۔ "تمدن" کے ناظرین کی تمام خواہشات میں سے غالباً صرف ایک باقی رہ گئی ہے (یعنی تصویر کے شائع کرنے کی خواہش) جسکو ہم اسوقت تک پورا نہیں کرسکتے جبتک ناظرین "تمدن" "تمدن" کی توسیع اشاعت میں کوشش نہ فرمائیں اور "تمدن" کا ہر ناظر کم از کم ایک خریدار نہ ہم نہ پہنچائے۔

بعض حضرات دو دو تین تین ماہ بعد پرچہ نہ پہنچنے کی شکایت کرتے ہیں۔ یہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اسمیں ہمارا ذاتی قصور کسقدر ہے۔ بہرحال اگر ڈاکخانہ کے قصور کی سزا ہمیں کو ملنی چاہیے تو ہم اسکی تلافی صرف اس صورت میں کرسکتے ہیں کہ پرچہ شائع ہونے کے دس یوم بعد تک یعنی ہرماہ کی دس تاریخ تک ہم کو پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع مل جائے ورنہ ہم دوبارہ پرچہ روانہ کرنے سے معذور ہیں۔

(۳۱) نوٹ:- ڈاکٹر ایس کے برمن کی کافوری جنتری ۱۹ ء کی خوبصورت تیار ہوئی ہے۔ دس شریف پڑھے لکھے اشخاص کے نام اور پورا پتہ لکھنے پر جنتری ہذا بلا قیمت و محصول بھیجی جاتی ہے۔

دمہ کی دوا

یہ سخت سردی کے موسم میں تندرست انسان کا جان بلب ہو رہا ہے سردی ہٹانے کے لیے کیسے بندوبست کیے جاتے ہیں لیکن افسوس بدقسمتی سے دمہ کے مریض خاص کر ناقابل برداشت تکلیف دمہ سے بہت ہی پریشان ہوتے ہیں اور رات دن سانس پھولنے کی وجہ سے دم نکلے جاتے ہیں اور نیند تک حرام ہو جاتی ہے دیکھیے! آج انکو کسقدر تکلیف ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس لاعلاج مرض کی بازاری دوا زیادہ تر نشیلی اشیاء اور دھتورہ بھنگ بلاڈونا پوٹاس ای اوڈائڈ وغیرہ بنتی ہے اسلیے فائدہ ہونا تو درکنار مریض بے موت مارا جاتا ہے۔ ڈاکٹر برمن کی کیمیائی اصول سے بنی ہوئی دمہ کی دوا۔ ایک انمول جوہر ہے یہ صرف ہماری ہی بات نہیں ہے بلکہ ہزار مریض اس مرض سے شفا پا کر مداح ہیں۔ آپ نے بہت خرچ کیا ہوگا لیکن ایکمرتبہ اسے بھی آزمالیں۔ اسمیں نقصان نہیں قیمت عہ فی شیشی محصول ڈاک ۵ ر اس دوا کے دو خاص فوائد ہیں۔

(۱) ایک خوراک میں دمہ دبتا ہے۔ (۲) اور کچھ روز کے استعمال سے جڑ سے جاتا ہے اور جبتک استعمال میں ہے دورہ نہیں ہوتا ہے

پلیگ کی دوا

سوائے اور سب بیماریوں کے اس سے ڈرنے کا سبب یہ ہے کہ آج تک لاکھوں انسان اس موذی عارضہ کے پنجۂ ظلم سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ گاؤں کے گاؤں اُجاڑ ہوگئے شہر کے شہر تباہ ہوگئے اسوجہ سے اسکے نام ہی سے دہشت ہوتی ہے پلیگ میں مبتلا ہونے کے بعد پھر کوئی علاج نہیں ہے۔ لیکن بغرض حفظ ماتقدم ڈاکٹر ایس کے برمن کی پلیگ روکنے والی گولیاں منگوا کر ضرور رکھیں۔ ان گولیوں کے استعمال سے جسم کے خون میں کچھ ایسا اثر ہوتا ہے جس سے پلیگ کے کیڑے نہ ٹھہر سکتے اور نہ انکا زہر کر سکتا۔ حقیقت یہ ان گولیوں کے استعمال سے ہزاروں انسان پلیگ سے محفوظ رہتے ہیں۔ آپ بھی غافل نہیں رہیں۔ ایک گولی روزانہ ٹھنڈے پانی کے ساتھ نگل جانا چاہیے بچوں کو نصف یا چوتھائی۔ قیمت ۳۶ گولیوں کی ڈبیہ ۸ ر ۶ گولیوں کی ڈبیہ ۲ ار محصول ڈاک ایک سے چھ ڈبیا تک۔ پانچ آنہ ۵ ر

روگ کا گھر کھانسی

جناب مہاراجہ صاحب والیے ریاست۔ بولانگر ضلع سمبل پور سے تحریر فرماتے ہیں۔

آپ کی روانہ کردہ کھانسی کی دوا کے لیے میں نہایت مشکور ہوں اس دوا سے میری کھانسی بالکل دفع ہوگئی۔ مجھے سات خوراک سے زائد پینے کی نوبت ہی نہیں آئی کھانسی مجھے بہت دنوں سے تکلیف دے رہی تھی اسوجہ سے دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں بلغم کے دفع کرنے اور کھانسی کے دور کرنے کے لیے یہ ایک ہی دوا ثابت ہوئی۔ قیمت شیشی کلاں عہ شیشی خورد ۸ر محصول ڈاک شیشی کلاں ۶ ر شیشی خورد ۵ ر ادویات ہر ایک جگہ دوکانداروں سے اور ہمارے تجارتی ایجنٹوں سے ملے گی ورنہ کارخانہ سے طلب فرمائیے۔

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ